رَبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا

علمی خطبات

حصہ دوم

خطابات

حضرت اقدس مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری مدظلہ

شیخ الحدیث وصدر المدرسین دار العلوم دیوبند

مرتب

محمد سعید پالن پوری

استاذ جامعۃ الانور دیوبند

ناشر

مکتبہ حجاز دیوبند

نام کتاب : علمی خطبات حصہ دوم

خطابات : حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری
شیخ الحدیث وصدر المدرسین دارالعلوم دیوبند

مرتب : محمد سعید پالن پوری استاذ جامعۃ الانور دیوبند

طباعت : جمادی الاولیٰ ۱۴۳۲ھ مطابق مئی ۲۰۱۱ء

کمپیوٹر کتابت : روشن کمپیوٹرز، محلہ اندرون کوٹلہ دیوبند

کاتب : عبداللہ سعید پالن پوری
M.09997246979

مطبوعہ : ایچ۔ایس۔آفسیٹ پرنٹرس، دریا گنج نئی دہلی 110002

ناشر

مکتبہ حجاز دیوبند

اردو بازار نزد جامع مسجد دیوبند

09358914948-09997866990

فہرست مضامین

③ تراویح کی بیس رکعتیں سنت ہیں

④ نمازوں کے بعد دعاؤں کا حکم

⑤ جمعہ وعیدین کے خطبے عربی میں کیوں ضروری ہیں؟

⑥ مسجد میں باتیں نہ کرنا اور تکبیر شروع ہونے پر نماز کے لئے کھڑا ہونا

⑦ دس دن میں قرآن ختم کرنا کیسا ہے؟

⑧ سعودیہ کے چاند کا مسئلہ

⑨ اصلاح معاشرہ کے لئے ضروری احکام

⑩ تین کام جو کامیابی کی کنجی ہیں

⑪ پانچ باتیں اللہ تعالیٰ ہی کو معلوم ہیں

⑫ آگ والے اور باغ والے برابر نہیں

⑬ نبوت سے انسان کو کیوں سرفراز کیا گیا؟

⑭ کامیابی ہدایت کی پیروی میں مضمر ہے

⑮ انسانوں کے اعمال مختلف ہیں اس لئے جزاء بھی مختلف ہے

⑯ آخرت کی کامیابی دس کاموں سے ہے

⑰ مودودی جماعت کی پانچ گمراہیاں

⑱ حجۃ اللہ البالغہ سے فائدہ کیسے اٹھائیں

⑲ جھگڑا کھڑا کرنے والی چھ باتیں

(تمسخر کرنا، طعنہ دینا، برالقب رکھنا، بدگمانی کرنا، ٹوہ میں لگنا، غیبت کرنا)

⑳ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دو واقعات

ستارہ پرستوں اور صنم پرستوں سے گفتگو

مسائل

افادات

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرضِ مرتب

یہ علمی خطبات کا حصہ دوم ہے، حصہ اول کی قارئین کرام نے غیر معمولی پذیرائی کی، ہر طرف سے حصہ دوم کے لئے مسلسل تقاضا ہوتا رہا، مگر میں اپنے تدریسی مشاغل کی وجہ سے جلد یہ حصہ تیار نہ کر سکا، اس لئے قائین عظام سے معذرت خواہ ہوں۔

علمی خطبات کا یہ سلسلہ اس حصہ پر پورا کیا جارہا ہے، تقاریر ابھی اور بھی جمع ہیں، مگر وہ کسی اور نام سے شائع ہونگی۔ والد ماجد مدظلہ فرماتے ہیں کہ اگر ایک ہی نام سے بہت حصے آجاتے ہیں تو قارئین کی دلچسپی گھٹ جاتی ہے، اس لئے طے کیا گیا ہے کہ آئندہ تقاریر کا نام الگ رکھا جائے گا۔ پس قارئین اس سلسلہ کے اگلے حصہ کا انتظار نہ فرمائیں۔

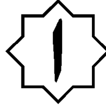
تقریر کے ضمن میں بعض قیمتی مسائل اور افادات آتے ہیں، مگر ان کا تقریر کے موضوع سے گہرا تعلق نہیں ہوتا، خطاب میں تو چونکہ مقرر نگاہوں کے سامنے ہوتا ہے اس لئے ایسی قدرے غیر متعلق باتیں بھی لطف دیتی ہیں، مگر جب خطاب کتابی شکل میں سامنے آئے تو یہ بے تعلقی بدمزگی پیدا کرتی ہے، اس لئے ایسی باتیں ہم نے تقریر سے الگ کر لی ہیں، اور آخر میں مسائل وافادات کے عنوان سے درج کی ہیں، اس سے تقریر مسلسل ہوگئی ہے، اور مسائل وافادات کو الگ عناوین کے تحت لینے سے ان شاء اللہ قارئین کرام کیلئے استفادہ میں سہولت ہوگی۔

پہلے حصہ کی طرح یہ حصہ بھی والد محترم کی نظر ثانی کے بعد شائع کیا جارہا ہے، اللہ تعالیٰ اس حصہ کو بھی حصہ اول کی طرح قبول فرمائیں، اور قارئین دلچسپی کے ساتھ اس سے بھی فائدہ اٹھائیں (آمین)

کتبہ

محمد سعید پالن پوری

خادم جامعۃ الشیخ محمد انور شاہؒ دیوبند۔ ۲۰/۴/۲۰۱۱ء



سورۂ فاتحہ کی تفسیر

خطبہ مسنونہ کے بعد: ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ ○ اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○ مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ○ إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ○ إِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ○ صِرَاطَ الَّذِيْنَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ○ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّيْنَ ○﴾ آمین

بزرگو اور بھائیو! یہ سورت قرآن کریم کی سب سے پہلی سورت ہے، یہ سورت قرآن کریم کا دیباچہ ہے، پورے قرآن کی تمہید ہے، اسی لئے اس سورت کو کسی پارے میں شامل نہیں کیا گیا۔

قرآن کریم کی پاروں میں تقسیم

قرآن کریم کے تیس پارے حضور ﷺ کے زمانہ میں نہیں تھے، پارہ: فارسی لفظ ہے اس کے معنی ہیں: ٹکڑا، حصہ، یہ جو تیس پارے یعنی تیس ٹکڑے قرآن کریم کے کئے گئے ہیں یہ حضور ﷺ کے زمانہ میں نہیں تھے، بعد میں کئے گئے ہیں، قرآن کریم میں ایسی بہت سی چیزیں ہیں جو حضور ﷺ کے زمانہ میں نہیں تھیں، جیسے حوض سے باہر عین (ع) لکھا ہوا ہے یہ عین رکوع کا عین ہے، پھر ایک ہندسہ اس کے اوپر ہے، ایک اس کے پیٹ میں، اور ایک اس کے نیچے، اوپر والا ہندسہ سورت کا سیریل نمبر ہے، پیٹ والا رکوع کی آیتوں کی تعداد بتاتا ہے، اور نیچے والا پارے کا سیریل نمبر ہے، اسی طرح کہیں وقفِ لازم لکھا ہے، کہیں وقفِ غفران، اور آیتوں کے درمیان باریک قلم سے رموز اوقاف لکھے ہیں یہ سب کچھ حضور ﷺ کے زمانہ میں نہیں تھا، گول دائرے والی آیت تھی مگر جو اس میں عدد لکھا ہوا ہے وہ نہیں تھا۔

غرض یہ جو تیس پارے بنائے گئے ہیں یہ بعد میں بنائے گئے ہیں، جب یہ پارے

بنائے گئے تو سورۂ فاتحہ کو کسی پارے میں نہیں لیا، پہلا پارہ الم سے شروع ہوتا ہے، کیونکہ اگر سورۂ فاتحہ کو پہلے پارہ میں لیں گے تو وہ پہلے پارہ کا دیباچہ بن جائے گا، باقی انتیس پاروں سے اس کا تعلق ختم ہو جائے گا، جبکہ یہ سورت پورے قرآن کا دیباچہ ہے۔

سورۂ فاتحہ کے مضامین کی ہمہ گیری

جب یہ سورت پورے قرآن کا دیباچہ، نچوڑ اور خلاصہ ہے تو اس میں کتنے مضامین ہونگے اس کا اندازہ کون کرسکتا ہے؟ امام رازیؒ ایک بڑے عالم گزرے ہیں ان کی تفسیر: تفسیر کبیر ہے، انہوں نے اپنی تفسیر کے شروع میں لکھا ہے کہ میں نے ایک مجلس میں کہا کہ سورۂ فاتحہ میں دس ہزار مسائل ہیں، اس پر بعض حاسدوں نے کہا کہ سورۂ فاتحہ میں دس ہزار الفاظ نہیں، دس ہزار مسائل کیسے ہونگے؟ جب امام رازی رحمہ اللہ کو یہ بات پہنچی تو انہوں نے تفسیر کبیر لکھی اور صرف تعوذ ﴿أَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ﴾ سے دس ہزار سے زیادہ مسائل مستنبط کیے۔ اور یہ دس ہزار مسائل بھی ایک شخص کی سمجھ میں آئے ہیں، جب ساری امت کے علماء مل کر بیٹھیں گے اور ہر ایک اپنے اپنے علم کے مطابق مسائل نکالے گا تو معلوم نہیں کتنے مسائل نکلیں گے، اس لئے میرے بھائیو! یہ سورت ام الکتاب ہے، قرآن کریم کی ماں ہے، اس لئے یہ بحرِ ناپیدا کنار ہے، ایسا سمندر ہے جس کا کوئی کنارہ نہیں، اس لئے اس سورت کے سارے مضامین بیان نہیں کیے جاسکتے، چند موٹی موٹی باتیں بیان کرتا ہوں۔

سورۂ فاتحہ کی اہمیت

سب سے پہلی بات اس سورت کی اہمیت ہے، ایک حدیث قدسی میں اللہ پاک ارشاد فرماتے ہیں: میں نے سورۂ فاتحہ کو اپنے اور بندوں کے درمیان تقسیم کیا ہے، سورۂ فاتحہ میں سات آیتیں ہیں، ساڑھے تین آیتیں اللہ سے تعلق رکھتی ہیں اور ساڑھے تین آیتیں بندوں سے، جب بندہ کہتا ہے ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ﴾ تمام تعریفیں اس اللہ کے لئے ہیں جو سارے جہانوں کے پالنہار ہیں تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: حمدنی عبدی: میرے بندے

نے میری تعریف کی، پھر جب بندہ کہتا ہے ﴿الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ﴾ اللہ بے حد مہربان نہایت رحم والے ہیں، تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: أثنى عليَّ عبدي: میرے بندے نے میری ستائش کی، پھر جب بندہ کہتا ہے: ﴿مَالِكِ يَوۡمِ الدِّيۡنِ﴾ وہ جزاء کے دن کے مالک ہیں تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: مجَّدني عبدي: میرے بندے نے میری بزرگی (بڑائی) بیان کی، غرض ہر آیت پر اللہ تعالیٰ جواب دیتے ہیں۔

چنانچہ جب نبی پاک ﷺ نماز میں سورۂ فاتحہ پڑھتے تھے تو ہر آیت پر ٹھہرتے تھے، اب لوگ دو تین سانسوں میں پوری سورۂ فاتحہ پڑھ ڈالتے ہیں یہ ٹھیک نہیں، یہ لوگ گویا اللہ کو جواب دینے کا موقع نہیں دیتے، پس یہ حضور ﷺ کی سنت نہیں، کبھی جلدی ہو تو کوئی بات نہیں، باقی اگر جلدی نہ ہو تو تنہا پڑھے یا جماعت سے، ہر آیت پر ٹھہرے اور اللہ تعالیٰ کا جواب دل کے کان سے سنے۔

پھر جب بندہ کہتا ہے: ﴿إِيَّاكَ نَعۡبُدُ﴾ ہم آپ ہی کی بندگی کرتے ہیں، اس ٹکڑے کا تعلق اللہ تعالیٰ سے ہے ﴿وَإِيَّاكَ نَسۡتَعِيۡنُ﴾ اور ہم آپ ہی سے مدد چاہتے ہیں، اس کا تعلق بندے سے ہے، بندہ اللہ سے مدد مانگتا ہے تو اللہ کی طرف سے جواب آتا ہے: هذا بيني وبين عبدي: یہ آیت میرے اور میرے بندے کے درمیان ہے، یعنی دونوں سے تعلق رکھتی ہے، آدھی آیت کا تعلق اللہ سے ہے اور آدھی آیت کا تعلق بندے سے: ولعبدي ما سأل: اور میرے بندے نے جو کچھ مانگا ہے میں ضرور اس کو دوں گا یعنی اپنے بندے کی ضرور مدد کروں گا، پھر بندہ کہتا ہے: ﴿إِهۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِيۡمَ﴾ ہمیں سیدھا راستہ دکھا! جو راستہ اللہ تک پہنچتا ہے، جنت تک پہنچتا ہے وہی سیدھا راستہ ہے، اس میں اینچ پینچ نہیں جو سیدھا راستہ ہے وہ ہمیں دکھا، ابھی جواب نہیں آتا، تین آیتوں کے بعد جواب آئے گا۔

اور سیدھا راستہ جو اللہ تک اور جنت تک پہنچنے والا ہے وہ ہمیں نظر نہیں آتا، یہ معنوی چیز ہے، اس لئے اس کو مثبت پہلو سے مشخص کیا جا رہا ہے ﴿صِرَاطَ الَّذِيۡنَ أَنۡعَمۡتَ عَلَيۡهِمۡ﴾ ہمیں وہ راستہ دکھا جس پر آپ کے وہ بندے چلتے رہے ہیں جن پر آپ نے انعام فرمایا ہے، پھر منفی پہلو سے سیدھے راستہ کو مشخص کیا ہے، فرمایا: ﴿غَيۡرِ الۡمَغۡضُوۡبِ عَلَيۡهِمۡ وَلَا

الضَّالِّیْنَ﴾ خدایا! ہمیں دو شخصوں کے راستہ سے بچا، ایک: جن پر آپ کا غضب بھڑکا، دوسرے: وہ جو گمراہ ہوئے، سیدھے راستہ کو انھوں نے گم کردیا، ان کے راستہ سے بھی ہمیں بچا! تینوں آیتیں مل کر ایک مضمون مکمل ہوا، اب اللہ کی طرف سے جواب آتا ہے: **ھذا لعبدی ولعبدی ماسأل**: یہ میرے بندے کی دعا ہے اور میں اپنے بندے کی دعا پوری کروں گا، میں اس کو وہ راستہ دکھاؤں گا جو میرے **منعم علیھم** بندوں کا راستہ ہے اور اس کو اس راستہ سے بچاؤں گا جو گمراہوں کا راستہ ہے۔

یہ سورۂ فاتحہ کا ترجمہ ہے، اس کی شروع کی تین آیتوں میں اللہ کی تعریف اور حمد وثنا ہے اور آخری تین آیتوں میں بندوں کی دعا ہے اور بیچ کی آیت آدھی اللہ سے تعلق رکھتی ہے اور آدھی بندوں سے۔

اور حدیث میں ہے: سلوا اللہ: اللہ سے مانگو، اگر تمہارے چپل کا تسمہ ٹوٹ جائے تو وہ بھی اللہ تعالیٰ سے مانگو، اور ہدایت بڑی چیز ہے جو اللہ کے علاوہ کوئی نہیں دے سکتا، سرور کونین ﷺ بھی یہ چیز نہیں دے سکتے، قرآن کریم میں ہے: ﴿إِنَّكَ لَا تَهْدِىْ مَنْ أَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِىْ مَنْ يَّشَاءُ﴾ آپ جس کو چاہیں ہدایت نہیں دے سکتے، منزل مقصود تک نہیں پہنچا سکتے، ہدایت اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے ﴿إِنَّ اللّٰهَ يَهْدِىْ مَنْ يَّشَاءُ﴾ اللہ جس کو چاہتے ہیں منزل مقصود تک پہنچاتے ہیں۔

اس دنیا میں بہت سے بھیڑئے انسان کی شکل میں ہوتے ہیں، وہ میٹھی میٹھی باتیں کرتے ہیں، ان کی باتیں بڑی اچھی معلوم ہوتی ہیں، مگر وہ حقیقت میں ہدایت کا راستہ نہیں، اس لئے ہر شخص کو سمجھ کر چلنا ہے، اندھادھند نہیں چلنا، دین کے معاملہ میں اندھاپن مضر ہے، قرآن وحدیث دو روشنیاں ہیں ان سے فائدہ اٹھا کر چلنا ہے، اور دنیا میں جو نظریئے پائے جاتے ہیں ان کو قرآن وحدیث سے ملانا ہے، جو راستے **منعم علیھم** کے ہیں ان کو اپنانا ہے اور گمراہوں کے راستہ سے بچنا ہے، یہ سورۂ فاتحہ کا خلاصہ ہے اب تھوڑی تفصیل کرتا ہوں۔

اللہ تعالیٰ کی تین صفتیں: پہلی صفت: ربوبیت

سورۂ فاتحہ کے شروع میں اللہ تعالیٰ کی تین صفتیں بیان کی گئی ہیں، جن کا انسان کے ساتھ

خاص تعلق ہے، پہلی صفت کا دنیا کے ساتھ تعلق ہے اور تیسری کا آخرت کے ساتھ اور دوسری کا دونوں جہانوں کے ساتھ۔

پہلی صفت: ربوبیت ہے۔ فرمایا: ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ﴾ تمام تعریفیں اس اللہ کے لئے ہیں جو تمام جہانوں کے 'رب' ہیں، پوری کائنات کے پالنہار ہیں، انسان کے بھی پروردگار ہیں۔

رب کے معنی

رب: اس ہستی کو کہتے ہیں جس میں تین باتیں جمع ہوں:

۱- جو کسی چیز کو وجود بخشے، نیست سے ہست کرے، نہ تھنگ سے تھنگ بنائے، ایسی ذات صرف اللہ تعالیٰ کی ہے، وہی ذرے ذرے کو وجود بخشتے ہیں، اور کوئی نہیں ہے جو کسی چیز کو موجود کر سکے۔

۲- مخلوق کے وجود پزیر ہونے کے بعد اس کی بقاء کا سامان کرے، اگر بقاء کا سامان نہیں کیا جائے گا تو چیز موجود ہوتے ہی ختم ہو جائے گی، منصۂ شہود پر جلوہ گر نہیں رہ سکے گی، اور یہ کام بھی صرف اللہ تعالیٰ کا ہے، وہی ہر مخلوق کو پیدا کر کے اس کی بقاء کا سامان کرتے ہیں، آپ غور نہیں کرتے جانور کا بچہ دانت لے کر آتا ہے اور پیدا ہوتے ہی گھاس چگنے لگتا ہے، اور انسان کا بچہ ناتواں پیدا ہوتا ہے، چنانچہ اس کی بقاء کے لئے تین سامان کئے:

انسان کی بقاء کے لئے تین سامان

(الف) بچہ کے پیدا ہونے کے بعد ماں کی چھاتی میں دودھ کی دو نہریں جاری کر دیں، مگر ایک دو دن کے بعد دودھ اترتا ہے، اتنے میں بچہ کا پیٹ صاف ہو جاتا ہے، تمام آلائش جو بچہ کے پیٹ میں تھی نکل جاتی ہے، اب دودھ اترتا ہے، اور چینی اس میں ملی ہوئی ہوتی ہے، اور لوفیٹ (کم دُہنیت) کا دودھ ہوتا ہے، اور لڑکے کا حصہ لڑکی سے دوگنا ہوتا ہے یعنی اس کے دودھ میں دُہنیت زیادہ ہوتی ہے، اور لڑکی کے دودھ میں کم، اور بچہ دانت لے کر نہیں

آتا، کیونکہ ابھی اس کا معدہ سخت چیز کو ہضم نہیں کرسکتا، جب معدہ کسی قابل ہوجاتا ہے تو دانت نکلنے شروع ہوتے ہیں۔

(ب) اللہ تعالی بچے کو دنیا میں چوسنا اور نگلنا سکھا کر بھیجتے ہیں، اگر بچہ یہ دو چیزیں نہ جانتا تو ماں کی چھاتی سے کیسے استفادہ کرتا؟ چوسنا بچہ کی فطرت میں ایسا رکھ دیا کہ جو بھی چیز منہ میں دی جاتی ہے اسے چوستا ہے، اور جو بھی چیز منہ میں ڈالی جائے نگل جاتا ہے، یہ بچہ کے بقاء کا سامان کیا، غور کرو! اگر اللہ تعالیٰ بچے کو یہ دو باتیں نہ سکھاتے تو کون سی درسگاہ تھی جو اس کو یہ باتیں سیکھاتی؟ کوئی نہیں سکھا سکتا تھا پھر بچہ زندہ کیسے رہتا؟

(ج) اللہ تعالیٰ نے بچہ کو انٹرنیشنل زبان سکھا کر پیدا کیا، جس کے ذریعہ وہ دل کی بات کہتا ہے، اور وہ زبان 'رونا' ہے، دنیا کے سب بچے ایک طرح روتے ہیں، عربوں کا بچہ عربی میں، انگریزوں کا بچہ انگریزی میں، اور اردو والوں کا بچہ اردو میں نہیں روتا، سب بچے ایک ہی طرح روتے ہیں، یہی ان کی انٹرنیشنل زبان ہے، چنانچہ بچہ دنیا میں قدم رکھتے ہی چلاّ تا ہے، اس طرح وہ اپنے زندہ ہونے کا اعلان کرتا ہے، پھر بھوک لگے گرمی لگے یا سردی لگے بچہ روتا ہے اور ماں اس کی حاجت سمجھ جاتی ہے، پیٹ میں درد ہوتا ہے تو بچہ بے تحاشہ روتا ہے، گھر والے بے چین ہوجاتے ہیں، آخری چارہ ڈاکٹر ہوتا ہے، وہ بچہ کے پیٹ کو دباتا ہے تو وہ اور روتا ہے، ڈاکٹر سمجھ جاتا ہے کہ اس کے پیٹ میں تکلیف ہے، وہ دوا دیتا ہے اور بچہ رونا بند کردیتا ہے، غرض بچہ ہر بات رونے کے ذریعہ ڈکلیر کرتا ہے، سوچو! اگر اللہ تعالی بچہ کو رونا نہ سکھاتے تو کوئی طاقت تھی جو بچہ کی دل کی بات سمجھا دیتی۔

علاوہ ازیں: ماں باپ کے دلوں میں بچے کی الفت رکھ دی، وہ اس کو دو سال تک اٹھائے پھرتے ہیں، اور جانور کا بچہ پیدا ہوتے ہی اپنے پیروں سے چلنے لگتا ہے، غرض یہ ایک مثال ہے، اسی طرح ہر مخلوق کو وجود بخشنے کے بعد اس کی بقاء کا سامان کیا جو ایک ضروری چیز ہے۔

۳- اور رب ہونے کے لئے تیسری چیز یہ ضروری ہے کہ ہر مخلوق کو تدریجی طور پر آہستہ آہستہ ترقی دے کر آخری منزل تک پہنچایا جائے، چنانچہ آسمانوں اور زمین کو چھ ادوار میں پیدا

کیا، کن فیکونی طاقت سے دفعۃً پیدا نہیں کیا، کیونکہ ربوبیت کے لئے تدریج ضروری ہے، پھر ہر مخلوق کا ایک آخری پوئنٹ ہے اس آخری حد پر جا کر اس مخلوق کی ترقی رک جاتی ہے، مرچی کا پودہ اپنے لیول پر پہنچ کر رک جاتا ہے، آم کی امرود کی بلکہ ہر نبات کی ایک آخری حد ہے اس پر پہنچ کر اس کو رک جانا ہے، پھر ہر سال پتے جھڑتے ہیں، نئی کونپلیں نکلتی ہیں مگر درخت اس حد پر رکا رہتا ہے، یہی حال تمام حیوانات کا ہے، بلکہ تمام جمادات کا ہے، وہ آہستہ آہستہ بڑھ کر اپنی آخری حد پر رک جاتے ہیں، یہ بات ربوبیت میں شامل ہے، اور اللہ تعالیٰ سارے جہانوں کے رب ہیں، پس ہر تعریف انہی کے لئے ہے (۱)

رحمتِ عامہ اور خاصہ

دوسری صفت رحمتِ عامہ وخاصہ ہے، فرمایا: ﴿الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ بے حد مہربان نہایت رحم والا! یہ دو صفتیں ایک ساتھ ہیں، ہماری درمیانی زندگی کے اعتبار سے ہیں، ہماری زندگی کی ابتداء کے اعتبار سے اللہ کی صفت ربوبیت کام کرتی ہے اور ہماری زندگی کی نہایت سے ﴿مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ﴾ کا تعلق ہے اور ہماری زندگی کے درمیانی مرحلہ سے یہ دو صفتیں ﴿الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ ہیں، پس ہمیں بھی دنیا کی زندگی میں دوسروں پر مہربانی کرنی چاہئے تاکہ اللہ تعالیٰ ہم پر مہربانی فرمائیں، حدیث میں ہے: الرَّاحِمُوْنَ يَرْحَمُهُمُ الرَّحْمٰنُ: جو لوگوں پر مہربانی کرنے والے ہیں ان پر نہایت مہربان مہربانی فرماتے ہیں، پھر فرمایا: اِرْحَمُوْا مَنْ فِي الْأَرْضِ يَرْحَمْكُمْ مَنْ فِي السَّمَاءِ: مہربانی کرو ان مخلوقات پر جو زمین میں ہیں، مہربانی کرے گا تم پر وہ اللہ جو آسمانوں میں ہے۔

(۱) جب میں نے یہ تقریر مرتب کی تو والد محترم سے پوچھا: آپ نے رب کے جو معنی بیان کئے ہیں اس کا کوئی حوالہ ہے؟ فرمایا: یہ معنی امام راغبؒ نے مفردات میں بیان کئے ہیں، میں نے مفردات دیکھی تو اس میں یہ عبارت ہے: هو إنشاء الشيئ حالا فحالا إلى حد التمام: اس عبارت کا یہی مفہوم ہے جو والد محترم نے پھیلایا ہے، اور لغات القرآن لفظ ربّ میں بھی اس کی تفصیل ہے، ۱۲ محمد سعید پالن پوری۔

اللہ کی بعض صفات خاص ہیں اور بعض عام

اللہ کی صفتیں دوطرح کی ہیں، ایک: وہ جو اللہ کے ساتھ خاص ہیں، دوسری وہ جو ہمارے اندر بھی ہوسکتی ہیں مگر درجے الگ الگ ہوں گے، اللہ میں اللہ کے درجہ کی صفت ہوگی اور ہمارے اندر ہمارے درجہ کی۔

پھر اللہ کی جو صفتیں مخلوق میں بھی ہوسکتی ہیں ان کی دو قسمیں ہیں، ایک: وہ جو خود بخود پیدا ہوتی ہیں جیسے اللّٰه سمیع (سننے والے) ہیں تو ہم بھی سمیع ہیں، اللّٰه بصیر (دیکھنے والے) ہیں تو ہم بھی بصیر ہیں، یہ صفات ہمارے اندر خود بخود پیدا ہوتی ہیں ہم نے اپنے اختیار سے ان کو پیدا نہیں کیا، مگر اللہ کا سننا اللہ کا سننا ہے اور ہمارا سننا ہمارا سننا ہے، اللہ کا دیکھنا اللہ کا دیکھنا ہے اور ہمارا دیکھنا ہمارا دیکھنا ہے، مخلوق اور خالق کی صفات کے درمیان نام کے علاوہ کوئی اشتراک نہیں ہوتا۔

دوسری قسم: وہ صفات ہیں جو اختیاری ہیں یعنی اگر ہم کوشش کریں تو ہمارے اندر وہ صفات پیدا ہونگی ورنہ نہیں، جیسے اللہ کی صفت عدل ہے، اللہ انصاف کرنے والے ہیں، پس ہم اگر کوشش کریں گے، اپنے آپ کو انصاف کا خوگر بنائیں گے تو ہمارے اندر بھی یہ صفت پیدا ہوگی ورنہ نہیں، اللہ رحمان ورحیم ہیں، رحمان عام ہے رحیم خاص ہے، رحمان کے معنی میں زیادتی ہے اس لئے کہ اس میں حروف زیادہ ہیں، پس رحمان کا تعلق دنیا سے ہے، اس دنیا میں ہر کسی کو مومن کو بھی اور کافر کو بھی رحمت سے حصہ ملتا ہے، کوئی محروم نہیں رہتا، اور رحیم کا تعلق آخرت سے ہے، آخرت میں مؤمنین پر ہی مہربانی ہوگی، وہی جنت میں جائیں گے، پس اللہ تعالی کی دو مہربانیاں ہیں، ایک عام اور ایک خاص، اگر ہم کوشش کریں تو ہم بھی یہ دو مہربانیاں اپنے اندر پیدا کر سکتے ہیں، خاص مہربانی مسلمانوں کی حد تک ہوتی ہے اور عام مہربانی تمام مخلوقات کے ساتھ ہوتی ہے، اس میں مسلم غیر مسلم حیوانات چرند و پرند سب داخل ہیں، قرآن کریم میں صحابہ کی شان میں فرمایا گیا ہے: ﴿وَالَّذِیْنَ مَعَهٗ أَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ﴾: صحابہ غیر مسلموں کے سامنے تیز ہیں اور آپس میں نرم، یہ جو فرق ہے کہ

ایک کے سامنے تیز ہیں اور دوسرے کے سامنے نرم، یہ وہی خاص مہربانی ہے اور وہ کوئی قابل اعتراض چیز نہیں، ایسی خاص مہربانیاں ہر ایک میں ہوتی ہیں، ماں باپ کی اولاد پر خاص مہربانی ہوتی ہے، اور رشتہ داروں اور محلّہ والوں کے ساتھ عام مہربانی ہوتی ہے، استاذ کی اپنے طالب علموں کے ساتھ خاص مہربانی ہوتی ہے، یہ مہربانی دوسرے طالب علموں کے ساتھ یا دوسرے انسانوں کے ساتھ نہیں ہوتی، ایسی ہی مسلمانوں کی مسلمانوں کے ساتھ ایک خاص مہربانی ہونی چاہئے، اسی مہربانی کو قرآن نے ﴿إِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ إِخْوَةٌ﴾ سے تعبیر کیا ہے، اور ایک مہربانی ہر مخلوق کے ساتھ ہوتی ہے، ایک موقع پر نبی پاک ﷺ نے فرمایا: جانوروں کے ساتھ حسن سلوک کرو، صحابہ نے پوچھا: یا رسول اللہ: ہم جو جانوروں کے ساتھ حسن سلوک کرتے ہیں کیا اس میں بھی اجر وثواب ہے؟ حضور ﷺ نے فرمایا: فی کل ذاتِ کَبِدٍ رَطْبٍ أَجْرٌ: ہر زندہ مخلوق کے ساتھ اچھا سلوک کرنے میں اجر وثواب ہے، پس جب ہر مخلوق کے ساتھ حسن سلوک کرنے میں اجر ہے تو غیر مسلموں کے ساتھ جبکہ وہ ضرورت مند بھی ہوں اچھا سلوک کرنے میں اجر کیوں نہیں ہوگا؟

بہرحال اللہ کی ایک مہربانی مؤمنین کے ساتھ خاص ہے، اسی کی وجہ سے آخرت میں مؤمنین کو جنت ملے گی، کافروں کو نہیں ملے گی، اور ایک مہربانی عام ہے، اس دنیا میں اللہ تعالیٰ سب پر مہربان ہیں، پس ہمارے اندر بھی دو مہربانیاں ہونی چاہئیں، ایک خاص مہربانی جو مسلمانوں کے ساتھ ہو اور ایک عام مہربانی جو ہر مخلوق کے ساتھ ہو۔

الغرض اللہ کی بعض صفات وہ ہیں جو انسانوں میں بھی ہوسکتی ہیں اگر چہ درجے دونوں کے الگ الگ ہونگے۔

اور کچھ صفتیں وہ ہیں جو اللہ کے ساتھ خاص ہیں، جیسے اللہ احد ہیں، تنہا ہیں، یہ صفت اللہ کے ساتھ خاص ہے، اللہ کے علاوہ کوئی تنہا نہیں اللہ نے ہر چیز کو جوڑا جوڑا بنایا ہے، ﴿سُبْحَانَ الَّذِیْ خَلَقَ الْأَزْوَاجَ كُلَّهَا﴾: اللہ تعالیٰ (جوڑا ہونے سے) پاک ہیں، جنھوں نے سبھی چیزوں کو جوڑا جوڑا بنایا۔ اللہ تعالی متکبر (بڑی شان والے) ہیں، یہ صفت بھی اللہ کے ساتھ خاص ہے، ہمیں تکبر کرنے کی یعنی بڑا بننے کی اجازت نہیں، حدیث قدسی میں ہے: اَلْعَظَمَةُ

إِزَارِیْ، وَالْكِبْرِيَاءُ رِدَائِي فَمَنْ نَازَعَنِیْ كَبَّبْتُه فِي النَّارِ: عظمت میری لنگی ہے، اور بڑائی میرا کرتا ہے، جو یہ دو کپڑے مجھ سے چھیننا چاہے گا میں اس کو جہنم میں اوندھے منھ ڈال دوں گا، لہٰذا بڑے مت بنو، حدیث میں ہے: من تَوَاضَعَ لِلّٰهِ رَفَعَهُ اللّٰهُ: جو شخص اللہ کے لئے خاکساری اختیار کرتا ہے اللہ تعالیٰ اسے اونچا کرتے ہیں، بلند مرتبہ عطا فرماتے ہیں، پس انسان کو اپنے اندر تکبر نہیں، خاکساری اور تواضع پیدا کرنی چاہئے۔

بات کا خلاصہ: یہ ہے کہ اللہ کی کچھ صفات اللہ کے ساتھ خاص ہیں، اور کچھ صفات عام ہیں ان میں سے کچھ ہمیں خود بخود ملتی ہیں اور کچھ کوشش کر کے اپنے اندر پیدا کرنی پڑتی ہیں، اور اللہ کی صفتیں بے شمار ہیں، ایک حدیث میں نبی پاک ﷺ نے اللہ کے ننانوے نام بیان کئے ہیں پھر فرمایا: مَنْ أَحْصَاهَا دَخَلَ الْجَنَّةَ: جو ان کا احاطہ کرے گا جنت میں جائے گا، احاطہ کرنا کیا ہے؟ احاطہ کرنا یہ ہے کہ پہلے ان کو یاد کرے پھر ان کا مطلب سمجھے پھر ان ناموں میں سے جو نام اللہ کے ساتھ خاص ہیں ان کو خاص رہنے دے اور جو خاص نہیں ان کو اپنے اندر پیدا کرے، یہ تین باتیں جمع ہونگی تب احاطہ کرنا پایا جائے گا۔

دین کے بنیادی عقیدے تین ہیں

دین کے دو حصے ہیں عقیدے اور اعمال، عقیدے جڑ ہیں جن سے اعمال کی شاخیں نکلتی ہیں، اگر جڑ اچھی ہوگی تو اس پر شاخیں اچھی نکلیں گی اور جڑ خراب ہوگی تو شاخیں خراب نکلیں گی، اور بنیادی عقیدے تین ہیں باقی عقیدے ان میں سے نکلتے ہیں۔

اسلام کے بنیادی عقیدے: توحید، رسالت اور معاد ہیں، مکی دور میں جو پچاسی سورتیں نازل ہوئی ہیں ان میں یہی تین عقیدے سمجھائے گئے ہیں:

پہلا عقیدہ: توحید ہے: لا إلٰه إلا الله: اللہ ہی معبود ہیں: ان کے علاوہ کوئی معبود نہیں، باطل مذاہب صرف اللہ کو معبود نہیں مانتے، اللہ کے علاوہ کو بھی معبود مانتے ہیں، عیسائی اللہ کے علاوہ 'بیٹے' کو اور 'پاکیزہ روح' کو بھی معبود مانتے ہیں، ہندو اللہ کے علاوہ بے حساب معبود مانتے ہیں، یہودیوں کا ایک فرقہ حضرت عزیر علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا کہتا ہے اور مسلمانوں میں

بھی ایسے لوگ ہیں جو قبروں کے سامنے سجدے کرتے ہیں، طواف کرتے ہیں اور قبر والوں سے مرادیں مانگتے ہیں یہ باتیں توحید کے منافی ہیں، یہ شرک ہے، اللہ کے علاوہ کسی کو معبود ماننا یا اس کے سامنے مراسم عبادت بجالانا شرک ہے۔

دوسرا عقیدہ: رسالت ہے رسالت کے معنی ہیں: بھیجنا، اللہ تعالیٰ نے اپنا پیغام انسانوں کے پاس بھیجا ہے کہ میری بندگی کرو، میرے یہ احکام ہیں ان کی پیروی کرو، یہی اللہ کا پیغام بھیجنا رسالت ہے۔

اور اللہ اپنا پیغام فرشتوں کے ذریعہ بھیجتے ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کسی انسان سے رو در رو بات نہیں کرتے، اس کو انسان برداشت نہیں کرسکتا، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعہ میں پہاڑ اللہ کی تجلی کو برداشت نہیں کرسکا تھا، ریزہ ریزہ ہو گیا تھا، پس انسان تو پہاڑ سے کمزور ہے وہ تجلی کیسے برداشت کرسکتا ہے، اس لئے اللہ اپنا پیغام فرشتوں کے ذریعہ بھیجتے ہیں، فرشتے انسانوں کی اصلاح کا کام کریں ایسا نہیں ہوسکتا، فرشتے اللہ کا پیغام انسانوں میں سے کسی انسان کو پہنچاتے ہیں، اللہ انسان کو رسول بناتے ہیں، رسول: اللہ کا یہ پیغام انسانوں تک پہنچاتا ہے۔

پھر جب رسالت کے عقیدے کی تفصیلات سامنے آئیں تو ایک عقیدے کے چار عقیدے بن گئے، پیغام بھیجنے والے (اللہ) پر ایمان لانا، جن کے ذریعہ پیغام بھیجا گیا یعنی فرشتوں پر ایمان لانا، اور جس نے پیغام وصول کیا یعنی نبی پر ایمان لانا، اور خود پیغام کو ماننا جس نے اللہ کی کتاب کی شکل اختیار کی۔

تیسرا عقیدہ: معاد ہے، معاد کے معنی ہیں: پیچھے لوٹنا، ریوس آنا، یہ دنیا جو چل رہی ہے، اس کا آخری دن ہے، اس آخری دن میں تمام حیوانات پہلی مرتبہ صور پھونکنے پر ختم ہو جائیں گے، پھر چالیس سال کا وقفہ گزرے گا، اس کے بعد اللہ تعالیٰ ایک بارش برسائیں گے جس کے اثر سے تمام حیوانات کے بدن زمین سے اُگ آئیں گے، جیسے برسات میں زمین سے گھاس اُگ آتی ہے، پھر دوسری مرتبہ صور پھونکا جائے گا تو تمام روحیں جو عالم برزخ میں ہیں لوٹ کر اس دنیا میں آئیں گی اور اپنے اپنے جسموں میں داخل ہو جائیں گی، یہی نشأۃ

ثانیہ ہے، دوسری مرتبہ کی پیدائش ہے، پس روحیں چونکہ عالم برزخ سے واپس آئیں گی اس لئے اس کو معاد کہتے ہیں، اور اس کو آخرت بھی کہتے ہیں، یہی تیسرا بنیادی عقیدہ ہے۔

قیامت کے دن اللہ کے علاوہ کوئی مالک نہیں ہوگا

اس دنیا میں ہم میں سے ہر شخص مالک بنا بیٹھا ہے، کہتا ہے: یہ گھر میرا ہے، یہ زمین میری ہے، یہ دوکان میری ہے، یہ سب اس دنیا کی ملکیتیں ہیں، اور یہ سب ملکیتیں مجازی ہیں، حقیقی نہیں، جب قیامت کا دن آئے گا تو کوئی کسی چیز کا مالک نہیں ہوگا، آج کی سب ملکیتیں ختم ہو جائیں گی، اس دن ہر چیز کے مالک اللہ تعالی ہونگے اللہ کے علاوہ کوئی کسی چیز کا مجازی مالک بھی نہیں ہوگا، قرآن کریم میں ہے: ﴿وَمَا أَدْرَاكَ مَا يَوْمُ الدِّيْنِ﴾ تم جانتے ہو کہ جزاء کا دن کیسا ہے؟ ﴿ثُمَّ مَا أَدْرَاكَ مَا يَوْمُ الدِّيْنِ﴾ پھر دوبارہ سوال کیا کہ تم جانتے ہو جزاء کا دن کیسا ہے؟ ﴿يَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِنَفْسٍ شَيْئًا وَالْأَمْرُ يَوْمَئِذٍ لِلّٰهِ﴾ وہ ایسا دن ہے کہ اس میں کوئی کسی کے لئے کسی چیز کا مالک نہیں ہوگا، ہر چیز کا اختیار اللہ کے لئے ہوگا، اور سورۂ مؤمن میں اللہ تعالیٰ نے قیامت کا منظر کھینچا ہے، میدان محشر میں جہاں اولین وآخرین جمع ہونگے اللہ تعالی اہل محشر سے سوال کریں گے ﴿لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ﴾ آج حکومت کس کی ہے؟ حدیث شریف میں ہے کہ کوئی سانس لینے والا نہیں ہوگا، سب سناٹے میں آجائیں گے، جب کوئی جواب نہیں دیگا تو اللہ تعالیٰ خود ہی جواب دیں گے ﴿لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ﴾ آج حکومت صرف اللہ کی ہے جو ایک ہیں اور غالب ہیں، ان کے علاوہ کسی کی حکومت نہیں، اللہ پاک نے سورۂ فاتحہ میں تیسری صفت یہی بیان کی ہے، ﴿مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ﴾ وہ جزاء کے دن کے مالک ہیں، اس دنیا کے اختتام پر جو پچاس ہزار سال کا دن آئے گا اس دن میں سب کو دوبارہ پیدا کیا جائے گا اور جزاوسزا سے دوچار کیا جائے گا، اگر اچھے کام کئے ہیں تو اچھا بدلہ ملے گا، اور برے کام کئے ہیں تو برا بدلہ ملے گا، اور یہ بدلہ اللہ ہی دیں گے۔

سورۂ فاتحہ میں دین کے تینوں بنیادی عقیدوں کا ذکر

اسلام کے تینوں بنیادی عقیدے سورۂ فاتحہ میں ذکر کئے گئے ہیں، پہلا عقیدہ توحید اس

طور پر ذکر کیا ہے کہ اللہ تعالی سارے جہانوں کے رب ہیں انہی کے لئے تمام تعریفیں اور تمام کمالات ہیں اور جب سارے کمالات انہی کے لئے ہیں تو بندگی بھی انہی کیلئے ہے، بندگی کرنا ایک عاجزی ہے اور معبود ہونا آخری درجہ کا کمال ہے، پس اگر ہم کسی اور کی بھی بندگی کریں تو جو کمال ہم نے اللہ کے لئے ثابت کیا ہے اس کو دوسرے کے لئے ثابت کر دیا، یہی شرک ہے جو توحید کی منافی ہے، پھر اللہ کی صفات میں سے ایک صفت ﴿رَبِّ الْعَالَمِيْنَ﴾ ذکر کی گئی جس کی وجہ سے ہم عدم سے وجود میں آتے ہیں، پھر ایک ساتھ دو صفتیں ﴿الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ ذکر کیں، پھر تیسری صفت ﴿مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ﴾ ذکر کی جس کا تعلق تیسرے عقیدے سے ہے، اور دوسرا عقیدہ رسالت کا آخری تین آیتوں میں مذکور ہے۔

فرمایا: ﴿إِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ﴾ دکھلایئے ہمیں سیدھا راستہ، دکھلانے کے دو مطلب ہیں: إراء ة الطريق اور: إيصال إلى المطلوب راستہ میں آپ کو کوئی آدمی ملا، اس نے کہا: مجھے فلاں جگہ جانا ہے، آپ نے کھڑے کھڑے بتا دیا کہ آگے جا کر دائیں طرف مڑ جانا پھر چوراہا آئے گا وہاں بائیں طرف مڑ جانا، یہ إراء ة الطريق ہے: راستہ دکھلانا، اس میں ضروری نہیں کہ وہ شخص منزل تک پہنچ جائے، بھٹک بھی سکتا ہے، اور راستہ دکھانے کی دوسری صورت یہ ہے کہ آپ نے اس سے کہا: میرے پیچھے آؤ، آپ آگے جا رہے ہیں اور وہ پیچھے آ رہا ہے، ایک جگہ پہنچ کر آپ نے کہا: تمہاری منزل یہ ہے، اس میں گمراہ ہونے کا کوئی اندیشہ نہیں، یہ إيصال الى المطلوب ہے۔ پہلے معنی کے اعتبار سے انبیاء بھی راستہ دکھاتے ہیں، ان کے وارثین بھی دکھاتے ہیں، اور دوسرے معنی کے اعتبار سے صرف اللہ تعالی راستہ دکھاتے ہیں، وہی ایک ہستی ہے جو منزل تک پہنچاتی ہے اسی منزل تک پہنچنے کی دعا ﴿إِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ﴾ میں مانگی گئی ہے، ہم اللہ کے فضل سے منزل تک پہنچے ہوئے ہیں، مگر منزل پر پہنچنے کے بعد آگے ایک مرحلہ اور آتا ہے اور وہ یہ ہے کہ ہم منزل پر ٹھہرے رہیں، بھٹک نہ جائیں، جب منزل تک پہنچانا اللہ کا کام ہے تو منزل پر جمانا بھی اللہ ہی کا کام ہے، اس لئے جب ہم ﴿إِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ﴾ کہیں گے تو اس کے دوسرے معنی بھی ہونگے کہ اے اللہ ہمیں سیدھے راستہ پر جمائے رکھ، بچلنے سے بچا۔

سیدھا راستہ کونسا ہے؟ فرمایا: ﴿صِرَاطَ الَّذِيْنَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ﴾ ان بندوں کا راستہ جن پر آپ نے انعام فرمایا، سورۂ نساء میں ہے: ﴿وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَأُوْلٰئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ أَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِنَ النَّبِيِّيْنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَاءِ وَالصَّالِحِيْنَ﴾: جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتا ہے وہ آخرت میں ان لوگوں کے ساتھ ہوگا جن پر اللہ نے انعام فرمایا ہے، اللہ نے چار قسم کے لوگوں پر انعام فرمایا ہے، نبیوں پر، صدیقوں پر، شہیدوں پر اور نیک لوگوں پر، یہ درجہ بدرجہ ہیں، نبیوں کا درجہ سب سے بلند ہے، پھر صدیقین کا پھر شہداء کا اور آخر میں نیک لوگوں کا درجہ ہے، انہیں کے راستہ پر ہم چلنے کی دعا مانگتے ہیں۔

دنیا میں جتنے مذاہب ہیں سبھی یہ کہتے ہیں کہ ہمارا راستہ اللہ کے یہاں سے آیا ہے اور ہم اللہ تک پہنچیں گے، اس لئے آگے ارشاد فرماتے ہیں کہ اللہ کے یہاں سے آئے ہوئے راستہ پر سب لوگ برقرار نہیں رہے، کچھ لوگ اللہ کے راستہ پر رہے اور کچھ لوگ پھسل گئے، گمراہ ہو گئے اور گمراہی میں اتنی دور نکل گئے کہ اللہ کا غصہ ان پر بھڑکا، اور کچھ راستہ سے ہٹے مگر کم ہٹے دور تک نہیں نکلے فرمایا: ﴿غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّيْنَ﴾ ان لوگوں کا راستہ نہیں جن پر آپ کا غصہ بھڑکا اور نہ ان لوگوں کا راستہ جو راستہ سے ہٹ گئے۔

اسٹیشن پر آپ دیکھیں گے: جب ایک پٹری دوسری پٹری سے علاحدہ ہوتی ہے تو ایک انچ کے فاصلہ سے علاحدہ ہوتی ہے پھر ایک مغرب میں جاتی ہے اور ایک مشرق میں مگر شروع میں ایک انچ کے فاصلہ سے الگ ہوتی ہے، اسی طرح اللہ کے یہاں سے جو دین آیا ہے اس سے بھی لوگ جب الگ ہوتے ہیں تو ایک انچ کی فاصلہ سے الگ ہوتے ہیں، ذرا سا الگ ہوتے ہیں، بہت دنوں تک ان کو پتا ہی نہیں چلتا کہ وہ دوسرے راستہ پر پڑ گئے، پھر اتنا دور نکل جاتے ہیں کہ دین حق سے ان کا کوئی تعلق باقی نہیں رہتا، تب ان پر اللہ کا غصہ بھڑکتا ہے، اور کچھ لوگ ابھی اتنے دور نہیں چلے گئے، مگر وہ بھی صحیح راستہ سے نکل گئے، اللہ کے راستہ پر نہیں رہے، ان دونوں کا راستہ ہمیں نہیں چاہئے، ہمیں تو انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین کا راستہ چاہئے جن پر آپ نے انعام فرمایا ہے۔

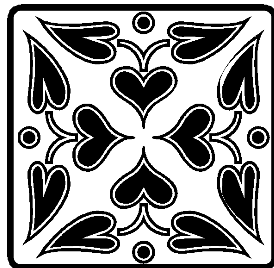
اب آخر میں ایک خاص مضمون سمجھ لینا چاہئے، حدیث میں مغضوب علیہم کی تفسیر یہود

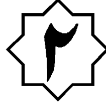
سے آئی ہے اور ضالین کی نصاریٰ سے، اس کی وجہ یہ ہے کہ نزول قرآن کے وقت اس امت میں اس کی مثالیں نہیں تھیں، اس لئے گفتہ آید در حدیث دیگراں کے اصول کے مطابق نبی ﷺ نے یہ مثالیں دی ہیں، مگر آگے چل کر امت میں افتراق ہوا، امت کے تہتّر فرقے بنے، جن میں سے اہل حق کی ایک جماعت رہی، باقی بہتّر فرقے گمراہ قرار پائے تو اب **مغضوب علیھم** اور ضالین کی مثالیں اس امت میں سے تلاش کی جاسکتی ہیں، جو فرقے اختلاف میں اتنے دور نکل گئے ہیں کہ مفتیانِ کرام نے بالاتفاق ان کے دائرۂ اسلام سے خارج ہونے کا فتویٰ دیا ہے: وہ فرقے **مغضوب علیھم** کی مثالیں ہیں، اور جن کے کفر کا فتویٰ نہیں یا بالاجماع ان کو کافر قرار نہیں دیا گیا وہ ضالین کا مصداق ہیں۔

اور ہماری دعا کا حاصل یہ ہے کہ الٰہی! ہمیں گمراہ فرقوں میں شامل نہ فرما، ان کے سائے سے بھی بچا، ہمیں اہل السنۃ والجماعۃ کے راستہ پر مضبوط رکھ، اس سے ہٹنے نہ دے۔

یہی دوسرا عقیدۂ رسالت ہے، نبی کریم ﷺ نے اپنے اور اپنے صحابہ کے راستہ کو فرقۂ ناجیہ کا راستہ بتلایا ہے، وہی راستہ اہل السنۃ والجماعۃ نے اپنایا ہے، بھائیو! اِسی راستہ سے چپکے رہو، اِدھر اُدھر نہ بھٹکو، لوگوں کی باتوں میں مت آؤ، بہت دوست نما دشمن ہوتے ہیں، بھیڑئے انسانوں کی شکل میں ہوتے ہیں، ان کی چکنی چپڑی باتوں میں نہ آؤ، اللہ تعالیٰ ہم سب کی حفاظت فرمائیں، اور ہمیں صراط مستقیم پر گامزن رکھیں (آمین یارب العالمین)

وآخر دعوانا أن الحمد للہ رب العالمین.





سورۃ الاخلاص کی تفسیر

خطبہ مسنونہ کے بعد: ﴿قُلْ هُوَ اللّٰهُ أَحَدٌ۝ اللّٰهُ الصَّمَدُ۝ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ۝ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا أَحَدٌ۝﴾

بزرگو اور بھائیو! یہ قرآن کریم کی وہ سورت ہے جو شاید ہی کوئی کم نصیب مسلمان ایسا ہوگا جسے یہ یاد نہ ہو، چھوٹی سی سورت ہے اور اہم اتنی ہے کہ نہایت اعلیٰ درجہ کی صحیح حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ سورہ اخلاص تہائی قرآن کے برابر ہے۔ اس حدیث سے آپ اس سورت کی اہمیت کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔

قرآن میں چھوٹی سورتیں تین کیوں ہیں؟

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں تین بہت ہی چھوٹی سورتیں نازل کی ہیں جن کو ایک سانس میں بے تکلف پڑھا جا سکتا ہے، ایک: سورہ اخلاص، دوسری: سورۂ کوثر، تیسری: سورۃ العصر، سوال یہ ہے کہ تین ہی چھوٹی سورتیں کیوں اتاری گئی ہیں، دو یا چار چھوٹی سورتیں کیوں نہیں اتاریں؟ اس کی دو وجہ ہیں، ایک وجہ صرف ہنسنے کی ہے اور ایک وجہ حقیقی ہے۔

ہنسنے کی وجہ تو یہ ہے کہ ہر فرض نماز کی دو رکعتوں میں قراءت فرض ہے، تیسری اور چوتھی خالی ہیں، اور نفل کی ہر رکعت میں قراءت فرض ہے، اگر آپ نفل کی چار رکعتیں ایک سلام سے پڑھیں تو ہر رکعت میں قراءت کریں کیونکہ نفل کی ہر دو رکعت الگ نماز ہے، اور نماز در اصل ایک رکعت ہے دوسری رکعت میں تو وہی ہوتا ہے جو پہلی رکعت میں ہوتا ہے اور دو رکعتوں کو عربی میں شفعہ (جوڑی) کہتے ہیں۔

دو رکعتوں سے کم نفل پڑھنا جائز کیوں نہیں؟

دو رکعتوں سے کم نفل پڑھنا جائز نہیں، کیوں جائز نہیں؟ آپ اپنے احوال پر غور کریں،

تکبیر تحریمہ سے لے کر سلام تک پوری توجہ اللہ کی طرف رہے ذرا بھی ادھر ادھر نہ ہو، یہ بہت مشکل کام ہے، اور اگر کوئی ذہن کو حاضر کرنے کی کوشش کرے کہ نماز میں کوئی خیال نہیں لانا چاہئے تو یہ بھی ایک خیال ہے یہی شروع ہو جائے گا، اللہ کے لئے کما حقہ نماز پڑھنا ممکن نہیں، پس اس کی تلافی کیسے کی جائے؟ ایک آدمی ٹماٹر لینے گیا، ایک کلو لئے، دوکاندار نے تول کر تھیلے میں ڈالے، اب وہ ٹماٹر دیکھتا ہے اور کہتا ہے: ارے بھئی اس میں داغ ہے، اس میں یہ ہے، اور یہ ایسا ہے۔ دوکاندار دو تین ٹماٹر اس کو اور دیتا ہے اور کہتا ہے: لے بھئی! اب جا، یعنی وہ جو ٹماٹروں میں کمی تھی زائد ٹماٹر دے کر اس کو پورا کر دیا۔ کمی پوری کرنے کا یہ بھی ایک طریقہ ہے، اس لئے شریعت نے ایک رکعت نماز ہی نہیں رکھی، جب بھی نماز پڑھنی ہو دو رکعتیں پڑھو تا کہ دونوں مل کر ایک کامل نماز بن جائیں، دو رکعت سے کم نماز نہ پڑھنے کی یہ حکمت ہے۔

اور یہ وجہ حدیث میں آئی ہے، نبی پاک ﷺ نے دم کٹی نماز پڑھنے سے منع کیا، یعنی صرف ایک رکعت پڑھنے سے منع کیا، جانور کی دم کٹ جائے تو جانور ناقص ہو جاتا ہے، ایسے ہی دم کٹی نماز بھی ناقص ہوتی ہے، اس حدیث میں دو اشارے ہیں: ایک اشارہ تو یہ ہے کہ صرف ایک رکعت بھی نماز ہے، دوسرا یہ کہ وہ ناقص ہے، اس لئے شریعت نے ایک رکعت نماز پڑھنے سے منع کیا، کم از کم دو پڑھنی چاہئیں تا کہ ایک کی خوبی سے دوسری کی کمی پوری ہو جائے۔

الغرض نفلیں چاہے آپ چار ایک سلام سے پڑھیں، یا چھ یا آٹھ پڑھیں ہر دو رکعت الگ نماز ہے، البتہ وتر ایک ایسی نماز ہے جس میں تین رکعتیں ہیں اور ہر رکعت میں قراءت ضروری ہے، پس اگر کوئی شخص کاہل ہے، سست ہے یا ایمرجنسی ہے اور آدمی جلدی نماز پڑھ کر فارغ ہونا چاہتا ہے تو اللہ نے چھوٹی تین سورتیں نازل کی ہیں کہ لے جلدی پڑھ لے۔ اس سے آگے چار رکعتوں میں چونکہ قراءت نہیں کیونکہ ہر دو رکعت الگ نماز ہے، صرف وتر ایک ایسی نماز ہے جس کی تینوں رکعتوں میں قراءت ہے، اس لئے تین چھوٹی چھوٹی سورتیں نازل کیں تا کہ ایمرجنسی میں کوئی جلدی نماز پڑھنا چاہے تو پڑھ سکے۔ یہ وہ وجہ ہے جو ہنسنے کی ہے۔

صحیح وجہ یہ ہے کہ تین عوامل ہیں، اللہ ہمارے خالق و مالک ہیں، ہم ان کے بندے ہیں،

جب ہم ان کے بندے ہیں تو ان کی بندگی کرنا ہماری ذمہ داری ہے، ہم ان کی بندگی کیسے کریں؟ یہ چیز سکھانے کے لئے اللہ نے اپنا دین رسولوں کے واسطہ سے ہمارے پاس بھیجا کہ دیکھو بندگی اس طرح کرنی ہے، تو دو باتیں ہوئیں، ایک: اللہ نے رسولوں کے واسطہ سے اپنا دین بھیجا، اور دوسرے: ہم انسانوں کی طرف بھیجا، تو عوامل تین ہو گئے: اللہ، رسول اللہ اور انسان، پس سورتیں بھی اللہ نے تین نازل کیں، ان تین سورتوں میں انہی تین عوامل کا تعارف ہے، سورہ اخلاص میں اللہ کا پورا تعارف ہے، سورہ کوثر میں نبی پاک ﷺ کے احوال کا ذکر ہے اور سورہ عصر میں انسانوں کے لئے اصلاح کا پروگرام ہے، انسان اپنے آپ کو سنوارنا چاہیں تو کیا فارمولہ ہے؟ یہ فارمولہ سورہ عصر میں بیان کیا گیا ہے۔ اس لئے یہ تین چھوٹی سورتیں ہیں، لمبی سورت ہو تو ہوسکتا ہے ہر انسان یاد نہ کر سکے، چھوٹی چھوٹی سورتیں نازل کیں تا کہ ہر مرد اور عورت، شہری اور دیہاتی، بچہ اور بوڑھا ان کو یاد کر سکے اور سمجھ سکے۔

حضرت امام شافعی رحمہ اللہ کا مقولہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ پورا قرآن نازل نہ فرماتے، صرف والعصر نازل فرماتے تو قیامت تک انسانوں کی اصلاح کے لئے یہ سورت کافی تھی۔ یہ کسی معمولی آدمی کا قول نہیں حضرت امام شافعی رحمہ اللہ کا ارشاد ہے، اس سے والعصر کی اہمیت سمجھو، اور سورہ اخلاص کی اہمیت تو نبی پاک ﷺ نے بیان کی ہے کہ قُلْ هُوَ اللّٰهُ تہائی قرآن کے برابر ہے۔ یہ چھوٹی تین سورتوں کے نازل کرنے کی حقیقی وجہ ہے۔

سورۂ اخلاص تہائی قرآن کے برابر ہے

عام طور پر اس حدیث کا یہ مطلب بیان کیا جاتا ہے کہ تہائی قرآن پڑھنے کا جتنا ثواب ہے اتنا ثواب ایک بار قل ھو اللہ پڑھنے کا ہے، پس اگر کوئی تین مرتبہ قل ھو اللہ پڑھے تو ایک قرآن پڑھنے کا ثواب مل جائے گا، عام طور پر حدیث کا یہی مطلب بیان کیا جاتا ہے، آپ حضرات نے بھی یہی سن رکھا ہوگا۔

لیکن اس حدیث کا ایک دوسرا مطلب بھی ہے اور وہی زیادہ فٹ ہے۔ وہ مطلب یہ ہے کہ دین دو چیزوں کے مجموعہ کا نام ہے: عقائد اور اعمال کا، اور عقیدوں میں بنیادی عقیدے

تین ہیں: (۱) توحید، یعنی اللہ ایک ہیں (۲) رسالت محمدی یعنی آخری نبی ہمارے آقا حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ ہیں (۳) معاد یعنی آخرت، دنیا میں رہنے والے ہر انسان کی زندگی ختم ہونے والی ہے، اور خود دنیا کی زندگی بھی ایک دن ختم ہونے والی ہے، الیوم الآخر میں تمام روحوں کو عالم برزخ سے اپنے اپنے اجسام میں واپس آنا ہے، تو آپ اس آخری دن کو معاد (واپس آنا) بھی کہہ سکتے ہیں اور آخرت بھی، یہ تین بنیادی عقیدے ہیں اور دین انہی تین عقیدوں کا نام ہے، اور انہی تین عقیدوں کو پورے قرآن کریم میں طرح طرح سے بیان کیا گیا ہے، ان تین عقیدوں میں سے توحید کا مکمل بیان قُل ھو اللہ میں ہے، پس گویا ایک تہائی مضمون قل ھو اللہ میں آ گیا، اس لئے قل ھو اللہ کو تہائی قرآن کے برابر کہا گیا۔

یہ حدیث شریف کا دوسرا مطلب بیان کیا گیا ہے اور پہلے والا بھی بیان کیا گیا ہے، اور دوسرا مطلب زیادہ راجح اور بہتر ہے، کیونکہ صحیح حدیث میں سورہ زلزال ﴿إِذَا زُلْزِلَتِ الْأَرْضُ﴾ کے بارے میں آیا ہے کہ وہ سورت آدھے قرآن کے برابر ہے، یہاں کسی نے یہ مطلب بیان نہیں کیا کہ ایک مرتبہ اذا زلزلت الارض پڑھو تو آدھے قرآن کا ثواب ملے گا، دو مرتبہ پڑھو تو سارا قرآن پڑھنے کا ثواب ملے گا۔ سب نے یہ مطلب بیان کیا ہے کہ زندگیاں دو ہیں، اس دنیا کی زندگی اور آخرت کی زندگی اذا زلزلت میں آخرت کا بیان ہے اور پورا قرآن کریم اس دنیا کی زندگی سے بحث کرتا ہے اور یہ سورت مکمل طور سے آخرت کی زندگی سے بحث کرتی ہے، اس لئے آدھا قرآن ہے۔

اسی طرح ایک دوسری حدیث شریف ہے کہ ﴿قُلْ يٰأَيُّهَا الْكَافِرُوْنَ﴾ چوتھائی قرآن کے برابر ہے، اس کا بھی کسی نے یہ مطلب بیان نہیں کیا کہ چار مرتبہ ﴿قُلْ يٰأَيُّهَا الْكَافِرُوْنَ﴾ پڑھو تو ایک قرآن پڑھنے کا ثواب مل جائے گا، سب نے یہ مطلب بیان کیا ہے کہ دین کے بنیادی عقیدے تین ہیں، توحید، رسالت محمدی اور معاد اور چوتھا: عمل ہے، میں نے کہا تھا کہ دین عقائد اور اعمال کا مجموعہ ہے پس اعمال ایک، اور عقائد میں بنیادی عقائد تین، تو کل چار ہوئے، اور ﴿قُلْ يٰأَيُّهَا الْكَافِرُوْنَ﴾ میں اخلاص فی العبادت کا بیان ہے کہ بندگی کرو تو صرف اللہ کی کرو، کسی اور کو حصہ دار مت بناؤ، پس ﴿قُلْ يٰأَيُّهَا الْكَافِرُوْنَ﴾ چوتھائی قرآن

کے برابر ہوا۔اسی شاکلہ اور انداز پر﴿قُلْ هُوَ اللّٰهُ أَحَدٌ﴾ کا بھی یہی مطلب بیان کرنا چاہئے کہ بنیادی عقیدے تین ہیں اور ان میں سے ایک کا مکمل بیان قل ھو اللہ میں ہے پس قل ھو اللہ تہائی قرآن کے برابر ہوا۔

الغرض جب اس میں بنیادی تین عقیدوں میں سے ایک عقیدہ کا بیان ہے تو اس کی اہمیت واضح ہے، جیسے والعصر کی اہمیت امام شافعی کے قول سے واضح ہے، لہٰذا آج مختصر وقت میں اس سورت کو سمجھ لینا چاہئے۔

سورہ اخلاص کا شان نزول

اس سورت کے شان نزول میں ایک روایت ہے، مشرکین مکہ نے نبی پاک ﷺ سے ایک مرتبہ کہا:أنسب لنا ربك: آپ ہمارے لئے اپنے پروردگار کا نسب بیان کیجئے کہ آپ کا پروردگار کون ہے؟ ان کے والد کون ہیں، ان کی اولاد کون ہے؟ مشرکین اپنے خداؤں کے لئے لفظ رب استعمال کرتے تھے، قرآن میں ہے:﴿ءَ أَرْبَابٌ مُتفرِّقُوْنَ خَيْرٌ أَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ﴾: یوسف علیہ السلام نے کہا: کیا یہ جو تم نے بہت سارے خدامان رکھے ہیں یہ بہتر ہیں یا اللہ، جو واحد و قہار ہے؟ معلوم ہوا کہ مشرکین اپنے خداؤں کے لئے لفظ رب استعمال کرتے تھے، اور عیسائی تو آج بھی لفظ رب استعمال کرتے ہیں، رب تو عربی لفظ ہے وہ اس کی جگہ لارڈ استعمال کرتے ہیں، حضرت عیسی علیہ السلام کے لئے لفظ لارڈ استعمال کرتے ہیں، ان سے نیچے اور لوگوں کے لئے بھی یہ لفظ استعمال کرتے ہیں۔اسی طرح مشرکین اللہ کے علاوہ دیگر معبودوں کے لئے لفظ رب استعمال کرتے تھے، قرآن کریم میں ہے کہ جب حضرت موسی و ہارون علیہما السلام دعوت لے کر فرعون کے پاس پہنچے اور رب پر ایمان لانے کی دعوت دی تو فرعون نے پوچھا:﴿مَنْ رَبُّكُمَا يَا مُوْسٰى﴾: تم دونوں کا رب جس کی جانب تم مجھے بلا رہے ہو کون ہے؟ کیونکہ فرعون خود اپنے آپ کو رب کہلاتا تھا:﴿أَنَا رَبُّكُمُ الْأَعْلٰى﴾: تمہارا سب سے بڑا رب میں ہوں، میرے علاوہ اور بھی رب ہیں، چھوٹی چھوٹی مورتیاں ہیں مگر ان سب مورتیوں کا لیڈر میں ہوں۔ان آیات سے معلوم ہوا کہ مشرکین بھی اپنے گھڑے ہوئے معبودوں کے لئے لفظ رب استعمال کرتے تھے، پس جب قرآن کریم کی

پہلی آیت نازل ہوئی: ﴿اِقْرَأْ بِسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ﴾ تو قرآن نے بھی لفظ رب استعمال کیا، اس لئے قدرتی طور پر سوال پیدا ہوا کہ ہمارے جو ارباب ہیں ان کو تو ہم جانتے ہیں، تم جس رب پر ہمیں ایمان لانے کے لئے کہہ رہے ہو ذرا اس کا تعارف کراؤ، ہمارے یہ یہ رب ہیں، یہ یہ ان کے باپ ہیں، یہ یہ ان کی اولاد ہے، اب تم ہمیں کسی اور رب کی طرف بلا رہے ہو تو ذرا اس کا تعارف کراؤ کہ وہ کون ہے؟ اس کے والد کون ہیں؟ اس کی اولاد کون ہے؟ یہ سوال تھا اور اس کے پیدا ہونے کی یہ وجہ تھی، چنانچہ قرآن کی یہ سورت نازل ہوئی اور جواب دیا: ﴿قُلْ هُوَ اللّٰه﴾: کہو: وہ اللہ ہے، یعنی قرآن نے جس رب کی طرف بلایا ہے اس کا ذاتی نام اللہ ہے۔ اور اللہ کو مشرکین جانتے تھے، وہ اپنی مورتیوں کے لئے لفظ اللہ استعمال نہیں کرتے تھے، کلمہ اللہ کو اللہ ہی کے لئے استعمال کرتے تھے، جیسے ہمارے ہندوستان کے ہندو ایشور اور پرمیشور اللہ ہی کے لئے استعمال کرتے ہیں، وہ اپنی مورتیوں میں سے کسی کو ایشور (خالق) نہیں کہتے، پرمیشور (مخلوق سے محبت کرنے والا) نہیں کہتے۔ اسی طرح یہودیوں کے یہاں اللہ کے لئے اصل نام یہووا ہے، یہودیوں میں ایک فرقہ ہے جو یہوواوٹنیس کہلاتا ہے جس کے معنی ہیں شہادۃ اللہ۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں ان کے عقائد اسلام سے قریب قریب ہیں، پس جیسے اِن کے یہاں یہووا لفظ ہے، اور اُن کے یہاں ایشور لفظ ہے، عربی میں اللہ کا اصل نام: اللہ ہے، اور اس لفظ کو مشرکین جانتے تھے اور استعمال بھی کرتے تھے، ان کے اشعار اور خطبے موجود ہیں جن میں انہوں نے اللہ کے لئے لفظ اللہ استعمال کیا ہے، پس ان کو بتلایا کہ: ھو: وہ، جن کے بارے میں تم پوچھ رہے ہو ان کا اصل نام اللہ ہے، اور اللہ کی دو صفتیں ہیں: ایک ہے: أحد: یگانہ، تنہا، یہ اللہ کی پہلی صفت ہے وہ تنہا ہیں، یگانہ ہیں، بے ہمہ ہیں ان کے ساتھ اور کوئی نہیں۔

جوڑے کا مطلب نر اور مادہ نہیں

قرآن کریم میں یہ مضمون کئی جگہ آیا ہے کہ اللہ نے کائنات کی ہر چیز جوڑا جوڑا بنائی ہے، اکیلی ذات صرف اللہ کی ہے، اللہ کے علاوہ اکیلا کوئی نہیں، سب چیزیں جوڑا جوڑا ہیں، مگر لفظ جوڑا سن کر ہمارے ذہن میں مذکر و مونث اور نر مادہ کا تصور ابھرتا ہے، جوڑے کا یہ مطلب

نہیں، جوڑا ایسی دو چیزوں کو کہتے ہیں جو مل کر کسی مقصد کو پورا کریں پھر وہ دو چیزیں اگر اتفاق سے نر مادہ ہوں تو کوئی فرق نہیں پڑتا، باقی جوڑے کے لئے نر مادہ ہونا ضروری نہیں، جیسے دو چپل جوڑا ہیں کیونکہ دو چپل مل کر ایک مقصد کو پورا کرتے ہیں، تو اللہ نے ہر چیز کو جوڑا جوڑا پیدا کیا ہے، قرآن کریم میں ہے: ﴿وَالسَّمَآءَ بَنَيْنَاهَا بِأَيْدٍ وَإِنَّا لَمُوْسِعُوْنَ﴾: قسم ہے آسمان کی جس کو ہم نے لمبا چوڑا بنایا ہے۔ ﴿وَالْأَرْضَ فَرَشْنَاهَا فَنِعْمَ الْمٰهِدُوْنَ﴾: اور زمین کو دیکھو جس کو ہم نے بچھایا پس کتنا شاندار بچھایا۔ ﴿وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ﴾: اور ہم نے ہر چیز جوڑا جوڑا بنائی، کیوں بنائی؟ ﴿لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ﴾ تا کہ تم ایک بات یاد کرو، وہ بات کیا ہے؟ یہ دنیا جس میں ہم رہتے ہیں اس کا بھی ایک جوڑا ہے، جب اللہ نے ہر چیز جوڑا جوڑا بنائی ہے تو یہ دنیا اکیلی کیسے ہوسکتی ہے؟ یہ دنیا اکیلی مقصد کی تکمیل کیسے کرسکتی ہے؟ اس دنیا کے ساتھ دوسری دنیا آخرت ہے اور یہ دنیا اور وہ دنیا جوڑا ہیں اور دونوں مل کر مقصد کی تکمیل کرتے ہیں، وہ مقصد کیا ہے؟ مقصد یہ ہے کہ اچھا کرو جزائے خیر پاؤ، برا کرو پاداش عمل سے دوچار ہوؤ، یہ مقصد جب دو دنیا ہونگی تبھی پورا ہوگا۔

دنیا و آخرت مل کر مقصد کی تکمیل کرتے ہیں

ہم اس دنیا میں دیکھتے ہیں کہ اچھائیاں کرنے والے اور برائیاں کرنے والے برابر ہیں، اچھائیاں کرنے والے اگر دولت مند اور صحت مند ہیں تو برائیاں کرنے والے بھی دولت مند اور صحت مند ہیں، اور اگر برائیاں کرنے والے اندھے لولے اور معذور ہیں تو اچھائیاں کرنے والے بھی اندھے لولے اور معذور ہیں، ہمیں اس دنیا میں کوئی فرق نظر نہیں آتا پس کیا اللہ کی یہ کائنات اندھیر نگری ہے؟ نہیں، اللہ تعالی اپنے معاملات میں نہایت حکیم ہیں، پھر اچھائیاں کرنے والوں کو اچھا بدلہ اور برائیاں کرنے والوں کو سزا کب ملے گی؟ اس کے لئے آخرت ہے، آخرت میں دودھ الگ کردیا جائے گا اور پانی الگ، نیکیاں کرنے والوں کو تاابد جزائے خیر ملے گی اور برائیاں کرنے والوں کو سزا ملے گی، پس اس دنیا میں عمل کرنا ہے، اور وہاں ثمرہ اور پھل کھانا ہے دونوں دنیا مل کر مقصد زندگی کی تکمیل کرتے ہیں، صرف اس دنیا سے مقصد کی تکمیل نہیں ہوتی۔

دیکھو ہم کھیت میں گیہوں بوتے ہیں، گیہوں اُگے، بڑھے اور بڑھے، تیار ہوئے، تیار ہونے کے بعد ہم کھیت میں چاروں طرف گھومتے ہیں تو کہیں گیہوں کا ایک دانہ نظر نہیں آتا، گھاس ہی گھاس نظر آتی ہے بھوس ہی بھوس نظر آتا ہے، پس اگر یہ کھیت ہی کھیت رہے تو ہمارے اناج بونے کا فائدہ کیا؟ ایک دن آئے گا کہ پورا کھیت کٹ جائے گا، کھیت خالی ہو جائے گا، اور یہ سارا اناج کھلیان میں پہنچے گا، اس پر بیل گھومیں گے، اناج گاہا جائے گا پھر ہوا میں برسایا جائے گا تو گیہوں الگ ہو جائیں گے اور بھوسا الگ، ہمارے کھیت بونے کا ثمرہ اب ظاہر ہوا۔

میرے بھائیو! دنیا بھی اسی طرح ایک کھیت ہے، یہ کھیت ایک دن سارا کٹ جائے گا اور سارا اناج (انسان) کھلیان (میدان محشر) میں پہنچے گا، اور وہاں گاہنے کے بعد برسایا جائے گا اناج (جنتی) ایک طرف ہو جائے گا اور بھوسا (جہنمی) ایک طرف، اناج کوکوٹھری (جنت) میں بھرا جائے گا، اور بھوسے کو یا تو آگ لگا کر جلا دیں گے جیسا کہ آپ کے یہاں ہوتا ہے کیونکہ یہاں لوگوں کے پاس جانور نہیں، یا بیل بھینسوں کو کھلا دیں گے جیسا ہمارے یہاں ہوتا ہے، بہر حال دونوں الگ الگ کر دئے جاتے ہیں، یہی اس دنیا کا حال ہے کہ اس میں جو اچھے اور برے رلے ملے ہیں ان کو ایک دن الگ الگ کر دیا جائے گا۔

پس اللہ نے فرمایا: یہ دنیا اور دوسری دنیا دونوں مل کر جوڑا ہیں یہ بات تم یاد کرو اس لئے ہم نے کائنات کی ہر چیز جوڑا جوڑا بنائی ہے، اکیلے صرف اللہ ہیں ان کے علاوہ کوئی اکیلا نہیں سورہ یس میں ہے: ﴿سُبْحٰنَ الَّذِیْ خَلَقَ الْأَزْوَاجَ كُلَّهَا مِمَّا تُنْبِتُ الْأَرْضُ وَمِنْ أَنْفُسِهِمْ وَمِمَّا لَايَعْلَمُوْنَ﴾: پاک ہے وہ ذات، کس بات سے پاک ہے؟ جوڑا ہونے سے پاک ہے وہ ذات جس نے ہر چیز کو جوڑا جوڑا بنایا، زمین میں سے جتنی چیزیں اگتی ہیں ان میں بھی جوڑا ہے، انسانوں میں بھی جوڑا ہے اور جن مخلوقات کو لوگ نہیں جانتے ان کو بھی اللہ نے جوڑا جوڑا بنایا ہے۔

اور بنیادی بات یہ جاننی چاہئے کہ جوڑے کا مطلب مذکر ومونث نہیں ہیں، بلکہ دو چیزیں مل کر کسی ایک مقصد کی تکمیل کریں تو وہ جوڑا ہے۔ غرض اللہ کی پہلی صفت یہ بتائی کہ وہ

تنہا ہیں، اکیلے ہیں، ان کا جوڑا ممکن ہی نہیں، ورنہ وہ آدھے خدا ہونگے، جب دو خدا مل کر ایک مقصد کی تکمیل کریں گے تو وہ اکیلے باکمال خدا کہاں ہوئے؟

چنانچہ دوسری صفت ہے: ﴿اللّٰهُ الصَّمَدُ﴾: اللہ بے نیاز ہیں، یعنی کسی چیز کے محتاج نہیں، وہ باہمہ ہیں، وہ باکمال ہیں کسی کمال کی ان میں کمی نہیں، مشرکین نے جو شرک شروع کیا تو ان کی دلیل یہ تھی کہ ایک شخص بڑا کارخانہ اکیلا نہیں چلا سکتا مختلف شعبوں کے لئے منیجر مقرر کرنے پڑتے ہیں، ایک بادشاہ پورا ملک اکیلا نہیں چلا سکتا، وزارتیں قائم کرنی پڑتی ہیں تو اتنا بڑا جگت اللہ اکیلے کیسے چلا سکتے ہیں؟ اللہ نے بھی ہوا کا خدا الگ، دولت کا خدا الگ، بارش کا خدا الگ تجویز کیا ہے، یہ اللہ کو ان لوگوں نے ناقص اور محتاج مان لیا، یہ جو کارخانہ کا مالک ہے اکیلا اپنا کارخانہ نہیں چلا سکتا، یہ جو ملک کا بادشاہ ہے وہ اپنا ملک اکیلا نہیں چلا سکتا کیونکہ یہ دونوں کمزور ہیں پس کیا اللہ تعالیٰ بھی کمزور ہیں؟ وہ تو بے نیاز ہیں ان میں کوئی کمی نہیں، قرآن کریم میں سات جگہ یہ مضمون آیا ہے کہ اللہ نے آسمان وزمین اور ان کے درمیان کی چیزیں چھ دنوں میں پیدا کیں: ﴿ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ يُدَبِّرُ الْأَمْرَ﴾: پھر اللہ تعالیٰ بذات خود عرش نشیں ہوئے اور انہوں نے معاملہ کا انتظام اپنے ہاتھ میں لیا، یعنی کائنات کا انتظام اللہ نے کسی کو نہیں سونپا۔

غرض: اللہ کی یہ دوسری صفت آئی کہ اللہ صمد ہیں، بے نیاز ہیں، باکمال ہیں ان کا کوئی کمال منتظر نہیں جو آگے اللہ کو حاصل ہو، کوئی کمی اللہ کے قریب بھی نہیں پھٹک سکتی۔

اور عربوں میں تعارف کا ایک طریقہ ہے، کسی سے پوچھیں گے: تمہارا فلاں دوست کون ہے؟ وہ کہے گا: ابوفلان، فلاں کا ابا ہے، یہ عربی میں کنیت ہے جس کو وہ آج بھی استعمال کرتے ہیں، پھر دوسرے درجہ کی کنیت ہے: ابن فلان: فلاں کا بیٹا ہے، جیسے حضور ﷺ کی کنیت ابوالقاسم تھی اور عبداللہ بن عمر کی کنیت ابن عمر تھی۔ یہ دو کنیتیں عربوں میں چلتی ہیں اور زیادہ ابوفلان چلتی ہے، لہٰذا اللہ کا تعارف کراؤ کہ وہ کس کے ابا ہیں، اور کس کے بیٹے ہیں، قرآن نے کہا: ﴿لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ﴾: اللہ نے کسی کو جنا نہیں، جب کسی کو جنا نہیں تو ابوفلان کیسے ہونگے؟ ﴿وَلَمْ يُوْلَدْ﴾ اور وہ جنے نہیں گئے، جب جنے نہیں گئے تو ابن فلان کہاں

سے ہوں گے؟ وہ ابوفلان اور ابن فلان نہیں ہوسکتے؟ اس لئے کہ وہ احد ہیں اور صمد ہیں، اکیلے ہیں اور بے نیاز ہیں، اگر اللہ نے کسی کو جنا ہوتا تو وہ بیٹا بھی اللہ ہوتا تو اللہ احد کہاں رہے، دو اللہ ہوگئے۔ اور باپ بیٹوں کا محتاج ہوتا ہے تاکہ وہ بوڑھاپے میں سہارا بنیں۔

علاوہ ازیں ہر ایک کو اولاد چاہئے تو یہ چاہئے بھی ایک احتیاج ہے، اللہ میں ایسی کمی نہیں ہوسکتی، اور اگر اللہ کے ابا اور امی ہوتے تو ابا اور امی بھی خدا ہوتے، کیونکہ اولاد ہم جنس ہوتی ہے، انسان کے گھر میں بلی پیدا ہوجائے تو کیسا معلوم ہوگا؟ اور جب ایک انسان جنا گیا ہے تو اس کے ابا اور امی کو بھی انسان ماننا پڑے گا، تو جب اللہ اللہ ہیں تو ان کے ابا اور امی کو بھی اللہ ماننا پڑے گا، پس اللہ احد کہاں رہے؟ اور وہ صمد کہاں رہے؟

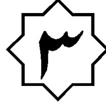
آگے چلو اور باپ ہونے کے اعتبار سے اور بیٹا ہونے کے اعتبار سے ہم سری اور برابری نہیں تو کسی اور اعتبار سے ہوگی؟ فرمایا: ﴿وَلَمْ يَكُنْ لَّهُ كُفُوًا أَحَدٌ﴾: اور نہیں ہے اللہ کے لئے کوئی ہم سر، کسی اعتبار سے بھی اللہ کا کوئی ہم سر نہیں، جب ان کے برابر کوئی نہیں تو معبود ان کے علاوہ دوسرا کیسے ہوسکتا ہے؟

یہ اس سورت پاک میں اللہ کا تعارف کرایا گیا ہے، اور اس میں سے سبق یہ نکلتا ہے کہ اللہ ہی اکیلے ہیں اور بے نیاز ہیں، پس ان کے ساتھ کسی کو پکارنے کا کوئی سوال نہیں، چاہے پکارنے کی نوعیت کچھ بھی ہو، مشرکوں میں جو نوعیت ہے وہ ہو، یا مسلمانوں میں جو نوعیت ہے وہ ہو کہ اللہ کے علاوہ کی منت مان رہا ہے، اللہ کے علاوہ کو اپنی عبادت دکھا رہا ہے، دکھاوا بھی شرک ہے اگرچہ نہایت نیچے درجہ کا شرک ہے اور اوپر کے درجہ کا شرک یہ ہے کہ دو یا تین یا ہزار خدا مان لئے جائیں، تو اوپر سے نیچے تک یہ سب صورتیں شرک کی ہیں، اس لئے صرف ایک اللہ سے لو لگاؤ، کسی اور کی طرف کوئی دھیان مت دو، یہی توحید ہے، مجاہد آزادی مولانا محمد علی جوہر کا ایک شعر ہے:

توحید تو یہ ہے کہ خدا خود حشر میں کہہ دے ❁ یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لئے تھا

میرے بھائیو! اسی کا نام توحید ہے اور یہی اس سورت کا مضمون ہے۔

وآخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمين



تراویح کی بیس رکعتیں سنت ہیں

خطبہ مسنونہ کے بعد: ﴿شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْ أُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْآنُ﴾وقال النبی صلی الله علیه وسلم:" من صام رمضان إیمانا واحتسابا غفرله ما تقدم من ذنبه. ومن قام رمضان إیمانا واحتسابًا غفرله ما تقدم من ذنبه"(متفق علیه) وقال أنس رضی الله عنه: فرض اللّٰه صیامَ رمضان وسَنَّ رسول الله صلی الله علیه وسلم قیامه.

بزرگواور بھائیو! یہ ماہ مبارک چل رہا ہے، اس مہینے کا قرآنِ کریم سے، اور قرآنِ کریم کا اس مہینے سے خاص تعلق ہے، اس مہینے میں قرآنِ کریم نازل ہوا ہے، ارشادِ پاک ہے: رمضان کا مہینہ ایسا مہینہ ہے جس میں قرآن اتارا گیا ہے، اس لئے قرآنِ کریم کا حق ادا کرنے کے لئے اس مہینے میں دو اعمال رکھے گئے ہیں: دن میں روزے، اور رات میں سونے سے پہلے نفلیں (تراویح) اور یہ دونوں اعمال چونکہ لمبے ہیں، پورا مہینہ پابندی سے کرنے ہوتے ہیں اس لئے دونوں کو آسان بنانے کے لئے بخاری و مسلم کی روایت میں ایک فارمولہ (آسان طریقہ) بیان کیا گیا ہے، ارشاد فرمایا: من صام رمضان إیمانا واحتساباً غفرله ما تقدم من ذنبه، ومن قام رمضان إیمانا واحتسابًا غفرله ما تقدم من ذنبه: یعنی جو شخص رمضان کے روزے رکھے اور رمضان کی راتوں میں سونے سے پہلے نفلیں پڑھے تو ہر ایک عمل کا ثواب یہ ہے کہ اس کے سابقہ گناہ معاف ہو جائیں گے۔

یہ جو ثواب بیان کیا گیا ہے اس کا یقین ہو اور اس ثواب کو پیش نظر رکھے تو دونوں کام آسان ہو جائیں گے، اس حدیث میں لفظ ایمان شرعی اصطلاح نہیں، بلکہ لغوی معنی میں ہے، یعنی ثواب کا یقین کرنا، اسی لئے عطف تفسیری کے طور پر احتساباً لائے ہیں، احتساب کے معنی ہیں ثواب کی امید رکھنا یعنی اس کو پیش نظر رکھنا۔

اور حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ نے رمضان کے روزے فرض کئے اور رسول اللہ ﷺ نے رمضان کی راتوں میں سونے سے پہلے نوافل مسنون کئے، اور اس کی وجہ یہ ہے کہ دن کے مزاج میں انقباض ہے اور رات کے مزاج میں انبساط ہے، اور روزہ چونکہ علاحدہ علاحدہ رکھنا ہے جو انقباض کے ساتھ بھی رکھا جاسکتا ہے۔ اور قرآنِ کریم رمضان میں پورا پڑھنا ہے، اور ہر ایک کو قرآنِ کریم حفظ نہیں ہوتا پس جو حافظ ہے وہ جہراً پڑھے گا اور دوسرے سنیں گے۔ اور پڑھنے اور سننے کے لئے طبیعت میں انبساط چاہئے، اس لئے تراویح رات میں رکھی گئی ہے۔

یہاں سے یہ بات سمجھ میں آگئی کہ تراویح رمضان کی زائد نماز ہے، اور صلاۃ اللیل یعنی تہجد جو پورے سال کی نماز ہے وہ انفرادی نماز ہے، کیونکہ رات کے آخر میں لوگوں کا اجتماع مشکل ہے، پس جو لوگ دونوں نمازوں کو ایک سمجھتے ہیں وہ غلط ہیں، بلکہ یہ دو نمازیں بالکل ایک دوسرے سے علاحدہ ہیں، ایک: صلوٰۃ اللیل یعنی تہجد کی نماز ہے، یہ نماز سال بھر پڑھی جاتی ہے، رمضان اور غیر رمضان ہر زمانہ میں پڑھی جاتی ہے، تہجد کے معنی ہیں: تَرك الهُجود: نیند چھوڑنا۔ چونکہ یہ نماز رات کے آخری حصہ میں پڑھی جاتی ہے، آدمی پہلے سوجاتا ہے پھر اٹھ کر اس نماز کو پڑھتا ہے اس لئے اس کا نام 'تہجد' ہے، دوسرا نام اس کا 'صلوۃ اللیل' ہے۔ دوسری: قیام رمضان یعنی تراویح ہے، یہ رمضان المبارک کی خصوصی نماز ہے، یہ نماز صرف رمضان المبارک میں پڑھی جاتی ہے باقی گیارہ مہینوں میں یہ نماز نہیں پڑھی جاتی۔

اور رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں نہ تو تراویح کی رکعتوں کی تعداد متعین تھی اور نہ یہ نماز با جماعت پڑھی جاتی تھی، صرف اس کی ترغیب دی جاتی تھی کہ یہ ایسی نماز ہے جو گذشتہ گناہوں کا کفارہ بنتی ہے۔ چنانچہ لوگ رمضان میں سونے سے پہلے اپنے طور پر یہ نماز پڑھتے تھے، اللہ جس کو جتنی توفیق دیتا وہ اتنی رکعتیں پڑھتا، پھر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں بھی یہی طریقہ رہا، اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے ابتدائی چھ سال سخت آزمائش کے تھے، مسلمان بیک وقت دو سپر پاور: ایران وروم کے ساتھ جنگوں میں مصروف تھے، جب یہ دونوں طاقتیں ٹوٹیں تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے دورِ خلافت

کے آخری سالوں میں ملک وملت کی تنظیم سے تعلق رکھنے والے بہت سے کام کئے ہیں ان میں سے ایک کام باقاعدہ جماعت کے ساتھ تراویح کا نظام بنانا بھی ہے۔ شروع میں امام تراویح کی آٹھ رکعتیں پڑھاتا تھا اور سحری کے وقت تک پڑھاتا تھا۔ موطا مالک میں روایت ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پہلے گیارہ رکعتیں (آٹھ تراویح اور تین وتر) پڑھانے کا حکم دیا جن سے لوگ فجر سے کچھ ہی دیر پہلے فارغ ہوتے تھے (موطا مالک ص: ۴۰) اس وقت یہ خیال تھا کہ یہ تہجد کی نماز ہے، پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے یہ بات آئی کہ رسول اللہ ﷺ نے جو دو یا تین راتیں جماعت کے ساتھ نماز پڑھائی ہے وہ بیس رکعتیں پڑھائی ہیں اور آنحضرت ﷺ تنہا بھی سونے سے پہلے بیس رکعتیں پڑھا کرتے تھے، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ رمضان المبارک میں بغیر جماعت کے بیس رکعتیں اور وتر پڑھتے تھے (بیہقی ۲:۴۹۶) اور علامہ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ نے **التلخیص الحبیر فی تخریج أحادیث الرافعی الکبیر** (۱:۱۹۹) میں یہ روایت لکھی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے دو دن جماعت سے جو نماز پڑھائی تھی وہ بیس رکعتیں پڑھائی تھیں، حافظ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اس روایت کی صحت پر تمام محدثین کا اتفاق ہے، (فتاوی رحیمیہ) چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے نظام بدل دیا اور دونوں اماموں: حضرت ابی بن کعب اور حضرت تمیم داری رضی اللہ عنہما کو حکم دیا کہ بیس رکعتیں پڑھائیں اور مختصر پڑھائیں اور لوگوں کو سونے کا موقع دیں، پھر آخری پہر لوگ اٹھ کر تہجد پڑھیں، بخاری شریف (حدیث ۲۰۱۰) میں ہے کہ اس نئے نظام کے شروع ہونے کے بعد ایک مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ مسجد نبوی میں تشریف لائے، لوگوں کو ایک امام کے پیچھے نماز پڑھتے دیکھا تو فرمایا: **نعم البدعة هذه**: یعنی لوگ جو اس نماز کو بدعت کہتے ہیں وہ صحیح نہیں، یہ تو شاندار نئی بات ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس نماز کو لوگوں کے خیال کے مطابق بدعت (نئی بات) کہا ہے اور نِعم سے اس کی تردید کی ہے، جب تراویح کا باقاعدہ نظام بنا تو لوگوں میں چہ می گوئیاں ہوئیں کہ یہ کیا نئی بات شروع ہوئی، جیسے حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے مسجدِ نبوی پختہ بنائی تو بعض لوگوں نے کہا: یہ تو کسری کا محل بن گیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بھی اس خیال کی تردید کی کہ یہ اگر

نئی چیز ہے تو نہایت شاندار نئی چیز ہے، کیونکہ اس کی اصل موجود ہے اور وہ آپؐ کا دو دن یا تین دن باجماعت نوافل پڑھانا ہے، آپؓ نے لفظ بدعت اس کے لغوی معنی میں استعمال کیا ہے اور بالفرض کلام کیا ہے۔ لغوی معنی کے اعتبار سے بدعت: بدعت حسنہ بھی ہوتی ہے اور بدعت سیئہ بھی، اور بدعتِ اصطلاحی صرف بدعت سیئہ ہوتی ہے، وہ حسنہ نہیں ہوتی۔

پھر دوسری بات آپؓ نے یہ فرمائی: والتی ینامون عنها أفضلُ من التی یقومون: جس نماز سے لوگ سوتے رہتے ہیں وہ اس نماز سے افضل ہے جس کو وہ پڑھتے ہیں، یعنی تراویح سے افضل تہجد ہے۔ لہٰذا لوگوں کو چاہئے کہ جس طرح تراویح اہتمام کے ساتھ پڑھتے ہیں تہجد کی نماز بھی پڑھیں، اس ارشاد سے یہ بات صاف ہوگئی کہ تراویح: تہجد کی نماز نہیں، بلکہ یہ دونوں الگ الگ نمازیں ہیں، ایک کا وقت سونے سے پہلے ہے اور دوسری کا سونے کے بعد، ایک کی بیس رکعتیں ہیں اور دوسری کی آٹھ، چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ سے آج تک امت شرقاً غرباً تراویح جماعت کے ساتھ بیس رکعتیں پڑھتی چلی آرہی ہے، صرف غیر مقلدین اس مسئلہ میں اختلاف کرتے ہیں، وہ کہتے ہیں: تراویح کی آٹھ رکعتیں ہیں۔ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث سے استدلال کرتے ہیں، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: رسول اللہ ﷺ رمضان اور غیر رمضان میں گیارہ رکعتوں سے زیادہ نہیں پڑھتے تھے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث جو بیہقی اور مصنف ابن ابی شیبہ (حدیث ۷۷۷۴ طبع محمد عوامہ) میں ہے اس کو ضعیف بتاتے ہیں۔ مگر غیر مقلدین کا یہ خیال صحیح نہیں اس لئے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی یہ حدیث قیام رمضان (تراویح) سے متعلق نہیں ہے، بلکہ قیام لیل (تہجد) سے متعلق ہے، رسول اللہ ﷺ یہ آٹھ رکعتیں سال بھر پڑھتے تھے، اور تراویح صرف رمضان میں پڑھی جاتی ہے۔

علاوہ ازیں بیس رکعت تراویح پر چاروں ائمہ، تمام صحابہ، تابعین اور تمام علماء کا اجماع ہے، اگر بالفرض حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی اس حدیث کو تراویح سے متعلق کیا جائے تو غیر مقلدین سے عرض ہے کہ آنحضور ﷺ اس نماز کو سال بھر پڑھتے تھے، آپ بھی سال بھر پڑھیں تو ہم جانیں کہ آپ 'اہل حدیث' ہیں، یہ کیا کہ میٹھا میٹھا ہپ ہپ، کڑوا کڑوا تھو تھو!

اور اگر وہ کہیں کہ نبی ﷺ نے صرف تین دن یا دو دن رمضان میں جماعت سے نماز پڑھی ہے اس لئے ہم اس پر عمل کرتے ہیں تو سنیں: اس حدیث پر عمل کرنا ہے تو تراویح جماعت کے ساتھ صرف دو دن یا تین دن پڑھو، پھر مسجدوں سے جاؤ تا کہ فتنہ ختم ہو، اور وہ بھی مہینہ کی آخری تاریخوں میں آؤ، تا کہ پورا رمضان مسجدوں میں سکون رہے۔

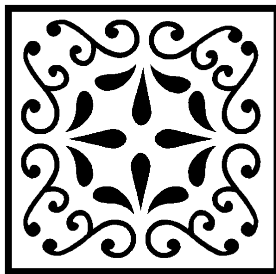
خلاصۂ کلام: باجماعت تراویح کا نظام حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت سے شروع ہوا ہے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پہلے گیارہ رکعت پڑھانے کا حکم دیا تھا، جس کو تہجد کے وقت تک جاری رکھا جاتا تھا اور اس کا مدار تہجد کی روایت پر تھا مگر بعد میں یہ بات واضح ہوئی کہ رمضان میں بھی تہجد اپنی جگہ پر ہے اور قیام رمضان (تراویح) اس کے علاوہ نماز ہے، چنانچہ آپؓ نے اس روایت کی بنا پر جس کو حضرت ابن عباسؓ نے روایت کیا ہے: رکعتوں کی تعداد بڑھادی اور قراءت میں تخفیف کردی تا کہ لوگ تراویح سے فارغ ہو کر سوجائیں اور آخر شب میں اٹھ کر حسب معمول تہجد پڑھیں، چنانچہ اس وقت سے آج تک شرقاً غرباً یہی نظام چل رہا ہے اور اس پر پوری امت کا اجماع ہے، صرف غیر مقلدین اختلاف کرتے ہیں مگر گمراہ فرقوں کا اختلاف اجماع پر اثر انداز نہیں ہوتا۔ حافظ رحمہ اللہ نے فتح الباری شرح صحیح البخاری میں یہ واقعہ لکھا ہے کہ امام ابو یوسف رحمہ اللہ نے امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے دریافت کیا کہ کیا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس تراویح کی بیس رکعتوں کے لئے آنحضرت ﷺ کی جانب سے کوئی عہد تھا؟ امام صاحبؒ نے فرمایا: حضرت عمرؓ اپنی طرف سے ایجاد کرنے والے نہیں تھے، یقیناً ان کے پاس اس کا ثبوت تھا (فتح الباری ۲: ۴۲۰)

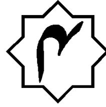
چنانچہ حافظ رحمہ اللہ نے التلخیص الحبیر میں یہ روایت لکھی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے دو دن جماعت کے ساتھ جو نماز پڑھائی تھی وہ بیس رکعتیں پڑھائی تھیں، حافظ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اس حدیث کی صحت پر تمام محدثین کا اتفاق ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث بیہقی کے حوالہ سے میں نے ابھی بیان کی کہ نبی ﷺ ماہِ رمضان میں بلا جماعت بیس رکعتیں اور وتر پڑھتے تھے، یہ روایت اگر چہ ضعیف ہے مگر تعامل سے اس کی تائید ہوتی ہے، بلکہ تعامل کی صورت میں سرے سے روایت کی ضرورت نہیں رہتی، مثلاً کلمہ طیبہ: لا إلٰه

إلا الله محمد رسول الله کسی روایت سے ثابت نہیں، اگرچہ اس کے دونوں اجزاء قرآن کریم میں ہیں، مگر دونوں کا مجموعہ کلمۂ طیبہ ہے، یہ بات کسی ضعیف روایت سے بھی ثابت نہیں، مگر چونکہ پوری امت کا اس پر تعامل ہے اور اجماع قوی دلیل ہے اس لئے سند کی مطلق حاجت نہیں۔

اور غیر مقلدین اس بات کا اس لئے انکار کرتے ہیں کہ وہ 'اہل حدیث' ہیں، وہ قرآن کے بعد صرف حدیثوں کو حجت مانتے ہیں، اس سے نیچے اجماع امت کو بلکہ اجماع صحابہ کو بھی حجت نہیں مانتے، نہ آثار صحابہ (صحابہ کی انفرادی آراء) کو حجت مانتے ہیں، حتی کہ خلفائے راشدین کی آراء کو اور ان کے زمانہ میں جو باتیں صحابہ کے اجماع سے طے ہوئی ہیں ان کو بھی حجت نہیں مانتے، اس لئے وہ گمراہ فرقہ ہے، اور کسی بھی گمراہ فرقہ کا اختلاف اجماع کو متأثر نہیں کرتا، ورنہ شیعہ بھی صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی خلافت کو تسلیم نہیں کرتے تو کیا ان کی خلافت بھی اختلافی ہوجائے گی؟ توبہ! اس لئے سلفیوں کی اس بات سے واقف رہنا ضروری ہے اور وہ جو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی بخاری کی حدیث پیش کرتے ہیں اس کا تراویح کے مسئلہ سے کچھ تعلق نہیں۔ اس بات کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے۔

وآخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمين





نمازوں کے بعد دعاؤں کا حکم

خطبہ مسنونہ کے بعد: ﴿وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ أَزْوَاجِنَا وَذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ أَعْيُنٍ وَاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ إِمَامًا﴾

بزرگانِ محترم: یہ سورۃ الفرقان کے آخری رکوع کی ایک آیتِ کریمہ ہے، جو امام صاحب نے آج نماز میں پڑھی ہے، اور مسلمان عام طور پر بطور دعا یہ آیتِ کریمہ پڑھتے ہیں، جو عربی جانتے ہیں اور اس کا مضمون سمجھتے ہیں وہ سمجھ کر دعا مانگتے ہیں مگر ہم عربی سے ناواقف ہیں، ہم کچھ نہیں سمجھتے، بس اتنا جانتے ہیں کہ جن آیات کے شروع میں ربنا ہے ان میں کوئی دعا ہے، اس لئے جن آیتوں کے شروع میں ربنا ہے وہ آیتیں ہم نے یاد کرلی ہیں، اور ان کو ہم پڑھتے ہیں مگر سمجھتے نہیں، اس سے دعا کا مقصد پورا نہیں ہوتا، اصل دعا یہ ہے کہ ہم سمجھ رہے ہوں کہ ہم اللہ سے کیا مانگ رہے ہیں، اگر ہم نے کچھ آیتیں اور کچھ حدیثیں یاد کرلیں جو از قبیل دعا ہیں اور ہاتھ اٹھا کر ان کو پڑھ لیا اور سمجھا نہیں تو یہ کامل دعا نہیں۔

نمازوں کے بعد دعا مانگنا اچھا ہے

آج کل عربوں میں اور عجمیوں میں یہ مسئلہ بڑا اختلافی ہے کہ نمازوں کے بعد دعا مانگنی چاہئے یا نہیں؟ آپ حضرات حرمین شریفین میں دیکھتے ہونگے کہ وہاں ائمہ نمازوں کے بعد دعا نہیں مانگتے، حرمین شریفین کے علاوہ عربوں کی جو دوسری مسجدیں ہیں ان میں بھی ائمہ نمازوں کے بعد دعا نہیں مانگتے، وہ کہتے ہیں: نمازوں کے بعد ہیئتِ اجتماعی سے دعا مانگنا بدعت ہے، نہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے اور نہ حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم نے

اس طرح دعا مانگی ہے۔ دوسری طرف چاروں فقہوں میں (۱) جن کی مسلمانوں کی اکثریت پیروی کرتی ہے یہ مسئلہ لکھا ہے کہ نمازوں کے بعد دعا مانگنا حسن (اچھا) ہے، سنت نہیں لکھا۔

اور نمازوں کے بعد دعا مانگنے کو علماء نے حسن اس لئے کہا ہے کہ دورِ اول میں اسلام صرف عربوں میں تھا، عربی ان کی مادری زبان تھی، اور قرآن عربی میں ہے، احادیث شریفہ بھی عربی میں ہیں، اور ان میں جو دعائیں آئی ہیں وہ بھی عربی میں ہیں، دورِ اول کے مسلمان قرآن کو سمجھتے تھے، احادیثِ شریفہ کو سمجھتے تھے اور دعاؤں کو بھی سمجھتے تھے، اور خود نماز میں دعائیں مانگنے پر قادر تھے، اور وہ نماز کے آخری قعدہ میں سب دعائیں مانگ لیا کرتے تھے،

(۱) چار فقہیں چار مکاتبِ فکر ہیں، معین اشخاص کی رائیں نہیں ہیں، عام طور پر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ مذہبِ حنفی یعنی امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی رائیں، مذہب شافعی یعنی امام شافعی رحمہ اللہ کی رائیں، مذہبِ مالکی یعنی امام مالک رحمہ اللہ کی رائیں، مذہبِ حنبلی یعنی امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کی رائیں۔ ایسا سمجھنا صحیح نہیں، یہ معین اشخاص کی رائیں نہیں ہیں، بلکہ یہ چار مکاتبِ فکر ہیں، قرآن وحدیث سے مسائل اخذ کرنے کے لئے چار اصول ہیں، چنانچہ فقہ حنفی میں صرف امام اعظم کے قول پر فتوی نہیں دیا جاتا، متعدد مسائل میں امام اعظم کا قول موجود ہوتا ہے مگر فتوی ان کے شاگردوں کے قول پر دیا جاتا ہے، یہی حال باقی فقہوں کا ہے، مثلاً: مزارعت جائز ہے یا نہیں؟ مزارعت کے معنی ہیں: زمین بٹائی پر دینا، ہم نے اپنی زمین کسی کو دی کہ اس میں غلّہ بوئے اور پیداوار آدھی آدھی، یا ایک تہائی تمہاری دو تہائی میری، یا برعکس، اس کو مزارعت کہتے ہیں۔ امام اعظم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: مزارعت جائز نہیں، امام شافعیؒ بھی یہی فرماتے ہیں، مگر فقہ حنفی میں فتوی امام اعظم کے قول پر نہیں، صاحبین کے قول پر ہے، صاحبین مزارعت کو جائز کہتے ہیں، اور فقہ شافعی میں بھی فتوی امام شافعیؒ کے قول پر نہیں، بلکہ ان کے شاگردوں کے قول پر ہے۔ غرض چاروں فقہوں میں قرآن وحدیث سے مسائل اخذ کرنے کے لئے اصول ہیں جو اصولِ فقہ کہلاتے ہیں ان کی روشنی میں قرآن وحدیث سے خاص نہج پر مسائل مستنبط کئے جاتے ہیں، پس جو لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ معین اشخاص کی رائیں ہیں، اور ان کی اتباع تقلید شخصی ہے وہ غلط سوچتے ہیں، یہ معین اشخاص کی تقلید نہیں بلکہ معین مکتب فکر کی تقلید ہے۔

اور نوافل وسنن میں رکوع وسجود اور قومہ وجلسہ میں بھی دعائیں مانگتے تھے، آنحضور ﷺ کی نماز تہجد کے بارے میں مروی ہے کہ آپ سجدہ پچاس آیتوں کے بقدر فرماتے تھے اور اس میں خوب دعائیں مانگتے تھے، صحابہ کا بھی یہی حال تھا بلکہ آج بھی عرب علماء نماز میں اپنی ساری ضرورتیں مانگ لیتے ہیں، آپ حضرات نے رمضان میں ائمہ حرمین کو وتروں میں پون گھنٹہ دعا کرتے سنا ہوگا، وہ دعائیں ان کی پہلے سے رٹی ہوئی اور یاد کی ہوئی نہیں ہوتی بلکہ فی البدیہہ مانگی ہوئی ہوتی ہیں، ان کو اس پر قدرت ہے پس جب انھوں نے وتروں میں قعدہ میں، رکوع وسجود میں سب دعائیں مانگ لیں تو اب نمازوں کے بعد الگ سے دعا کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ اس لئے آنحضور ﷺ اور حضراتِ صحابہ کرام نمازوں کے بعد اجتماعی طور پر دعا نہیں مانگتے تھے۔

مگر جب اسلام عربوں سے نکل کر عجمیوں میں پہنچا تو ان کے لئے پریشانی کھڑی ہوئی، اللہ سے مانگنا ان کو بھی ہے، نہیں مانگیں گے تو بندوں کا اللہ سے مانگنے کا تعلق ٹوٹ جائے گا، پھر عبادتوں کا مغز دعا ہے نبی ﷺ کا ارشاد ہے: **الدعاء مُخُّ العبادة**: دعا عبادت کا مغز ہے، اگر بادام میں گری نہ ہو تو بادام بے کار ہے، اس بادام کی کوئی قیمت نہیں، اصل چیز گری ہے، اسی کی وجہ سے بادام کی قیمت ہے، اسی طرح عبادت میں اصل دعا ہے اس کی وجہ سے عبادت: عبادت ہے، دعا کے بغیر عبادت بے گری کی مونگ پھلی ہے اور عجمی لوگ نمازوں میں دعا مانگ نہیں سکتے، اپنی زبان میں مانگیں گے تو نماز ٹوٹ جائے گی، اور قرآن واحادیث کی دعائیں مانگیں گے تو عجمیوں کے حق میں وہ اذکار ہیں، اس لئے کہ وہ ان دعاؤں کو سمجھتے نہیں، جب وہ بے سمجھے دعائیں پڑھیں گے تو وہ دعا نہیں ہوگی اذکار ہونگے، دعا وہ ہے جسے بندہ سمجھ کر اللہ سے مانگے، یہ ایک بہت بڑی ضرورت عجمیوں کے سامنے تھی، اس لئے چاروں مکاتبِ فکر کے علماء نے اس کا حل یہ نکالا کہ نمازوں کے بعد دعائیں مانگ لیا کریں، البتہ اجتماعی ہیئت کو لازم نہ بنایا جائے، گاہ بہ گاہ ناغہ بھی کیا جائے، اور کوئی سلام پھیر کر چلا جائے تو اسے مطعون نہ کیا جائے، کوئی امام سے پہلے دعا شروع کردے یا امام کے بعد تک دعا میں مشغول رہے تو اس میں توسع برتا جائے، امام کے ساتھ دعا شروع کرنے کو اور

امام کے ساتھ دعا ختم کرنے کو لازم نہ بنایا جائے، ان باتوں کا خیال رکھ کر نمازوں کے بعد دعا مانگنا مستحب ہے، یہ چاروں فقہوں کے علماء کی رائے ہے اور عجمیوں کی ضرورت ہے، اس لئے اس کو حسن قرار دیا ہے۔

اللہ کو بندوں کا مانگنا پسند ہے

غرض میں یہ بیان کر رہا تھا کہ نمازوں کے بعد دعا مانگنا حسن اور اچھا ہے اس لئے کہ دعا عبادت کا خلاصہ، نچوڑ اور مغز ہے اور دعاؤں ہی کے ذریعہ بندوں کا اللہ کے ساتھ تعلق جڑتا ہے۔ اور اللہ کو بندوں کی سب سے زیادہ پسند چیز دعا ہے، اللہ تعالیٰ چاہتے ہیں کہ بندے اپنی تمام چھوٹی بڑی حاجتیں اپنے مولیٰ سے مانگیں۔ حدیث شریف میں ہے کہ اگر تمہارے چپل کا تسمہ ٹوٹ جائے تو وہ بھی اللہ سے مانگو۔ ظاہر ہے چپل کی پٹی معمولی چیز ہے، کوڑیوں کے دام مل جاتی ہے مگر اسے بھی اللہ سے مانگنا ہے کیونکہ اللہ کو بندوں کا مانگنا پسند ہے، وہی بندہ اللہ کو پیارا ہے جو اللہ سے مانگتا ہے، چاہے اوندھا مانگے چاہے سیدھا، مگر مانگے ضرور!

اللہ تعالیٰ ہر شخص کے ساتھ اس کی عقل وفہم کے مطابق معاملہ فرماتے ہیں

مولانا روم رحمہ اللہ نے ایک واقعہ لکھا ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام جب کوہِ طور پر تشریف لے جا رہے تھے تو انھوں نے ایک چرواہے کو دیکھا، جو اپنی بکریاں چرا رہا تھا، وہ ایک درخت کے نیچے بیٹھ کر اللہ سے دعا مانگ رہا تھا، وہ کہہ رہا تھا اے میرے خدا! تو کہاں ہے؟ اگر تو مجھے مل جائے تو میں تجھے اپنی بکریوں کا دودھ پلاؤں، اے میرے مولیٰ! تیرے سر میں جوئیں پڑ گئی ہوں گی میں تیرے سر میں سے جوئیں نکالوں، اے میرے خدا! ہوسکتا ہے تیرے گریبان میں بٹن نہ ہو میں ببول کے کانٹوں کا اس میں بٹن لگاؤں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب اس کو اس طرح دعا کرتے سنا تو ڈانٹا، اس نے دعا بند کر دی، حضرت موسیٰ علیہ السلام جب طور پر پہنچے اور اللہ تعالیٰ سے ہم کلام ہوئے تو پہلی بات اللہ نے یہ فرمائی کہ موسیٰ! میرا ایک بندہ مجھ سے راز و نیاز کی باتیں کر رہا تھا تم نے اس کو کیوں روک دیا؟ اس

کا مبلغ علم اتنا ہی تھا، وہ اپنی دانست اور علم کے مطابق میری تعریف کر رہا تھا، اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ ہر ایک کے ساتھ اس کی حیثیت کے مطابق معاملہ فرماتے ہیں۔

ایک گناہ گار کی بخشش کا واقعہ

خیر یہ تو ایک بے سند قصہ تھا مگر ایک اعلیٰ درجہ کی حدیث ہے، حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: پچھلی امتوں میں ایک شخص تھا جس کی زندگی بہت خراب تھی، اس نے وصیت کی کہ مجھے جلا کر میری آدھی راکھ سمندر میں ڈال دینا اور آدھی ہوا میں اڑا دینا، تاکہ میں اللہ کے ہاتھ نہ آؤں، اگر میں اللہ کے ہاتھ آ گیا تو وہ مجھے اتنی سخت سزا دیں گے کہ اتنی سخت سزا کسی کو نہیں دی ہوگی، چنانچہ اس کے مرنے کے بعد اس کے ورثاء نے اس کی وصیت کی تعمیل کی، اس کو جلا دیا، آدھی راکھ سمندر میں ڈال دی اور آدھی ہوا میں اڑا دی، اللہ نے راکھ کو حکم دیا اکٹھی ہو جا: ہو گئی، اور وہ زندہ ہو کر اللہ کے روبرو کھڑا ہو گیا، اللہ نے اس سے پوچھا: میرے بندے! تو نے یہ حرکت کیوں کی؟ اس نے عرض کیا: پروردگار! آپ کے ڈر سے! اللہ نے اس کو بخشش دیا۔

یہ واقعہ حدیث میں ہے، اگر ایسا عقیدہ اللہ کے بارے میں کوئی سمجھ دار اور عقلمند رکھے تو وہ کافر ہو جائے گا، کیونکہ یہ اللہ کی قدرت کے منافی عقیدہ ہے مگر وہ شخص زیادہ سمجھ دار نہیں تھا، اس لئے اس کے خیال کو کفر قرار نہیں دیا اور اللہ نے اس کو معاف کر دیا۔

اس حدیث کی وجہ سے علماء کرام نے فرمایا: ہر شخص کے ساتھ اس کی عقل و فہم کے مطابق معاملہ کیا جائے گا۔

جو خوش حالی میں مانگے وہ اللہ کو زیادہ پسند ہے

میں عرض یہ کر رہا تھا کہ اللہ جل شانہ سے مانگا نہ جائے تو اللہ ناراض ہوتے ہیں، اللہ کو وہی بندہ پسند ہے جو مانگتا ہے اور خوب مانگتا ہے، بلکہ جو بندہ خوشحالی میں اللہ سے مانگتا ہے اللہ کو وہ بندہ زیادہ پسند ہے، تنگ حالی میں اللہ اس کی سنتے ہیں، اور جو لوگ خوشحالی میں اللہ سے نہیں مانگتے، اس کے سامنے نہیں روتے وہ سمجھتے ہیں کہ ہمارے پاس سب کچھ ہے، کھانا

پینا، مکان، کپڑا اور ضرورت کی ہر چیز ہے، اللہ نے ان کو سب کچھ دے رکھا ہے اس لئے وہ مانگتے نہیں، وہ لوگ جب بیماریوں میں اور آفتوں میں پھنسیں گے اور یا اللہ یا اللہ پکاریں گے تو اللہ ان کی نہیں سنیں گے، اللہ کا بہترین بندہ وہ ہے جو خوشحالی میں اللہ کو پکارے، اس سے تعلق رکھے، اس سے دعائیں مانگے، اس کے سامنے گڑگڑائے تو مصیبتوں میں اللہ تعالیٰ اس کی پکار سنیں گے اور اس کی مراد پوری کریں گے۔

غرض اللہ سے اپنی آرزوئیں اور خواہشیں مانگنا بہت ضروری ہے اور یہ عبادت کا خلاصہ اور نچوڑ ہے، جب عجمیوں کے ساتھ یہ صورت پیش آئی کہ وہ نماز میں اپنی مرادیں نہیں مانگ سکتے اور دعائیں نہیں کر سکتے تو علماء نے اس کا حل یہ نکالا کہ نماز کے بعد دعائیں مانگیں، اپنی اپنی زبانوں میں مانگیں، علماء نے اس کو مستحب کہا ہے۔

حسن ہونے کی دلیل

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے: ما رآہ المسلمون حسنا فھو عند اللہ حسنٌ: جس چیز کو مسلمان اچھا سمجھیں وہ اللہ کے نزدیک اچھی ہے۔ نمازوں کے بعد دعا کرنے کو چاروں مکاتبِ فکر کے علماء نے جن کی مسلمانوں کی بڑی تعداد تقلید کرتی ہے اچھا سمجھا ہے، پس نمازوں کے بعد دعا کرنا حسن ہے، اس کو بدعت کہنا صحیح نہیں۔

نمازِ جنازہ کے بعد دعا

بعض لوگوں نے نماز جنازہ کے بعد بھی دعا شروع کر دی ہے، حالانکہ نماز جنازہ خود دعا ہے، میت کے لئے دعا کرنے ہی کے لئے نماز جنازہ مشروع کی گئی ہے، مگر جب لوگوں نے اس دعا کو سمجھا نہیں تو نماز جنازہ کے بعد بھی دعا شروع کر دی۔ امام صاحب جہراً دعا کرتے ہیں، انھوں نے چند ربنا یاد کر رکھے ہیں جن کو نہ امام صاحب سمجھتے ہیں نہ لوگ، بس جہاں سانس ٹوٹتا ہے لوگ آمین کہتے ہیں، یہ ایک رسم بن کر رہ گئی ہے، حالانکہ نماز جنازہ خود کامل دعا ہے، اس کے بعد کسی دعا کی ضرورت نہیں، جنازہ کی ایک چھوٹی سی دعا

ہے ہر شخص اس کو یاد کرسکتا ہے، پس وہ دعا کافی ہے اس کے بعد میت کو دفن کردینا چاہئے، اب دوسری دعا کی ضرورت نہیں۔

تدفین کے بعد دعا

پھر تدفین کے بعد دعا ہے، ابوداؤد میں حدیث ہے کہ نبی اکرم ﷺ جب ایک میت کی تدفین سے فارغ ہوئے تو آپ ؐ نے فرمایا: اپنے بھائی کے لئے مغفرت طلب کرو، اور خاص طور پر یہ دعا کرو کہ اب جو سوال وجواب ہونگے اللہ تعالیٰ ان میں اس کو ثابت قدم رکھیں اور صحیح جواب دینے کی توفیق عطا فرمائیں۔ لوگوں کے قبر سے ہٹتے ہی سوال وجواب شروع ہونگے، لہٰذا میت کے لئے دو دعائیں کرنی چاہئیں، ایک: اس کے گناہوں کو اللہ تعالیٰ بخش دیں دوسری: اس سے جو تین سوال ہونگے ان کے صحیح جواب دینے کی اللہ توفیق عطا فرمائیں۔ اور ہاتھ اٹھا کر اجتماعی دعا کرنا ضروری نہیں۔ ابوداؤد کی حدیث میں اس طرف اشارہ ہے کہ نبی ﷺ تدفین کے بعد اجتماعی اور جہری دعا نہیں کرتے تھے، ورنہ صحابہ کو تلقین کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ دیوبند سہارن پور میں یہی معمول ہے، میں پچاس سال سے دیکھ رہا ہوں، جب قبر بھر جاتی ہے تو ایک آدمی قبر کے سرہانے اور پائینتی کھڑے ہوکر سورۂ بقرہ کا اول وآخر پڑھتا ہے، اس وقت سب لوگ قبر کے پاس آجاتے ہیں اور ہر شخص اپنے طور پر مذکورہ دو دعائیں کرتا ہے، پھر لوگ چل دیتے ہیں۔

ایک مقصد ہو تو جہراً اجتماعی دعا مانگنا جائز ہے

فرض نمازوں کے بعد دعا مانگنی چاہئے، اللہ تعالیٰ سے اپنی آرزوئیں مانگنی چاہئیں، اور ہر شخص اپنی دعا خود مانگے، مقتدیوں کا امام کے ساتھ جو تعلق ہے وہ سلام پر ختم ہوجاتا ہے، اب ہر شخص آزاد ہے، اس کو اپنے لئے دعا کرنی ہے، اور اپنی آرزوئیں مانگنی ہیں اور اپنی زبان میں مانگنی ہے اور سمجھ کر مانگنی ہے، البتہ اگر حاضرین کا ایک مقصد ہو مثلاً بارش نہیں ہورہی اور بارش طلبی کے لئے لوگ جمع ہوئے ہیں، یا کوئی آفت اور مصیبت آئی ہے اس کے لئے دعا

مانگنی ہے تو چونکہ سب کی مراد ایک ہے اس لئے اجتماعی طور پر جہراً دعا کرنا جائز ہے، حدیث سے ثابت ہے۔

نمازوں کے بعد دعا کب کی جائے؟

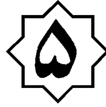
اور یہ بات بھی جان لی جائے کہ جن تین نمازوں کے بعد سنتیں اور نوافل ہیں، ان میں فرض کے بعد مختصراً اذکار ہیں۔ دعا نوافل سے فارغ ہوکر ہر ایک کو کرنی چاہئے، اس کے لئے ہیئتِ اجتماعی نہ بنائی جائے، کیونکہ سب نمازی نوافل سے ایک ساتھ فارغ نہیں ہوتے، ہر شخص جب فارغ ہو دعا کرے، سب کا ایک ساتھ دعا کرنا جس کو دعائے ثانیہ کہتے ہیں بدعت ہے۔ اور فجر اور عصر کے بعد چونکہ نوافل نہیں، اس لئے تسبیحات سے فارغ ہوکر دعا کریں، اور ہر شخص جب فارغ ہو جائے دعا شروع کردے، امام صاحب کے ہاتھ اٹھانے کا انتظار نہ کرے، ہیئتِ اجتماعی نہ بنائیں، اور جب کسی کی دعا ختم ہو تو منہ پر ہاتھ پھیر لے، امام صاحب کے فارغ ہونے کا انتظار نہ کرے۔ اور کسی کو یا امام کو یا مقتدی کو کوئی ضرورت ہو تو وہ دعا کے بغیر بھی جا سکتا ہے، پس التزام اور ہیئتِ اجتماعی نہ ہو، مگر دعا ضرور کی جائے، سری کی جائے، اور ہر شخص اپنی زبان میں اپنے دل کی مراد مانگے۔

دعا بند کرنا غلطی کی اصلاح نہیں، بلکہ دوسری غلطی ہے

سلفی کہتے ہیں: اب نمازوں کے بعد دعا کا التزام ہو گیا ہے، اس لئے اس کو بند کردینا ضروری ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ آپ لوگوں نے عدم دعا کا التزام شروع کردیا ہے، لہٰذا اس کو بھی بند کرنا ضروری ہے۔

ثانیاً: اصلاح کا یہ طریقہ نہیں کہ اللہ سے مانگنا بند کردیا جائے، یہ تو دوسری غلطی ہے، پہلی غلطی التزام دعا تھی، دوسری غلطی ترک دعا ہے، بلکہ اصلاح کا طریقہ یہ ہے کہ امام صاحب وقتاً فوقتاً لوگوں کو مسئلہ سمجھائیں اور گاہ بہ گاہ اس پر عمل کرکے بھی دکھائیں۔ ان شاء اللہ ایسا کرنے سے لوگ صحیح بات سمجھ لیں گے۔

وآخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمين



جمعہ وعیدین کے خطبے عربی میں کیوں ضروری ہیں؟

خطبہ مسنونہ کے بعد: ﴿يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا إِذَا نُوْدِیَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ يَوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا إِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ وَذَرُوْا الْبَيْعِ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ﴾

بزرگواور بھائیو! بعض لوگ سوال کرتے ہیں کہ جمعہ کا خطبہ عربی میں کیوں ضروری ہے؟ عربی کے بجائے اگر انگلش میں خطبہ دیا جائے تو اس میں حرج کیا ہے؟ اس میں انگلش کی تخصیص کی ضرورت نہیں۔ دنیا میں بے شمار زبانیں ہیں، لہٰذا انگلش کی تخصیص نہ کی جائے مسئلہ عام پوچھا جائے کہ عربی کے علاوہ دنیا کی کسی بھی زبان میں جمعہ کا خطبہ دیا جا سکتا ہے یا نہیں؟ اور جمعہ کی تخصیص کی بھی ضرورت نہیں، عیدین کا بھی یہی حکم ہے، اور اگر دائرہ ذرا وسیع کیا جائے تو نماز میں قرآن پڑھنے کے بارے میں بھی یہی سوال ہوسکتا ہے کہ عربی کے علاوہ دوسری زبان میں نماز میں قرآن کریم پڑھا جا سکتا ہے یا نہیں؟ کیونکہ قرآن کریم لوگوں کے لئے راہ نما کتاب بن کر نازل ہوا ہے اور ساری دنیا کے لوگ عربی نہیں جانتے الگ الگ زبانیں بولتے ہیں، پس اگر ان کے سامنے نمازوں میں قرآن کریم عربی میں پڑھا جائے گا تو ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آئے گا، بس ہاتھ باندھے کھڑے رہیں گے، پس کیوں نہ ان کی زبان میں ترجمہ پڑھا جائے، تاکہ وہ کچھ سمجھیں اور اس پر عمل کریں، لہٰذا سوال میں دو تعمیم کرنی چاہئیں، ایک: انگلش کے ساتھ مسئلہ خاص نہیں کرنا چاہئے، دوسرا: جمعہ کے خطبہ کے ساتھ بھی خاص نہیں کرنا چاہئے۔

اس کے بعد جاننا چاہئے کہ مسئلہ کے دو پہلو ہیں، ایک پہلو یہ ہے کہ جمعہ کا خطبہ دنیا کی کسی بھی زبان میں پڑھا جائے تو تعامل، اجماع امت اور توارث کے خلاف ہونے کی وجہ سے مکروہ تحریمی ہے، دوسرا پہلو یہ ہے کہ غیر عربی زبان میں خطبہ پڑھنے کی صورت میں اللہ کا

ذکر متحقق ہوا یا نہیں؟ اگر ہوا تو جمعہ صحیح ہے اور نہیں ہوا تو جمعہ صحیح نہیں، جیسے آج کل سیاسی تقاریر میں شروع سے آخر تک کہیں اللہ کا نام نہیں آتا تو اگر امام نے ایسا خطبہ دیا جس میں اللہ کا کہیں کوئی ذکر نہیں آیا، خواہ عربی میں دیا یا غیر عربی میں، تو مسئلہ یہ ہے کہ خطبہ نہیں ہوا اور جب خطبہ نہیں ہوا تو جمعہ کی نماز بھی صحیح نہیں ہوئی، وقت کا فرض: ظہر ذمہ پر باقی رہے گا، کیونکہ قرآن کریم میں ہے: ﴿یٰأَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا إِذَا نُوْدِیَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ یَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا إِلٰی ذِکْرِ اللّٰهِ وَذَرُوْا الْبَیْعِ﴾: اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو! جب جمعہ کے دن تمہیں نماز کے لئے پکارا جائے تو اللہ کے ذکر کی طرف چل پڑو اور جس کاروبار میں ہو اس کو چھوڑ دو۔ اس آیت میں اللہ نے ﴿فَاسْعَوْا إِلٰی ذِکْرِ اللّٰهِ﴾ (اللہ کے ذکر کی طرف چلو) فرمایا ہے، بلایا گیا ہے نماز کی طرف ﴿إِذَا نُوْدِیَ لِلصَّلٰوةِ﴾ اور چلایا جا رہا ہے اللہ کے ذکر کی طرف ﴿فَاسْعَوْا إِلٰی ذِکْرِ اللّٰهِ﴾، اور اللہ کا ذکر: خطبہ ہے، اور یہ خطبہ چونکہ نماز سے پہلے دیا جاتا ہے اس لئے جلدی چلو اور جا کر خطبہ سنو، پھر جس نماز کے لئے بلایا گیا ہے اس کو پڑھو۔

غرض اس آیت میں اللہ نے خطبہ کو ذکر اللہ سے تعبیر کیا ہے، اس لئے مسئلہ یہ ہے کہ اگر خطبہ میں اللہ کا ذکر آیا تو خطبہ محسوب ہوگا اور جمعہ کی نماز صحیح ہوگی اور اگر سیاسی تقریر کی طرح پورے خطبہ میں کہیں اللہ کا ذکر نہیں آیا تو خطبہ نہیں ہوا اور جب خطبہ نہیں ہوا تو جمعہ بھی نہیں ہوا، اور جب جمعہ نہیں ہوا تو وقت کا فرض باقی رہ گیا، اور اگر ایک دو جملے ذکر کے آ گئے تو خطبہ محسوب ہوگا، حساب میں آئے گا اور جب خطبہ حساب میں آئے گا تو جمعہ بھی صحیح ہو جائے گا، اور غیر عربی میں خطبہ چونکہ تعامل اور توارث کے خلاف ہے، اس لئے تعامل و توارث کے خلاف ہونے کی وجہ سے مکروہ تحریمی ہوگا یعنی غیر عربی میں خطبہ دینے کا گناہ ہوگا البتہ نماز صحیح ہو جائے گی۔

خطبہ کا مقصد کیا ہے؟

یہ جو میں نے دو مسئلے بتائے ان کو اکثر لوگ جانتے ہیں، سوال یہ ہے کہ جب اکثر لوگ جانتے ہیں تو بتائے کیوں؟ اس لئے بتائے کہ لوگوں کے ذہنوں میں خطبہ کے پس منظر کو لے

کر ایک اشکال ہے، اور وہ اشکال یہ ہے کہ خطبہ نماز تو نہیں، پس اگر عربی کے بجائے کسی اور زبان میں خطبہ دیا جائے، درانحالیکہ خطبہ کا مقصد لوگوں کو ہر ہفتہ نصیحت کرنا ہے، تو اس مقصد کے پیش نظر اگر کسی بھی زبان میں خطبہ دے دیا جائے تو مکروہ تحریمی کیوں ہے؟ جائز ہونا چاہئے اور نہ صرف جائز بلکہ مستحب ہونا چاہئے، یہ لوگوں کے ذہن میں بیٹھا ہوا ہے، جب تک اس اشکال کا جواب نہیں دیا جائے گا تب تک سوال کا جواب سمجھ میں نہیں آئے گا۔

تلاوت قرآن اور نماز کا اصل مقصد ذکر اللہ ہے

بنیادی غلطی یہ ہے کہ یہ جو ہم نے طے کیا ہے کہ جمعہ کے خطبہ کا مقصد ہر ہفتہ لوگوں کو نصیحت کرنا ہے یہ بات غلط ہے، بتاؤ قرآن کریم کا اصل مقصد کیا ہے؟ اصل مقصد یہ ہے کہ قرآن اللہ کا ذکر ہے، چاہے قرآن سمجھو یا نہ سمجھو قرآن پڑھنا ہے، اللہ پاک کا ارشاد ہے: ﴿إِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّكۡرَ وَإِنَّا لَهٗ لَحَافِظُوۡنَ﴾: بلاشبہ قرآن ہم نے اتارا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں، اس آیت میں اللہ تعالی نے ﴿إِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّكۡرَ﴾ کہا، إنا نحن نزل القرآن: نہیں کہا، قرآن کو الذکر سے تعبیر کیا کیونکہ قرآن کریم کا اصل مقصد اللہ کا ذکر ہے، چنانچہ جو عربی سمجھتا ہے اسے بھی قرآن پڑھنا ہے اور جو نہیں سمجھتا اسے بھی قرآن پڑھنا ہے، اور دونوں کو ہر ہر حرف پر دس دس نیکیاں ملیں گی۔

سوال: اگر کوئی کہے کہ قرآن کا اصل مقصد اللہ کی جانب راہ نمائی کرنا ہے جیسا کہ خود اللہ تعالی نے بیان کیا ہے: ﴿شَهۡرُ رَمَضَانَ الَّذِىۡۤ اُنۡزِلَ فِيۡهِ الۡقُرۡاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ﴾: قرآن لوگوں کے لئے گائڈ بک بنا کر اتارا گیا ہے اور میرے پاس گائڈ بک اگر انگلش میں ہوگی تبھی میں سمجھوں گا عربی میں ہوئی تو کیا خاک سمجھوں گا عربی تو مجھے آتی نہیں، قرآن سمجھے گا تبھی وہ کتاب ہدایت ہوگی، ایک بندہ بغیر سمجھے پڑھ رہا ہے اور ایک بندہ سمجھ کر پڑھ رہا ہے دونوں کے پڑھنے میں آسمان و زمین کا فرق ہوگا، اگرچہ نیکیاں دونوں کو برابر ملیں گی مگر اِس کے لئے قرآن راہ نما بنے گا اور اُس کے لئے نہیں بنے گا، پس معلوم ہوا کہ قرآن کا اصل مقصد لوگوں کے لئے راہ نما بننا ہے۔

جواب: راہ نما بننا یعنی قرآن سے نصیحت حاصل کرنا ثانوی مقصد ہے، دوسرے درجہ کا مقصد ہے، اور نصیحت براہ راست بھی حاصل ہوتی ہے اگر آدمی عربی جانتا ہے اور اگر عربی نہیں جانتا تو بالواسطہ حاصل ہوتی ہے، دنیا کی ہر زبان میں ترجمے ہو گئے ہیں وہ اسی لئے کئے گئے ہیں کہ جو عربی نہیں جانتے وہ ان کی مدد سے نصیحت حاصل کریں، معلوم ہوا کہ نصیحت براہ راست حاصل کرنا ضروری نہیں بالواسطہ ترجمہ کی مدد سے بھی نصیحت حاصل کی جاسکتی ہے، اس لئے کہ نصیحت حاصل کرنا دوسرے درجہ کا مقصد ہے پہلے درجہ کا مقصد ذکر ہے، اسی لئے فرمایا: ﴿إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ﴾: پس جب ذکر مقصود ہے تو عربی میں ہی قرآن پڑھنا ضروری ہے، چاہے کوئی سمجھے یا نہ سمجھے اور جہاں نصیحت مقصود ہو وہاں اگر عربوں کا مجمع ہے تو آپ عربی پڑھ کر سنایئے، اردو انگریزی کا مجمع ہو تو ترجمہ پڑھ کر اردو انگریزی میں سنایئے لوگوں کو نصیحت حاصل ہوگی۔

اسی طرح نماز کا مقصد قرآن میں مختلف جگہوں پر بیان کیا گیا ہے، سورہ طٰہٰ کے شروع میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ ہے، اس میں ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو نبی بنایا تو کوہ طور پر اللہ تعالیٰ اور موسیٰ علیہ السلام کے درمیان مکالمہ ہوا، اس میں اللہ تعالی کا یہ ارشاد ہے: ﴿وَأَقِمِ الصَّلَاةَ لِذِكْرِي﴾: مجھے یاد کرنے کے لئے نماز کا اہتمام کیجئے، یہاں سے معلوم ہوا کہ نماز کا اصل مقصد اللہ کو یاد کرنا ہے، اکیسویں پارے کے شروع میں حضور اکرم ﷺ کو اللہ نے حکم دیا ہے: ﴿وَأَقِمِ الصَّلٰوةَ﴾: نماز کا اہتمام کریں، ﴿إِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ﴾: نماز بے حیائی کے کاموں سے اور بری باتوں سے روکتی ہے، یہ نماز کا ایک فائدہ ہوا اور یہ ثانوی درجہ کا فائدہ ہے، ﴿وَلَذِكْرُ اللّٰهِ أَكْبَرُ﴾: اور اللہ کی یاد اس سے بڑا فائدہ ہے، یعنی فحشاء اور منکر سے روکنے کے فائدہ سے بڑا فائدہ نماز کا یہ ہے کہ یہ اللہ کی یاد ہے۔ ان دو آیتوں سے معلوم ہوا کہ نماز کا اصل مقصد ذکر اللہ ہے، اور جب ذکر اللہ مقصد ہے تو آپ نماز میں غیر عربی میں قرآن نہیں پڑھیں گے، اور نماز سے باہر جیسے میں وعظ کہہ رہا ہوں اس کا مقصد چونکہ ذکر اللہ نہیں بلکہ نصیحت کرنا ہے اس لئے ضروری نہیں کہ میں عربی ہی میں قرآن پڑھوں، آیت کریمہ کا ترجمہ بھی کافی ہے۔

خطبہ کا مقصد بھی ذکر اللہ ہے

جیسے نماز اور تلاوت کا مقصد ذکر اللہ ہے ایسے ہی خطبہ کا مقصد بھی ذکر اللہ ہے، میں نے خطبہ میں آیت پڑھی: ﴿فَاسْعَوْا إِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ﴾: اللہ کے ذکر کی طرف چلو، اللہ نے اس آیت میں ﴿فَاسْعَوْا إِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ﴾ کہا، فاسعوا إلى الخطبة نہیں کہا، اسی وجہ سے خطبہ میں ذکر اللہ ضروری ہے اگر سیاسی تقریر کی طرح خطبہ دیا تو وہ نہیں گنا جائے گا، حالانکہ عربی میں اسے بھی خطبہ کہتے ہیں، مگر اس سے جمعہ کا خطبہ ادا نہیں ہوگا، تو جب آیت کریمہ سے یہ بات ثابت ہوئی کہ خطبہ کا بنیادی مقصد اللہ کا ذکر ہے تو اب آپ کو خطبہ عربی میں دینا ہوگا اور خطبہ کا جو ثانوی مقصد ہے نصیحت حاصل کرنا اس کو کسی اور طرح حاصل کرنا ہوگا خطبہ سے پہلے خطیب صاحب منبر کے پاس کھڑے ہوجائیں اور مقامی زبان میں نصیحت کریں، جب خطبہ کا یہ ثانوی مقصد کسی اور طریقے سے حاصل کیا جاسکتا ہے تو ضروری نہیں کہ آپ حضور ﷺ کے زمانہ سے جو سلسلہ چلا آرہا ہے اس کو بدل دیں، اور اگر اس کو بدلنا ہے تو پھر نماز میں بھی بدل دو، نماز میں بھی انگریزی میں قراءت کرو تاکہ لوگ قرآن کو سمجھیں اور نصیحت حاصل کریں۔

صحابہ نے اپنے سو سالہ دور میں کبھی غیر عربی میں خطبہ نہیں دیا

جزیرۃ العرب حضور ﷺ کے زمانہ میں فتح ہوگیا تھا، اللہ پاک کا ارشاد ہے: ﴿وَرَأَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ أَفْوَاجًا﴾: اور آپ لوگوں کو دیکھیں کہ اللہ کے دین میں جوق جوق داخل ہورہے ہیں۔ اس سے جزیرۃ العرب کے لوگ مراد ہیں، جزیرۃ العرب کے لوگ اس بات کے انتظار میں تھے کہ مکہ اور مدینہ والوں میں جو جنگ ہورہی ہے، اس میں جیت کس کی ہوتی ہے؟ وہ یہ سمجھتے تھے کہ کعبہ شریف پر جس کا قبضہ ہے وہ برحق ہے، اور اب تک کعبہ شریف پر قبضہ قریش کا چلا آرہا ہے اس لئے ان کا ہاتھ اوپر ہے، لیکن اب جو جنگ شروع ہوئی ہے وہ کہاں جاکر رکے گی؟ یہاں پہنچ کر رکے گی کہ کعبہ پر ایک کا قبضہ ہوگا اور

دوسرا قبضہ کرنے کے لائق نہیں رہے گا، جب آٹھ ہجری میں مکہ مکرمہ فتح ہوا اور سارا مکہ مسلمان ہوگیا تو سارے عرب نے دیکھ لیا کہ اگر مشرکین حق پر ہوتے تو حضور ﷺ کا قبضہ نہ ہوتا اور مکہ والے مسلمان نہ ہوتے لیکن حضور ﷺ کا قبضہ ہوگیا اور مکہ والے مسلمان بھی ہوگئے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام برحق ہے، اس کے بعد پورے جزیرۃ العرب سے مسلمان ہونے کے لئے پے در پے وفود آنے لگے، بعض دفعہ اسّی اسّی وفود آئے ہیں، یہی وہ ﴿وَرَأَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ أَفْوَاجًا﴾ ہے، لیکن جزیرۃ العرب سے باہر کے لوگوں سے ابھی تک کوئی معاملہ نہیں ہوا تھا، نبی پاک ﷺ نے اپنی وفات سے ایک سال پہلے جزیرۃ العرب سے باہر کے تمام ملکوں کے سربراہوں کی طرف دعوتی خطوط ارسال فرمائے ہیں، چھوٹا ہو یا بڑا، سپر پاور ہو یا غیر سپر پاور، کوئی ملک باقی نہیں رہا تھا پھر ایک سال مشکل سے گذرا تھا کہ حضور ﷺ کی وفات ہوگئی، حضور ﷺ کی وفات کے بعد خلفائے راشدین کے زمانہ میں ان ممالک کے ساتھ جنگیں شروع ہوئیں، بعض بغیر جنگ کے تابع ہوگئے اور بعض کے ساتھ بڑے سخت معرکے پیش آئے، بالآخر ایران جو سپر پاور تھا وہ صفحۂ ہستی سے مٹ گیا اور دوسرا سپر پاور روم پیچھے ہٹتے ہٹتے قسطنطنیہ تک چلا گیا، پھر صحابہ آگے نہیں بڑھے کیونکہ آگے ٹھنڈے علاقے تھے اور صحابہ گرم ملکوں کے رہنے والے تھے۔

مجھے بتانا یہ ہے کہ صحابہ نے یہ جتنے ملک فتح کئے ہیں، یہ سب غیر عربی ملک تھے یہاں عربی نہیں بولی جاتی تھی اور صحابہ کے زمانہ میں ملک فتح ہونے کے بعد اسلام بڑی تیزی کے ساتھ پھیلا تھا مگر صحابہ نے اپنے سو سالہ دور میں کبھی مقامی زبان میں خطبہ نہیں دیا حالانکہ اس وقت مقامی زبان میں خطبہ دینے کی ضرورت تھی، علاقے کے علاقے نئے مسلمان ہوئے تھے ان کو ان کی زبانوں میں دین پہنچانا ضروری تھا مگر کسی صحابی نے ایک جگہ بھی غیر عربی میں خطبہ نہیں دیا۔

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کا طرز عمل

ترمذی شریف میں ابواب السیر کی سب سے پہلی روایت ہے، ایک لشکر تھا جس کے

کمانڈر حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ تھے، فارسی حضرت کی مادری زبان تھی، اس لشکر نے فارس کے ایک قلعہ کا محاصرہ کیا، قلعے والے بھی فارسی بولنے والے تھے اور مسلمانوں کا کمانڈر بھی فارسی جانتا تھا، فوج نے کہا: ألا ننهد إليهم: آپ اجازت دیں ہم ان پر دھاوا بول دیں، حضرت سلمانؓ نے فرمایا: ابھی رکو، مجھے نبی پاک ﷺ کے طریقہ پر عمل کرنے کا موقعہ دو، جنگ شروع کرنے سے پہلے آپؐ اسلام کی دعوت دیتے تھے، میں بھی پہلے ان کو اسلام کی دعوت دوں گا، چنانچہ حضرت سلمانؓ ساتھیوں کی ایک جماعت لے کر قلعے کے پاس گئے، وہ اوپر تھے یہ نیچے ہیں، آپس میں بات چیت ہوئی، وہ لوگ فارسی میں بول رہے ہیں اور حضرت عربی بول رہے ہیں، اِس کا ترجمہ اُدھر ہو رہا ہے اور اُس کا ترجمہ اِدھر ہو رہا ہے، حضرت سلمانؓ فارسی جانتے تھے مگر فارسی نہیں بول رہے، دوران گفتگو جب جزیہ کی دعوت دی تو آیت جزیہ پڑھی، حضرت نے خود پڑھی، اس آیت میں ﴿وَأَنْتُمْ صَاغِرُوْنَ﴾ آیا ہے، لوگ اس کا ترجمہ ایسا کرتے ہیں کہ سنتے ہی سامنے والے کے دماغ پر ہتھوڑا پڑتا ہے، ترجمہ یہ کرتے ہیں: درانحالیکہ تم ذلیل ہو، تو ذلیل ہونا کون پسند کرے گا؟ جب حضرت نے یہ آیت پڑھی تو ساری آیت کا ترجمہ تو مترجم نے کیا مگر ﴿وَأَنْتُمْ صَاغِرُوْنَ﴾ کا ترجمہ حضرت نے خود فارسی میں کیا جس کا عربی ترجمہ حدیث میں وَأنتم غير محمودين آیا ہے، یعنی تمہیں اسلام قبول کرنا چاہئے تا کہ ہمارے اور تمہارے حقوق برابر ہو جائیں، جزیہ قبول کر کے ہمارے ملک میں رہنا کوئی پسندیدہ بات نہیں، کتنا شاندار ترجمہ کیا، پھر آگے لمبی حدیث ہے۔ مجھے اس حدیث سے یہ بتانا ہے کہ حضرت سلمانؓ فارسی جانتے ہیں اور ﴿وَأَنْتُمْ صَاغِرُوْنَ﴾ کا ترجمہ وہ خود فارسی میں کر رہے ہیں، لیکن فارسی جاننے کے باوجود گفتگو آپ عربی میں فرما رہے ہیں، اس میں کوئی حکمت ہے تبھی آپ ایسا کر رہے ہیں، ایسا آپ بلاوجہ ایسا نہیں کر سکتے۔

امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد کا واقعہ

جس زمانہ میں ہندوستان میں انگریزوں کے ساتھ جنگ آزادی چل رہی تھی کانگریس

کے صدر مولانا ابوالکلام آزاد کسی معاملہ میں گفتگو کے لئے ہندوستان کے وائسرائے کے پاس تشریف لے گئے ،وائسرائے بہترین اردو جانتا تھا اور مولانا ابوالکلام آزاد بہترین انگریزی جانتے تھے، گفتگو شروع ہوئی، مولانا اردو میں بول رہے ہیں ،اور مترجم انگریزی میں ترجمہ کر کے وائسرائے کو سنا رہا ہے، وائسرائے انگریزی میں جواب دے رہا ہے،اور مترجم اردو میں ترجمہ کر کے مولانا کو سنا رہا ہے، سوچو آخر دونوں ایسا کیوں کر رہے ہیں؟ مولانا انگریزی جانتے ہیں تو انگریزی میں کیوں نہیں بولتے ان کو انگریزی میں گفتگو کرنی چاہئے تھی تا کہ وائسرائے پر رعب پڑے، اور وائسرائے اردو جانتا تھا تو وہ اردو میں کیوں نہیں بولتا؟ اس کو اردو بولنی چاہئے تھی تا کہ مولانا آزاد پر اس کی قابلیت کا کچھ اثر پڑے، مگر نہ تو وائسرائے اردو بولتا ہے اور نہ مولانا انگریزی بولتے ہیں، دوران گفتگو مترجم نے مولانا کی کسی بات کا صحیح ترجمہ نہیں کیا مولانا نے اسے ٹوکا کہ آپ ترجمہ میں جو بات کہہ رہے ہیں وہ میں نہیں کہہ رہا، میں یہ کہہ رہا ہوں ،وائسرائے بھی سب سمجھ رہا تھا کیونکہ وہ اردو جانتا تھا وائسرائے نے کہا: مولانا! جب آپ انگریزی جانتے ہیں تو مجھ سے انگریزی میں گفتگو کیوں نہیں کرتے ؟ دیکھو کہاں جا رہا ہے؟ مولانا بھی تو یہ کہہ سکتے تھے کہ جب آپ اردو جانتے ہیں تو مجھ سے اردو میں گفتگو کیوں نہیں کرتے ،مگر وہ نیچے اترنا نہیں چاہتا اس لئے مولانا سے کہہ رہا ہے کہ آپ براہ راست مجھ سے انگریزی میں گفتگو کیوں نہیں کرتے۔ مولانا آزاد نے جواب دیا: جناب! اگر میں آپ سے انگریزی میں گفتگو کروں تو میری انگریزوں سے لڑائی کیا رہی؟ جب میں ان کی زبان بولنے لگا تو اب میری ان سے کوئی لڑائی نہیں رہی، یہی وہ دور تھا جب ہندوستان کے بڑے بڑے مفتیوں نے فتوی دیا تھا کہ انگریزی سیکھنا حرام ہے ،انگریزی فوج میں ملازمت حرام ہے برطانیہ کی مصنوعات حرام ہیں ، یہ سب فتوے اس زمانہ کے تھے اور کسی ضرورت اور مصلحت سے تھے، کیونکہ جنگ آزادی چل رہی تھی اگر اس زمانہ میں ہم ان کی مصنوعات پہن رہے ہوں ،فوج میں بھی ملازمت کر رہے ہوں تو پھر ہماری انگریزوں کے ساتھ لڑائی کیا رہی؟

بہر حال مجھے اس واقعہ میں مولانا آزاد کا یہ جملہ سنانا تھا کہ اگر میں آپ سے انگریزی

میں گفتگو کروں تو میری انگریزوں سے لڑائی کیا رہی؟ اس واقعہ میں ٹھنڈے دل سے سوچو کہ وائسرائے اردو جاننے کے باوجود اردو کیوں نہیں بول رہا، مولانا انگریزی جاننے کے باوجود انگریزی کیوں نہیں بول رہے؟ اور حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ والے واقعہ میں حضرت سلمانؓ فارسی جاننے کے باوجود فارسی کیوں نہیں بول رہے؟ ﴿إِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَذِكْرٰى لِأُوْلِي الْأَلْبَابِ﴾ ان قصوں میں عقل رکھنے والوں کے لئے نصیحت ہے، اور سمجھنے والوں کے لئے سبق ہے، کوئی اگر نہ سمجھے تو میں کیا کروں۔

جو علاقے صحابہ نے فتح کئے وہ آج عرب ممالک ہیں

وہ علاقے جن کو صحابہ نے فتح کیا تھا وہ آج عرب ممالک ہیں، اور جو ملک صحابہ کے بعد فتح ہوئے وہ عرب ممالک نہیں بنے، یہ ہمارا ہندوستان، پاکستان، بنگلہ دیش، افغانستان، بخاری، سمرقند، تاشقند وغیرہ سارے علاقے صحابہ کے بعد فتح ہوئے اور عرب ممالک نہیں بن سکے کیونکہ صحابہ نے جو علاقے فتح کئے تھے وہاں ہر چیز میں عربی زبان داخل کی تھی، جب ہر چیز میں عربی زبان داخل کی تو لوگوں کو جھک مار کر عربی زبان سیکھنی پڑی، اور جب سارے لوگ عربی زبان سیکھنے پر مجبور ہوئے تو یہ علاقے عرب ممالک بن گئے، اور ہماری طرف کے علاقوں میں سندھ تک محمد بن قاسم آئے، آگے ان کی پیش رفت نہیں ہوئی ولید نے ان کو مروا دیا، بہت دنوں تک معاملہ یوں ہی رہا، پھر افغانستان کی طرف سے فاتحین آئے، وہ رنگون برما تک فتح کرتے چلے گئے، مگر فتح کرنے کے بعد انہوں نے زبان فارسی رکھی، وہ جب تک رہے فارسی خوب چلی، ہندو تک بہترین فارسی جانتے تھے، گلستان اور بوستان کی شرح ہندو کی بھی ہے، لیکن جب ان کی حکومتیں ختم ہوئیں تو فارسی سے کسی کو کیا دلچسپی ہوسکتی تھی چنانچہ ان کی زبان بھی ان کی حکومت کے ساتھ گئی، اگر انہوں نے عربی شروع کی ہوتی تو یہ سب ممالک عرب ہوتے، اس فرق کو سمجھو کہ جو علاقے صحابہ نے فتح کئے وہ آج عرب ملک ہیں اور صحابہ کے بعد جو فتح ہوئے وہ آج عرب ملک نہیں ہیں، کیونکہ صحابہ نے ہر چیز عربی میں رکھی تھی، خطبے عربی میں، قرآن عربی میں، نماز عربی میں، درس عربی میں، ہر چیز عربی میں

رکھی تو لوگوں کو لامحالہ عربی سیکھنی پڑی، اور سارے علاقے عربی بن گئے، اور بعد میں لوگوں نے اپنی اپنی زبانیں آگے بڑھائیں اور عربی کو پیچھے کردیا، نتیجہ میں ان کی زبانیں جب تک وہ رہے رہیں، وہ گئے تو ان کی زبان بھی گئی اور عربی پیچھے کی پیچھے رہ گئی۔ اس مسئلہ کو اور سمجھو۔

مقام نمود میں زبان کا ظہور ضروری ہے

ہر مذہب اور ہر حکومت کی ایک زبان ہوتی ہے، اور نمود کی جگہوں میں اسی کو سامنے لانا پڑتا ہے، اگر ایسا کریں گے تو وہ حکومت چلے گی اور وہ مذہب باقی رہے گا، اور اگر حکومت کی زبان نمود کی جگہوں میں نہ لائی گئی، مذہب کی زبان نمود کی جگہوں میں نہ لائی گئی تو نہ وہ حکومت باقی رہے گی اور نہ وہ مذہب، اس کی مثال لو! ہندوازم بہت پرانا مذہب ہے، کتنا پرانا؟ اللہ ہی بہتر جانتے ہیں کتنا پرانا ہے! کچھ محققین کا خیال ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کے لڑکوں پر جو کتابیں نازل ہوئی تھیں انہی کتابوں کے یہ ماننے والے ہیں ان کے بعد کوئی نبی ان میں نہیں آیا، یہ بات صحیح ہو یا نہ ہو، بہر حال اتنی بات صحیح ہے کہ یہ بہت پرانا مذہب ہے ان کی مذہبی زبان سنسکرت ہے، مگر ایک لمبے عرصے سے نمود کی جگہوں میں سنسکرت نہیں رہی چنانچہ دنیا سے سنسکرت مٹ گئی، آج کل ہندوستانی حکومت اس زبان کو زندہ کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہی ہے اس کے لئے یونیورسٹیاں قائم کی ہیں مگر کہیں دو چار سادھو اس زبان کو جانتے ہوں تو جانتے ہوں ورنہ عام ہندو اس زبان کو نہیں جانتے، ایسا مقام نمود میں اس زبان کو نہ لانے کی وجہ سے ہوا ہے۔ یہ یہودی اور عیسائی ہیں ان کی تورات اور انجیل سریانی زبان میں نازل ہوئی تھیں لیکن آج پوری دنیا میں سریانی زبان کہیں نہیں، یہود و نصاری بھی نہیں جانتے، پھر دوسری زبان آئی ہبرو یعنی عبرانی، یہ زبان باقی ہے اور ان کی تالمود وغیرہ عبرانی زبان میں ہیں، مگر ان کے زیادہ تر بشپ اور پادری عبرانی بھی نہیں جانتے، کیونکہ یہ زبان بھی نمود کی جگہوں میں نہیں آئی، چنانچہ زمانہ آگے بڑھا تو ان زبانوں کی حفاظت کرنے والا کوئی نہیں رہا، اور جب مذہب کی بنیادی زبان ختم ہو جائے تو مذہب اپنی اصلی حالت پر باقی نہیں رہ سکتا، اسی وجہ سے ہندوازم اور یہودیت و عیسائیت آج اپنی اصلی

حالت پر باقی نہیں رہے۔

دوسری مثال: اور یہ تو آپ جانتے ہیں کہ دنیا میں ہر حکومت کی ایک سرکاری زبان ہوتی ہے، اور ملک میں دیگر رائج زبانوں کو بھی حکومت قبول کرتی ہے، جیسے ہندوستان میں سرکاری زبان ہندی ہے اور اس کے علاوہ چودہ زبانیں ہیں جن کو حکومت نے مان رکھا ہے اور نوٹ پر وہ چودہ زبانیں لکھی جاتی ہیں مگر سرکاری زبان ایک ہی ہے اور وہ ہندی ہے، اور ہندوستان کا جو جنوبی علاقہ ہے، تمل ناڈو، مدراس، کیرالہ وغیرہ وہاں کوئی ہندی کا ایک لفظ نہیں جانتا، وہاں ان کی اپنی زبانیں بولی جاتی ہیں، لیکن اگر آپ وہاں جائیں اور ٹرین اسٹیشن پر پہنچ کرر کے تو آپ دیکھیں گے کہ بورڈ پر سب سے اوپر ہندی میں نام لکھا ہوگا پھر نیچے انگریزی اور مقامی زبانوں میں لکھا ہوگا، یہی ہے مقام نمود میں زبان کو ظاہر کرنا، اسی طرح سے کورٹ میں، دفتروں میں، ہر جگہ مقامی زبان سے اوپر آپ کو ہندی ملے گی، اگر سرکاری زبان ہندی اس طرح مسلط نہیں کی جائے گی تو پورا ہندوستان ایک حکومت کے ماتحت نہیں رہے گا، مقامی زبانوں کے حساب سے الگ الگ ٹکڑوں میں بٹ جائے گا۔

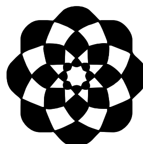
یہ جو دو مثالیں میں نے دی ہیں ان کو سامنے رکھو اور غور کرو کہ اسلام کی مذہبی زبان کونسی ہے؟ عربی ہے! پس اس کو باقی رکھنے کے لئے نمود کی جگہوں میں اس کو لانا ضروری ہے، نمود کی جگہیں کیا ہیں؟ ہر ساتویں دن جمعہ کا خطبہ ہوتا ہے اور امام صاحب ڈٹ کر خطبہ دیتے ہیں، مگر سمجھ کوئی نہیں رہا، ہاں اتنا سب سمجھ رہے ہیں کہ یہ ہماری زبان ہے، امام صاحب نماز میں عربی میں قراءت کرر ہے ہیں، مسجد میں کوئی نہیں سمجھ رہا مگر سب یہ سمجھ رہے ہیں کہ یہ ہمارا قرآن ہے اور اسی زبان میں یہ نازل ہوا ہے، عیدین کے اجتماع سال میں دو دفعہ ہوتے ہیں جب خطیب کھڑا ہو کر عربی میں دندناتا ہے تو چاہے لوگ کچھ نہ سمجھیں مگر اتنا سب سمجھیں گے کہ یہ ہماری مذہبی زبان ہے، اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ کسی کہنے والے نے کہا ہے: **نزل القرآن في الحجاز**: قرآن حجاز میں اترا، **وقرئ في مصر**: مصری جتنا شاندار قرآن پڑھتے ہیں اتنا شاندار دنیا میں کوئی نہیں پڑھتا، **وفُهِمَ في الهند**: اور متحدہ ہندوستان میں سمجھا گیا، عرب ممالک کے لوگوں نے قرآن کو اتنا نہیں سمجھا جتنا ہندوستان والوں نے سمجھا کیونکہ یہاں

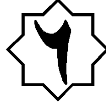
لوگوں نے عربی زبان پر محنت کی رات دن اس کے پیچھے لگے رہے تب جا کر وہ زبان کو سمجھنے والے بنے، آپ پوری دنیا کا سروے کریں آپ کو عرب ممالک میں قرآن وحدیث کے سمجھنے والے ایسے نہیں ملیں گے جیسے عجمی ممالک میں آپ کو مل جائیں گے، یہ برکت ہے اس بات کی کہ ہمارا عربی کے ساتھ ایک جذباتی تعلق ہے، یہ ہمارے مذہب کی زبان ہے اور ہم اس کو گلے لگائے ہوئے ہیں، اپنی زبان سیکھنے پر عرب وہ محنت نہیں کرتے جو ہم عربی سیکھنے پر کرتے ہیں، اور یہ جذباتی تعلق اس وقت تک باقی رہتا ہے جب تک کہ جگہ جگہ اس کا نمود ہو۔

خلاصہ کلام

بات کا خلاصہ یہ ہے کہ جمعہ اور عیدین کے خطبے نمود کی جگہیں ہیں، اور جب یہ نمود کی جگہیں ہیں تو یہاں مذہب کی جو اصل زبان ہے وہ استعمال ہوگی تاکہ یہ زبان زندہ رہے اور مذہب اسلام اپنی اصلی تعلیمات پر باقی رہے، صحابہ نے اپنے سوسالہ دور میں کہیں ایک دفعہ بھی غیر عربی زبان میں خطبہ نہیں دیا جبکہ ان علاقوں میں نئے مسلمان ہونے والوں کو مقامی زبان میں نصیحت کرنے کی آج سے زیادہ ضرورت تھی، اور اس وقت سے لے کر آج تک ساری دنیا میں خطبے عربی میں ہی ہو رہے ہیں، کوئی کہیں یہ نہیں کہتا کہ عربی کے علاوہ مقامی زبان میں خطبہ دو، بس یہ امریکہ والے ہی انگریزی کی محبت میں بہکے چلے جا رہے ہیں، برطانیہ میں، کناڈا میں، یورپ کے دیگر ملکوں میں کہیں یہ مسئلہ نہیں، یہ مسئلہ صرف امریکہ میں ہے، میرے بھائیو! انگریزی کی محبت کی جگہ عربی کی محبت دل میں بڑھاؤ، اس سے ایمان بھی مضبوط ہوگا اور مذہب کی بنیادی زبان بھی زندہ رہے گی اور جب زبان زندہ رہے گی تو اسلام کی تعلیمات بھی اپنی اصلی حالت پر باقی رہیں گی، ورنہ اگر زبان مر گئی تو اسلام کا بھی وہی حال ہو جائے گا جو آج ہندوازم اور یہودیت وعیسائیت کا ہو چکا ہے۔

وآخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمين





مسجد میں باتیں نہ کرنا
اور
تکبیر شروع ہونے پر نماز کے لئے کھڑا ہونا

خطبہ مسنونہ کے بعد: ﴿وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَائِرَ اللّٰهِ فَإِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ﴾

بزرگو اور بھائیو! آج کوئی خاص تقریر نہیں کرنی بس دو ضروری باتیں عرض کرنی ہیں، ان میں سے پہلی بات یہ ہے کہ اس ملک کی مسجدوں کا نظام صحیح نہیں، کمیونٹی سینٹر اور مسجدوں کا ایک ہی حال ہے، جب لوگ مسجدوں میں آتے ہیں تو باہر اور مسجد میں کوئی فرق نہیں ہوتا، جیسے کمیونٹی سینٹر میں پہنچ کر لوگ باتیں کرتے ہیں اسی طرح مسجدوں میں بھی باتیں کرتے ہیں، یہ غلط طریقہ ہے، اللہ پاک سورۃ الحج میں ارشاد فرماتے ہیں: ﴿وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَائِرَ اللّٰهِ فَإِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ﴾: جو شخص اللہ کے دین کی امتیازی نشانیوں کی تعظیم کرتا ہے، تو یہ تعظیم کرنا اس کے دل میں پرہیزگاری کی وجہ سے ہوتا ہے، جس دل میں تقوی اور پرہیزگاری ہوتی ہے وہی شعائر اللہ (اللہ کی دین کی امتیازی نشانیوں) کی تعظیم کرتا ہے۔

شعائر اللہ کیا ہیں؟

ہر وہ چیز جس کو دیکھ کر فوراً سمجھ لیا جائے کہ یہ چیز فلاں مذہب سے تعلق رکھتی ہے تو وہ اس مذہب کا شعار ہے، جیسے چرچ پر منارہ اور صلیب دیکھ کر ہر آدمی سمجھ جاتا ہے کہ یہ چرچ ہے، یہ عیسائیت کا شعار ہے۔ یہودیوں کا شعار چھ کونوں والا تارہ ہے، اس کو دیکھ کر آدمی فوراً سمجھ جاتا ہے کہ یہ دوکان، یہ گھر، یہ عبادت خانہ یہودیوں کا ہے، یہ یہود کا شعار ہے۔ مندر کی ایک

خاص بناوٹ ہے، ہندو عورت مانگ میں سندور لگاتی ہے، مرد قشقہ لگاتا ہے اور ایک خاص انداز سے دھوتی پہنتا ہے، ان چیزوں کو دیکھ کر آپ فوراً سمجھ جائیں گے کہ یہ ہندو ہے، یہ سب شعائر الہنود ہیں۔ اسی طریقہ پر اسلام کے بھی کچھ شعائر ہیں جن کو دیکھ کر ہر آدمی فوراً سمجھ جاتا ہے کہ یہ مذہب اسلام سے تعلق رکھنے والی چیز ہے، یہ: شعائر اللہ ہیں، اللہ کے دین کی امتیازی نشانیاں ہیں۔

شعائر اللہ کتنے ہیں؟

شعائر اللہ بہت ہیں، بڑے شعائر چار ہیں، قرآن، کعبہ، نبی اور نماز، کعبہ صرف اسلام کے پاس ہے کسی اور مذہب کے پاس کعبہ نہیں، قرآن مسلمانوں کی متبرک کتاب ہے، ہر آدمی جانتا ہے، نبی بھی شعائر اللہ میں سے ہے، کیونکہ آج دنیا میں اسلام کے علاوہ کوئی مذہب نہیں جو نبی کا صحیح تصور رکھتا ہو۔ برطانیہ میں ایک مرتبہ ہم یہودیوں کی عبادت دیکھنے کے لئے باقاعدہ وقت لے کر ان کے عبادت خانہ (سینیگوگ) میں گئے، ہم نے ان کی نماز دیکھی، نماز کے بعد ہم نے ان کے امام سے پوچھا: موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں تمہارا کیا عقیدہ ہے؟ اس نے جواب دیا: صرف معلّم! استاذ تو دنیا میں کروڑوں ہیں۔ ان کا اپنے نبی کے بارے میں نبی کا کوئی تصور نہیں، عیسائیوں کا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں اللہ کا بیٹا ہونے کا تصور ہے، وہ بھی نبی کا کوئی تصور نہیں رکھتے، ہندو اپنے بڑوں کے بارے میں اوتار کا تصور رکھتے ہیں نبی کا نہیں رکھتے، اوتار کا مطلب یہ ہے کہ جب زمین شر و فساد سے بھر جاتی ہے تو اللہ تعالی انسان بن کر دنیا میں پیدا ہوتے ہیں، پھر آہستہ آہستہ بڑے ہوتے ہیں اور بڑے ہو کر دنیا سے سب برائیاں ختم کرتے ہیں پھر مر جاتے ہیں اور مر کر اپنی جگہ چلے جاتے ہیں، تو ان کے یہاں بھی نبی کا کوئی تصور نہیں، نبی کا صحیح تصور صرف اسلام میں ہے۔

نبی کا صحیح تصور

وہ صحیح تصور کیا ہے؟ أَشْهَدُ أَن محمدا عبده ورسوله: میں اس بات کی گواہی دیتا

ہوں کہ حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔ دو چیزوں کو جمع کرنا نبی کا صحیح تصور ہے، اسلام حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر خاتم النبین ﷺ تک سب نبیوں کے بارے میں یہی تصور رکھتا ہے کہ یہ سب انسان تھے جیسے ہم انسان ہیں، ہمارے درمیان اور ان کے درمیان انسان ہونے کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں تھا، ہماری دو آنکھیں ہیں نبیوں کی بھی دو آنکھیں تھیں، ہمارے دو کان دو ہاتھ ایک منھ اور ایک ناک ہے نبیوں کے بھی یہی سب اعضاء تھے، ہم کھاتے ہیں، پیتے ہیں، بازار جاتے ہیں، انبیاء بھی کھاتے پیتے اور بازار جاتے تھے، انسان ہونے کے ناتے ہم میں اور نبیوں میں کوئی فرق نہیں تھا۔

پھر فرق کیا تھا؟ ان کو ایک بہت بڑا عہدہ مل گیا تھا، وہ عہدہ: نبوت اور رسالت کا عہدہ ہے، یہ اتنا بڑا عہدہ ہے کہ انہیں کو ملا ہے، دوسرا چاہے جتنی بھی محنت کرلے اس کو یہ عہدہ نہیں مل سکتا، جیسے کسی ملک کا صدر، وزیر اعظم اور بادشاہ ہوتا ہے، ان میں اور عوام میں انسان ہونے کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں ہوتا لیکن فرق ہوتا ہے کہ وہ ملک کا صدر ہے، وزیر اعظم ہے، بادشاہ ہے، یہ ان کا مرتبہ ہے اور یہ مرتبہ انہی کو حاصل ہے، دوسرے کسی کو حاصل نہیں۔

اسی طریقہ پر اسلام کا تصور تمام نبیوں کے بارے میں یہ ہے کہ وہ انسان تھے اور اللہ نے ان کو ایک بہت بڑا عہدہ دیا تھا، **أشهد أن محمداً عبده ورسوله** کا یہی مطلب ہے: میں اس بات کی گواہی دیتا ہوں کہ حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ اللہ کے بندے ہیں، وہ کوئی خدا نہیں، وہ کوئی خدا کے بیٹے نہیں، وہ کوئی مافوق الفطرت شخصیت نہیں، آدم علیہ السلام کی ساری اولاد جیسے انسان تھی وہ بھی انسان تھے، مگر وہ اللہ کے رسول ہیں اور تمام رسولوں کے سردار ہیں، یہ بہت بڑا عہدہ اللہ نے ان کو دے رکھا تھا۔ سب نبیوں کے بارے میں اسلام کا یہی تصور ہے، اور یہی نبوت کا صحیح مفہوم ہے۔ اور یہ صحیح مفہوم صرف اسلام میں ہے، اس کے علاوہ اور کسی مذہب میں نبوت کا صحیح مفہوم نہیں، اس لئے نبی بھی شعائر اللہ میں سے ہے۔

اور چوتھی چیز ہے: نماز، دنیا کے تمام مذاہب اللہ کی بندگی کرتے ہیں بلکہ یہود و نصاری تو نماز پڑھتے ہیں، لیکن اللہ کی بندگی اور نماز پڑھنے کا جو طریقہ مسلمانوں کا ہے وہ عیسائیوں اور یہودیوں کے یہاں نہیں، اگر آپ سڑک کے کنارہ پر، پلیٹ فارم پر، بس اسٹینڈ پر کسی آدمی کو

مصلی بچھا کر اللہ کی بندگی کرتے ہوئے دیکھیں تو آپ دیکھتے ہی فوراً سمجھ جائیں گے کہ یہ مسلمان ہے۔

الغرض اسلام کے بڑے شعائر چار ہیں: قرآن، کعبہ، نبی اور نماز۔ ان کے علاوہ اور بھی چھوٹے چھوٹے شعائر ہیں، قربانی کے جانور بھی شعائر ہیں، ہدی کے جانوروں کو بھی شعائر اللہ کہا گیا ہے، اسی طریقہ پر مسجدیں بھی شعائر اللہ ہیں کہ ان کو دیکھ کر ہر آدمی سمجھ جاتا ہے کہ یہ مسلمانوں کی عبادت گاہ ہے، بلکہ مسجد کے مَنارے جو ایک خاص انداز سے اٹھائے جاتے ہیں وہ بھی شعائر اللہ ہیں۔ ان کو دیکھ کر بھی آدمی مسجد کو پہچان لیتا ہے۔ اور شعائر اللہ کے بارے میں اللہ پاک کا ارشاد ہے: ﴿وَمَنْ يُعَظِّمْ شَعَائِرَ اللّٰهِ فَإِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ﴾: جو شخص اللہ کے دین کی امتیازی نشانیوں کی تعظیم کرتا ہے تو یہ تعظیم کرنا اس کے دل میں تقوی ہونے کی وجہ سے ہے۔

شعائر اللہ کی تعظیم کیا ہے؟

شعائر اللہ کی تعظیم کا کوئی ایک متعین طریقہ نہیں، ہر علامت کی تعظیم اس کے شایان شان کی جاتی ہے، پس قرآن کی تعظیم کے طریقے الگ ہیں، کعبہ کی تعظیم کے طریقے الگ ہیں، نبی کی تعظیم کے طریقے الگ ہیں، نماز کی تعظیم کے طریقے الگ ہیں، قربانی کی تعظیم کے طریقے الگ ہیں، مسجدوں کی تعظیم کے طریقے الگ ہیں۔ غرض شعائر اللہ کی تعظیم کا کوئی ایک متعین طریقہ نہیں۔

کعبہ شریف کی تعظیم یہ ہے کہ اس کا طواف کرو، اس کی طرف منھ کر کے نماز پڑھو، اس کی طرف پیر نہ کرو، استنجے کے وقت اس کی طرف منھ کرو نہ پیٹھ۔

قرآن کی تعظیم یہ ہے کہ آپ بے وضو اس کو ہاتھ نہ لگائیں، بے وضو قرآن پڑھ تو سکتے ہیں لیکن ہاتھ نہیں لگا سکتے، ایسا کیوں ہے؟ جب بے وضو ہاتھ لگانا جائز نہیں تو پڑھنا بھی ناجائز ہونا چاہئے۔ جواب یہ ہے کہ ایسا ضرورت کی بنا پر ہے، مکتبوں اور مدرسوں میں صبح سے شام تک اساتذہ اور طلبہ قرآن پڑھتے اور پڑھاتے ہیں، اگر یہ شرط لگا دی جائے کہ پڑھنے

کے لئے بھی وضوضروری ہے تو مکتبوں کا سارا نظام درہم برہم ہوجائے گا، صبح سے شام تک اساتذہ باوضو کیسے بیٹھیں گے؟ اسی طرح سے ہر مسلمان کو جب بھی موقعہ ملے تلاوت کرنی چاہئے، وضو کی شرط لگادیں گے تو ہر وقت تلاوت نہیں ہوسکے گی۔ اس لئے شریعت نے ضرورت کی وجہ سے اتنی گنجائش رکھی جنابت کی حالت میں قرآن پڑھنا تو حرام ہے، کیونکہ یہ حالت کبھی کبھی پیش آتی ہے، اور بے وضو ہونے کی حالت میں زبانی قرآن پڑھنے کی اجازت دیدی کہ یہ حالت بار بار پیش آتی ہے۔ الغرض قرآن کی تعظیم یہ ہے کہ آپ بے وضو اس کو ہاتھ نہ لگائیں۔

قرآن ہاتھ سے گر جائے تو اس کا کفارہ کیا ہے؟

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ نادانی میں قرآن ہاتھ سے گر جاتا ہے، لوگ پوچھتے ہیں: اس کا کفارہ کیا ہے؟ جواب یہ ہے کہ اس کا کوئی کفارہ نہیں، نادانی میں قرآن کا ہاتھ سے گر جانا کوئی گناہ نہیں اور کفارہ گناہ کا ہوتا ہے۔ گناہ کیوں نہیں؟ حدیث شریف میں ہے: **رُفع عن أمتی الخطأُ والنسیان وما استکرھوا علیہ**: میری امت سے تین باتیں اٹھادی گئی ہیں، یعنی ان کا کوئی گناہ نہیں، ایک: چوک، دوسری: بھول، تیسری: زبردستی کرایا ہوا کام۔ تو ان تین کا کوئی گناہ نہیں چوک: جیسے شکاری نے خرگوش کو گولی ماری اور جس کو وہ خرگوش سمجھ رہا تھا وہ آدمی نکلا اور وہ گولی آدمی کو جا لگی تو اس قتل کا کوئی گناہ نہیں، دیت تو آئے گی لیکن اس کو اس قتل کا کوئی گناہ نہیں ہوگا۔ اسی طریقہ سے بھول ہے، بھول کی وجہ سے کہیں تو عبادت بھی نہیں ٹوٹتی اور گناہ بھی نہیں ہوتا، اور کہیں عبادت تو ٹوٹ جاتی ہے مگر گناہ نہیں ہوتا، دوران نماز اگر کسی نے بھولے سے کسی شخص کے سلام کا جواب دیدیا تو نماز ٹوٹ جائے گی مگر گناہ نہیں ہوگا روزہ کی حالت میں بھولے سے کچھ کھا پی لیا تو اس سے روزہ نہیں ٹوٹا اور گناہ بھی نہیں ہوا۔ بہرحال بھول میں کہیں عبادت ٹوٹ جاتی ہے اور کہیں نہیں ٹوٹتی اور گناہ دونوں صورتوں میں نہیں ہوتا۔

اور تیسری چیز ہے: زبردستی کوئی کام کروانا: جیسے مباح چیزوں میں اللہ کو سب سے زیادہ

ناپسند طلاق ہے، دو چار آدمیوں نے پکڑا اور جان سے مارنے کی دھمکی دے کر کسی سے طلاق دلوائی، اس نے جان بچانے کی لئے طلاق دیدی، تو اس طلاق میں کوئی گناہ نہیں، بے ضرورت آدمی طلاق دے تو اس کا گناہ ہوگا، اسی طرح حالت حیض میں اگر طلاق دی تو گناہ گار ہوگا، لیکن زبردستی کرنے میں گناہ نہیں ہوگا، البتہ طلاق پڑ جائے گی۔

غرض شریعت میں چوک کا، بھول کا اور زبردستی کوئی کام کروایا گیا ہو تو اس کا کوئی گناہ نہیں، جب یہ بات ہے تو ہاتھ سے جو قرآن کریم گرا ہے اس کی دو ہی شکلیں ہو سکتی ہیں، یا تو چوک گیا ہے یا بھول گیا ہے، کوئی مسلمان سلامتی ہوش و حواس کے ساتھ ایسا کام نہیں کرسکتا، بھول سے گرے گا یا چوک سے گرے گا، یہی دو شکلیں ہیں ان کے علاوہ اور کوئی شکل نہیں، اور ان دونوں شکلوں میں کوئی گناہ نہیں، اور جب گناہ نہیں تو کفارہ بھی نہیں؟

اور اگر کسی نالائق نے جان بوجھ کر قرآن کو نیچے ڈالا تو یہ اتنا بڑا گناہ ہے کہ اس کا کوئی کفارہ توبہ کے علاوہ نہیں، جیسے یمین غموس میں کوئی کفارہ نہیں، گذرے ہوئے زمانہ کی کسی بات پر جھوٹی قسم کھانا اتنا بڑا گناہ ہے کہ اس سے بڑا کوئی گناہ نہیں ہوسکتا، اس لئے کوئی کفارہ نہیں ہے علاوہ توبہ کے، اسی طریقہ پر قرآن کو جان بوجھ کر پٹخنا بھی اتنا بڑا گناہ ہے کہ اس کے لئے کوئی کفارہ ممکن نہیں، توبہ کرے اور سچی پکی توبہ کرے تو ہی گناہ معاف ہوگا۔

بہرحال غلطی سے، نادانی سے کبھی قرآن گر جائے تو اس کا کوئی کفارہ نہیں۔ لیکن اگر کوئی اپنے دل پر سے بوجھ ہٹانے کے لئے کچھ صدقہ وخیرات کرنا چاہے تو کرے، ضرور کرے، کیونکہ ایسا واقعہ پیش آنے کی صورت میں مؤمن کے دل پر ایک بوجھ پڑتا ہے اور صدقہ کرنے سے وہ بوجھ ہٹ جاتا ہے، باقی مسئلہ کی رو سے اس پر کوئی کفارہ نہیں۔

خیر قرآن کی تعظیم یہ ہے کہ اس کو بے وضو ہاتھ نہ لگایا جائے۔ نبی کی تعظیم یہ ہے کہ اس کا احترام دل میں ہو، اور جب بھی نبی کا نام لے تو صلوۃ بھیجے یا سلام بھیجے، موسیٰ نے کہا، یوں نہ کہو۔ یوں کہو: حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ فرمایا، ہر نبی کا احترام دل میں ہونا چاہئے اور یہ احترام جو دل میں ہے وہ زبان اور عمل سے ظاہر بھی ہونا چاہئے، ایسے ہی ہمارے آقا حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کا جب نام آئے درود پڑھے، صلوۃ وسلام بھیجے، یہ نبی کی تعظیم میں داخل ہے۔

بعض لوگ اتنا جلدی درود پڑھتے ہیں کہ وہ غیر واضح ہوتا ہے، اس طرح درود شریف پڑھنے کا کیا فائدہ؟ مزے لے کر اور واضح درود شریف پڑھنا چاہئے، واضح صلوۃ وسلام بھیجنا اس بات کی علامت ہے کہ اس کے دل میں اس شخصیت کا احترام ہے۔

نماز کی تعظیم یہ ہے کہ جب آپ نماز پڑھنے کے لئے کھڑے ہوں تو لکڑی بن جائیں، آج کل ہماری نمازیں ایسی ہوگئی ہیں کہ بس ان کا اللہ ہی مالک ہے، نیت باندھتے ہی سارے بدن میں کھجلی شروع ہو جاتی ہے، کبھی ادھر کھجائیں گے کبھی ادھر، پہلے کہیں کھجلی نہیں تھی، جہاں نیت باندھی کہ چاروں طرف کھجلی ہی کھجلی۔ نماز سے پہلے صحیح تھے، نیت باندھتے ہی جمائیاں شروع ہوگئیں، حدیث شریف میں ہے: **التثاؤب فی الصلوۃ من الشیطان:** نماز شروع کرنے کے بعد جو جمائیاں شروع ہو جاتی ہیں یہ شیطان کے اثر سے ہیں۔ نیت بندھی ہوئی ہوگی اور چاروں طرف دیکھیں گے، ہماری نمازوں کی یہ جو صورت حال ہے وہ اس وجہ سے ہے کہ ہمارے دل میں نماز کی تعظیم نہیں، بس ایک وظیفہ ہے جس کو ہم پورا کر دیتے ہیں۔

نماز کی تعظیم یہ ہے کہ جب آپ کھڑے ہوں تو ایسے مستغرق ہو جائیں کہ آپ کو نہ اپنے بدن کا ہوش رہے، نہ چاروں طرف کا، پوری طرح اللہ کی طرف متوجہ ہو کر نماز پڑھ رہے ہوں یہ نماز کی تعظیم ہے۔

قربانی اور ہدی کے جانور بھی شعائر اللہ ہیں، ان کی تعظیم یہ ہے کہ ان کی خدمت کرو، خوب کھلاؤ پلاؤ، نہلاؤ دھلاؤ۔ مسجدوں کی تعظیم یہ ہے کہ اپنے گھروں سے اچھا اللہ کا گھر بناؤ اور مسجد میں آتے ہی دو رکعت تحیۃ المسجد پڑھو، نبی پاک ﷺ کا ارشاد ہے: **إذا مررتم بریاض الجنة فارتعوا:** جب تم جنت کی کیاریوں سے گذرو تو چرو، جیسے جانور ہری بھری کیاری پر سے گذرتے وقت منھ مارتا ہے تم بھی جنت کی کیاریوں پر منھ مارو، اور جنت کی کیاریاں مسجدیں ہیں، اور چرنا یہ ہے کہ مسجد میں آتے ہی دو رکعت تحیۃ المسجد پڑھے، مکروہ وقت ہو تو الگ بات ہے، وضو نہ ہو تو الگ بات ہے، لیکن اگر باوضو ہو اور مکروہ وقت بھی نہ ہو تو جب بھی مسجد میں داخل ہو دو رکعت تحیۃ المسجد پڑھے، یہ مسجد کا احترام ہے۔

مسجد میں باتیں کرنا نیکیوں کو کھا جاتا ہے

حدیث شریف میں ہے: إیاکم وھیشات الأسواق: مارکیٹ میں جس طرح باتیں اور شور ہوتا ہے اس طرح باتیں اور شور کرنے سے مسجدوں میں بچو، کسی بڑے آدمی کے پاس جب لوگ جاتے ہیں تو سب خاموش بیٹھتے ہیں، یہ بڑے آدمی کا ادب ہے، مسجد کا بھی یہ ادب ہے کہ مسجد میں جاتے ہی باتیں بند ہو جانی چاہئیں کیونکہ وہ اللہ کے گھر ہیں۔

مگر میرے بھائیو! اس ملک کی صورت حال بہت بگڑی ہوئی ہے، اس ملک میں لوگ مسجدوں کو کمیونٹی سینٹر سمجھتے ہیں، یہ ٹھیک نہیں، حدیث شریف میں ہے کہ مسجد میں دنیا کی باتیں کرنے سے نیکیاں اس طرح خاکستر ہو جاتی ہیں جس طرح سوکھی لکڑی میں آگ لگنے سے خاکستر ہو جاتی ہے، نیکی ندارد گناہ لازم! اللہ جانے مسجد میں سے نیکیاں ملیں یا نہیں، گناہ کا گٹھر ضرور مل گیا۔

مسجدوں کو باتوں سے بچانے کا طریقہ

مسجدوں میں لوگ باتیں کیوں کرتے ہیں؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ لوگ دور دور سے کبھی کبھی نماز پڑھنے آتے ہیں، مستقل نمازی تو پانچ سات ہوتے ہیں، ایسے نمازی مسجد میں باتیں نہیں کرتے، جب دور دور سے کبھی کبھی نمازیں پڑھنے کے لئے آئیں گے تو ایک دوسرے سے ملاقات پر خیریت تو پوچھیں گے ہی، کچھ کاروبار کا حال بھی پوچھیں گے، کچھ ادھر ادھر کی باتیں بھی کریں گے، یہ وجہ ہے مسجدوں میں باتیں کرنے کی۔

آپ کہیں گے کہ یہ تو واقعی ایک ضرورت ہے، جب دور دراز سے کافی دنوں کے بعد اکٹھا ہوئے ہیں تو باتیں تو کریں گے ہی، باتوں کی لئے کچھ موقع تو ملنا چاہئے۔ صحیح بات ہے، موقع ملنا چاہئے، مگر اس کے لئے انتظام کرنا چاہئے۔ یہ رہا آپ کا برطانیہ، آپ کے ملک جتنا ترقی یافتہ، میں برطانیہ پچیس سال سے جا رہا ہوں، پہلے وہاں بھی یہی صورت حال تھی، جب ہم نے ان کو سمجھایا تو انہوں نے آہستہ آہستہ اس پر قابو پا لیا، کیسے پایا؟ مسجد کا ہال الگ کر دیا اور مسجد کے ہال سے باہر پیسیج بنا دیا، اگرچہ جمعہ کے دن اس پیسیج میں بھی نماز ہوگی مگر اس کو

باقاعدہ مسجد میں نہیں لیا، اب جس کو افطاری کرنی ہے پیسج میں کرے، باتیں کرنی ہے پیسج میں کرے، اور مسجد کے ہال میں قدم رکھتے ہی چپ ہو جائے، اب کوئی بات نہ کرے، یہ مسجدوں کو لوگوں کی باتوں سے بچانے کا ایک طریقہ ہے۔ ابھی مسجدوں کے تعلق سے یہاں اتنی ترقی نہیں ہوئی، ان شاء اللہ ایک وقت آئے گا کہ یہاں بھی یہ نظام بن جائے گا، فی الحال تو کرنا یہ ہے کہ یہ نظام بننے سے پہلے مسجد میں باتیں کرنے سے احتیاط برتو، باتیں کرنی ہوں تو باہر نکل کر جہاں وضوخانہ ہے وہاں جا کر کرو۔ ایک بات تو یہ عرض کرنی تھی۔

اور یہ طریقہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنایا تھا، آپؓ نے مسجدِ نبوی کی مشرقی جانب میں ایک جگہ خاص کی تھی، جس کو بُطَیْحَاء کہا جاتا تھا، اور لوگوں کو حکم دیا تھا: **من أراد أن يلغط، أو يرفع صوتا، أو يُنْشِد شعرا، فليخرج إليه** (وفاء الوفاء ج ۱ ص ۳۵۳) یعنی جو شوروغل کرنا چاہے، یا زور سے بولنا چاہے، یا زور سے شعر پڑھنا چاہے، وہ مسجدِ نبوی سے اس جگہ میں جائے (اور یہ کام کرے)

اس سے معلوم ہوا کہ مسجد سے باہر ایسی جگہ ہونی چاہئے، پھر لوگوں سے کہا جائے کہ مسجد میں دنیوی باتیں نہ کریں، پیسج میں جا کر کریں تو لوگ مان جائیں گے، بلکہ یہاں کے لوگ تو سمجھدار ہیں، کہنے کی ضرورت بھی پیش نہیں آئے گی

(دوسری بات)

اقامت کا غلط طریقہ

دوسری بات یہ عرض کرنی ہے کہ ہمارے یہاں اقامت کا طریقہ غلط چلا ہوا ہے، جب نماز شروع ہونے کا وقت آئے گا تو سب سے پہلے امام صاحب مصلے پر آئیں گے، لوگ کھڑے ہو جائیں گے، جب صفیں سیدھی ہو جائیں گی تب تکبیر شروع ہوگی، یہ جو سلسلہ چلا ہوا ہے یہ غلط ہے۔ بریلویوں کے یہاں اس کا الٹا ہے، تکبیر کہنے والا کھڑا ہو کر تکبیر شروع کرے گا، باقی سب بیٹھے رہیں گے، جب وہ حی علی الصلوۃ کہے گا تب لوگ کھڑے ہونگے اور اب امام صاحب اٹھ کر مصلے پر آئیں گے۔ ان کے یہاں حی علی الصلوۃ سے پہلے کوئی کھڑا ہو جائے تو

اس کو بہت برا سمجھتے ہیں۔ بریلویوں کا یہ طریقہ بھی غلط ہے اور ہمارا طریقہ بھی غلط ہے۔

کھڑا کب ہونا چاہئے؟

عربی میں تکبیر کو اقامہ کہتے ہیں، اور اقامۃ کے معنی ہیں: کھڑا کرنا، میں نے آپ سے کہا: اٹھ بھئی! یہ کھڑا کرنا ہے، اب اٹھ بھئی کہنے کے بجائے اللہ کا ذکر رکھ دیا، وہ ذکر سنتے ہی لوگ سمجھ جاتے ہیں کہ یہ ہمیں نماز کے لئے کھڑا کر رہا ہے، تو اقامہ کے معنی ہیں کھڑا کرنا، اب میرے بھائیو سوچو! جب تک اقامہ (کھڑا کرنا) نہیں پایا گیا لوگ کیوں کھڑے ہو گئے؟ کس نے ان کو کھڑا کیا؟ شریعت نے کھڑا کرنے کے لئے تکبیر رکھی ہے، یہ کھڑا کرنا (اقامہ) تو ابھی پایا نہیں گیا پھر آپ کیوں کھڑے ہو گئے؟ ہم تو غلط یوں ہیں۔ اور بریلوی غلط یوں ہیں کہ جب اقامہ (کھڑا کرنا) شروع ہو چکا تو اب کیوں بیٹھے ہو؟ تکبیر کا اقامہ نام ہی دلیل ہے کہ ہمارا طریقہ بھی غلط ہے اور بریلویوں کا بھی غلط ہے۔ صحیح طریقہ یہ ہے کہ جب نماز کا وقت ہو سب سے پہلے تکبیر کہنے والا کھڑا ہو اور تکبیر شروع کرے، اقامہ شروع ہوا تو اب لوگ کھڑے ہونا شروع ہونگے، پھر جب اقامہ پورا ہو جائے تو امام صاحب صفوں کو دیکھیں گے، اور کسی کو کوئی ہدایت دینی ہو تو دیں گے اور جب صفیں سیدھی ہو جائیں تو نماز شروع کر دیں، صفیں درست کرنے کا صحیح طریقہ یہ ہے۔

صفیں درست کرنے کا صحیح وقت کب ہے؟

صفیں درست کرنے کا صحیح وقت تکبیر ختم ہو جانے کے بعد اور نماز شروع کرنے سے پہلے ہے، لیکن اس ملک میں ایک نیا اور عجیب وغریب طریقہ ہے، جب تکبیر شروع ہوتی ہے تو امام صاحب مصلے پر آ کر نمازیوں کی طرف منہ کر کے کھڑے ہو جاتے ہیں، جب تک تکبیر ہوتی رہے گی امام صاحب نمازیوں کی طرف منہ کر کے کھڑے رہیں گے، تکبیر پوری ہونے کے بعد گھوم کر نماز شروع کریں گے۔ اللہ جانے امریکہ میں یہ طریقہ کہاں سے آیا، میں دنیا کے کئی ملکوں میں جا چکا ہوں، ہم نے یہ طریقہ یہاں کے علاوہ کہیں نہیں دیکھا۔

اور دیکھو میرے بھائیو! دین وہ ہے جو دنیا کے تمام مسلمانوں میں ہے، کیونکہ دین کا مدار

قرآن وحدیث پر ہے اور قرآن وحدیث ساری دنیا میں ایک ہی ہیں، لہٰذا ساری دنیا میں جو طریقہ چل رہا ہے وہی دین ہے، اور اگر کسی علاقہ میں ایک طریقہ ہے جس کو دوسرے علاقہ والے نہیں جانتے تو یہ طریقہ دین میں سے نہیں ہے بعد میں بڑھا ہے، اگر قرآن وحدیث میں یہ طریقہ ہوتا تو ساری دنیا میں ہوتا، میں پینتالیس سال سے حدیث پڑھا رہا ہوں، میں نے آج تک کسی حدیث میں یہ طریقہ نہیں دیکھا، حضور ﷺ تکبیر شروع ہونے کے بعد نماز شروع ہونے تک لوگوں کی طرف متوجہ ہو کر کھڑے رہتے ہوں، ایسا ہم نے کسی حدیث میں نہیں پڑھا۔

ننگے سر نماز پڑھنا سنت نہیں

اسی طرح ایک دوسرا مسئلہ ہے، کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ ننگے سر نماز پڑھنا سنت ہے، مگر ہم نے آج تک کوئی حدیث نہیں پڑھی جس میں یہ ہو کہ نبی پاک ﷺ کے پاس ٹوپی یا عمامہ موجود تھا اور آپ نے ایک فرض نماز ننگے سر پڑھی، پوری زندگی میں ایک دفعہ بھی ایسا کیا ہو، ایسی کوئی حدیث ہم نے نہیں پڑھی، اور قیامت کی صبح تک مہلت ہے: لاؤ ایسی کوئی حدیث، چاہے ضعیف ہی کیوں نہ ہو۔ ان بھائیوں سے جب پوچھا جاتا ہے تو فوراً کہتے ہیں: ٹوپی کے بغیر کیا نماز نہیں ہوتی؟ ایک مرتبہ نہیں سو مرتبہ ہوتی ہے! اور ٹوپی کے بغیر ہی نہیں، کرتے کے بغیر بھی نماز ہوتی ہے، نماز میں مرد کے لئے ناف سے لے کر گھٹنے تک ہی بدن ڈھکنا ضروری ہے، گھٹنے سے نیچے کا حصہ اور ناف سے اوپر کا حصہ اگر سارا کھلا ہو تو بھی نماز ہو جائے گی۔

غرض ننگے سر نماز ہوتی ہے یا نہیں؟ یہ مسئلہ نہیں ہے، مسئلہ یہ ہے کہ نماز کے وقت اللہ کا کیا حکم ہے؟ اللہ کا حکم ہے: ﴿یٰبَنِیْٓ اٰدَمَ خُذُوْا زِیْنَتَکُمْ عِنْدَ کُلِّ مَسْجِدٍ﴾: اے آدم کی اولاد! جب تم نماز پڑھو، شاندار لباس پہن کر نماز پڑھو، اور اسلامی تہذیب میں ننگے سر ہونا شاندار لباس نہیں، یہ تو فیشن ہے، غیروں کا طریقہ ہے، اسلامی طریقہ نہیں ہے۔

غرض بعض چیزیں بغیر دلیل اور بغیر حدیث کے چلتی ہیں، امام صاحب کا لوگوں کی

طرف متوجہ ہوکر کھڑا ہونا بھی انہی چیزوں میں سے ہے جس کی کوئی دلیل اور جس کے بارے میں کوئی حدیث نہیں، مگرامریکہ میں یہ سنت بنا ہوا ہے۔

اقامت میں حضور ﷺ کا طریقہ

میں عرض یہ کررہا تھا کہ اقامت میں ہمارا طریقہ بھی غلط ہے اور بریلویوں کا بھی، نبی پاک ﷺ کا طریقہ بخاری میں آیا ہے، حضور ﷺ نے فرمایا: **إِذَا أُقِيْمَتِ الصلوة فلا تقوموا حتی ترونی**: جب نماز کھڑی کی جائے یعنی تکبیر شروع ہو تو تم کھڑے مت ہوؤ، یہاں تک کہ مجھے دیکھ لو۔ اذان کے وقت نبی پاک ﷺ اپنے کمرے میں ہوتے تھے، پھر جب وقت ہوتا تھا تو تکبیر شروع ہوجاتی تھی، حضور تکبیر سن کر گھر سے نکلتے تھے، کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ تکبیر شروع ہوگئی اور گھر میں آپ کی نیت بندھی ہوئی ہے، اس لئے نماز پوری کرکے حضور ﷺ آئیں گے، ایسی صورت میں صحابہ تکبیر پوری ہونے کے بعد کھڑے کھڑے حضورؐ کا انتظار کرتے تھے، اس لئے حضور ﷺ نے ان کو ہدایت دی کہ تکبیر شروع ہونے پر مت کھڑے ہوؤ، جب مجھے کمرے سے آتا ہوا دیکھو تب کھڑے ہوؤ۔ چنانچہ مسئلہ یہی ہے کہ مسجد میں تکبیر شروع ہوئی اور امام صاحب مسجد میں نہیں ہیں، وہ مسجد سے متصل اپنے کمرہ میں ہیں اور بالیقین ہیں، کس حالت میں ہیں یہ معلوم نہیں، تو ایسی صورت میں تکبیر شروع ہونے پر بھی لوگ کھڑے نہیں ہونگے، جب امام صاحب کمرے سے نکلتے نظر آئیں گے تب لوگ کھڑے ہونگے۔ معلوم ہوا کہ حضور ﷺ مصلے پر کھڑے ہوکر لوگوں کی طرف متوجہ ہوجاتے تب تکبیر شروع ہوتی ایسا نہیں تھا، آپ تو گھر میں ہوتے تھے اور تکبیر شروع ہوجاتی تھی۔

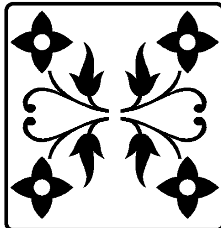
گھڑی دیکھ کر کھڑا نہیں ہونا چاہئے

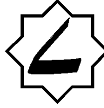
یہ تکبیر شروع ہونے سے پہلے صف بندی کا رواج کیوں پڑا؟ اب نماز ٹن کی ہوتی ہے، گھڑی میں ٹن ہوا اور لوگ کھڑے ہوگئے، حالانکہ نماز کے سلسلہ میں امام کا اختیار ہے، جب

امام مناسب سمجھے گا موذن کو اشارہ کرے گا اور وہ کھڑے ہو کر تکبیر شروع کرے گا، کبھی ایسا ہوتا ہے کہ نماز کا وقت ہو جاتا ہے مگر اسی وقت بہت سارے آدمی آجاتے ہیں اور وضو کرنے لگتے ہیں، تو ایسی صورت میں امام نماز شروع کرنے میں دو منٹ تاخیر کرے گا تاکہ ان نئے آنے والوں کو بھی نماز مل جائے، ایسے ہنگامی حالات میں لوگوں کا لحاظ کرنا امام کی ذمہ داری ہے، بخاری شریف میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ نبی پاک ﷺ عشاء کی نماز معین وقت پر شروع نہیں کرتے تھے بلکہ،إذا کثر الناس عجل وإذا قلوا أخر: اگر لوگ زیادہ آجاتے تو آپ نماز جلدی پڑھا دیتے، لوگ تھوڑے ہوتے تو آپ نماز میں تاخیر کرتے، بہر حال حالات پر نظر رکھنا امام کی ذمہ داری ہے، اور اس کا لحاظ کر کے جب امام اشارہ کرے تب تکبیر شروع ہوگی اور اس وقت لوگ کھڑے ہونگے، مگر اب تو لوگوں نے گھڑی کو دیکھ کر ٹن کی نماز کر دی ہے بیچارے امام کا کوئی اختیار نہیں رہا، یہ جو ہم نے امام کو اپنا نوکر بنا لیا ہے، میرے بھائیو یہ ٹھیک نہیں، امام کو سردار بناؤ گے تو تمہاری نمازوں میں برکت ہوگی، امام کو نوکر سمجھو گے تو تمہاری نمازیں بغیر دانے کی مونگ پھلی ہونگی۔ آپ نے کہیں یہ سنا ہوگا کہ کسی عالم کے پیچھے نماز پڑھنا ایسا ہے جیسا کسی نبی کے پیچھے نماز پڑھنا، چونکہ دل میں نبی کا ایک احترام ہوتا ہے تو اس احترام کے بعد نبی کے پیچھے جو نماز پڑھی جائے گی اس میں خوبی پیدا ہوگی، اسی طرح عالم کا احترام اگر دل میں ہے تو اس کے پیچھے نماز پڑھنے میں خوبی پیدا ہوگی، اور اگر عالم کا کوئی احترام نہیں ہے تو پھر نماز میں کوئی خوبی پیدا نہیں ہوگی۔

یہ مسئلہ میں اس لئے سمجھا رہا ہوں کہ اقامت میں امام اپنے اختیار سے اور حالات کا لحاظ کر کے تکبیر شروع کرنے کا اشارہ کرے گا، گھڑی دیکھ کر لوگوں کو کھڑا ہونا نہیں چاہئے۔

آج کی تقریر میں بس یہ دو مسئلے عرض کرنے تھے، اللہ تعالی ان پر عمل کرنے کی ہم کو توفیق نصیب فرمائیں۔ آمین یارب العالمین۔ وآخر دعوانا أن الحمد للہ رب العالمین۔





دس دن میں قرآن ختم کرنا کیسا ہے؟

بزرگو اور بھائیو! ایک سوال لوگ بار بار پوچھ رہے ہیں کہ دس دن میں قرآن ختم کرنا کیسا ہے؟ یہاں (کناڈا میں) میں بہت سالوں سے آرہا ہوں، پہلے یہ سلسلہ ٹورنٹو میں نہیں تھا، تین سال پہلے آیا تو ایک جگہ یا دو جگہ یہ سلسلہ قائم ہوا اور اب آیا تو دسیوں جگہ اس کو پایا، اور با قاعدہ اعلانات اور اشتہارات چھاپ کر مسجدوں کے دروازوں پر چپکائے گئے، ہماری مسجد میں بھی یہ اشتہار چپکایا گیا، الغرض یہ سلسلہ بڑھتا جا رہا ہے اس لئے اس مسئلہ کو اچھی طرح سمجھو۔

تین مقصد تین حکم

دس دن میں یا اس سے بھی کم دنوں میں جو قرآن ختم کیا جاتا ہے اس کے تین مقاصد ہوتے ہیں پس تینوں مقصدوں کے اعتبار سے احکام مختلف ہونگے۔

ایک مقصد: ہوتا ہے زیادہ سے زیادہ قرآن سننا، اس سلسلہ میں جاننا چاہئے کہ دو سنتیں علاحدہ علاحدہ ہیں، ایک: رمضان کے انتیس دن یا تیس دن بیس رکعت تراویح جماعت سے پڑھنا، چاہے الم ترکیف سے ہو، اور دوسری سنت ہے: پورے رمضان میں ایک قرآن سننا، اور ایک قرآن کم سے کم ہے، اگر کوئی دو سنے، تین سنے سبحان اللہ! جتنا گڑ ڈالو گے اتنا میٹھا ہوگا، پس دس دن میں قرآن سننے کی ایک نیت تو یہ ہوسکتی ہے کہ ہم زیادہ سے زیادہ قرآن سنیں، یہ بہت صحیح نیت ہے اور اس نیت سے قرآن ضرور سننا چاہئے، ایک شرط کے ساتھ اور وہ یہ ہے کہ قرآن صحیح پڑھا جائے، **یعلمون تعلمون** نہ پڑھا جائے، ایسے پڑھنے کا کوئی حاصل نہیں، حدیث میں ہے: **رب قارئ للقرآن و القرآن یلعنه:** بعض قرآن پڑھنے والے ایسا قرآن پڑھتے ہیں کہ قرآن ان پر لعنت بھیجتا ہے کہ تیرا ناس ہو کم بخت مجھے کیوں بگاڑ رہا ہے! ہمارے دیوبند میں تقریباً سو مسجدیں ہیں وہاں صرف چھ مسجد میں تین پاروں والا قرآن ہوتا ہے

جہاں حضرت مفتی محمود صاحب گنگوہی رحمہ اللہ اعتکاف کیا کرتے تھے، اور سہارن پور: دیوبند سے بھی بڑا ہے وہاں تین پاروں والا قرآن کہیں نہیں ہوتا صرف حضرت شیخ زکریا رحمہ اللہ کی مسجد میں تین پاروں والا قرآن ہوتا ہے جہاں حضرت شیخ اعتکاف کیا کرتے تھے، دس دن میں ایک قرآن ختم ہوتا تھا، پھر اگلی رات سے دوسرا شروع ہو جاتا تھا اور جو دس دن سننے والے ہوتے تھے وہی اگلے عشرہ میں بھی سننے والے ہوتے تھے، کوئی نئے مصلی نہیں ہوتے تھے کیونکہ وہاں مریدین ہوتے تھے جو دن رات اذکار میں لگے رہتے تھے ان کے لئے تین قرآن سننا مشکل نہیں تھا۔ تو یہ زیادہ سے زیادہ قرآن سننا ایک بہترین مقصد ہے اور اس مقصد کے پیش نظر اگر کوئی دس دن والا قرآن سنتا ہے تو یہ نہ صرف جائز ہے بلکہ ایسا اس کو ضرور کرنا چاہئے۔

دوسرا مقصد: یہ ہوتا ہے کہ دس دن میں قرآن پورا ہو جائے گا تو پھر چھٹی مل جائے گی پھر جی چاہے گا تراویح پڑھیں گے اور نہیں چاہے گا نہیں پڑھیں گے۔ یہ کوئی شرعی مقصد نہیں، میں نے کہا تھا کہ دو سنتیں الگ الگ ہیں، آپ نے ایک سنت تو پوری کر لی لیکن دوسری سنت چھوڑ دی، لہذا یہ کوئی اچھا مقصد نہیں۔

تیسرا مقصد: یہ ہوتا ہے کہ ہم ایک قرآن دس دن میں سن لیں گے پھر جہاں چاہیں گے کسی نہ کسی مسجد میں پابندی سے تراویح پڑھیں گے ہماری ترتیب فوت نہیں ہوگی کیونکہ ہم ایک قرآن پہلے سن چکے ہیں، یہ مقصد دیکھنے میں تو خوبصورت ہے مگر بے کار مقصد ہے کیونکہ تراویح سبھی مسجدوں میں ایک ہی ترتیب سے ہوتی ہیں یا ہونی چاہئے۔ پس اگر آج یہاں پڑھو کل وہاں پڑھو تو کوئی فرق نہیں پڑتا سب جگہ ایک ہی ترتیب سے قرآن چلتا ہے، البتہ کبھی کبھی گڑبڑ ہو جاتی ہے۔

الغرض یہ مقصد خوبصورت ہے مگر کوئی اہم مقصد نہیں، پہلا مقصد ہی صحیح ہے کہ اگر آپ کو مہینہ میں تین یا اس سے زیادہ قرآن سننے ہیں تو شوق سے سنو، مگر میرے خیال سے اس مقصد سے سننے والا شاید ہی کوئی ملے، زیادہ تر وہ ہیں جو یہ سوچتے ہیں کہ بھئی ایک بار لگ جاؤ پھر چھٹی مل جائے گی اور یہ کوئی اچھا مقصد نہیں اور اس مقصد سے یہ دس دن والا قرآن دس سال گذرتے گذرتے پانچ دن پر آجائے گا پھر دس سال اور زندہ رہے تو یہ تین دن پر آجائیگا،

اس لئے میرے بھائیو! یہ جو سلسلہ چل رہا ہے میرا خیال ہے کہ یہ لوگوں کے احوال کے اعتبار سے ٹھیک نہیں۔

قیام اللیل (تہجد) جماعت کے ساتھ پڑھنے کا کیا حکم ہے؟

ایک دوسرا مسئلہ اور پوچھا گیا کہ قیام اللیل جماعت سے پڑھنے کا کیا حکم ہے؟ میں نے کہا کہ اس کا کوئی شرعی ثبوت نہیں، کہنے لگے کہ فاؤنڈیشن (ٹورنٹو کی ایک بڑی مسجد) میں تو ہوتا ہے میں نے کہا کہ فاؤنڈیشن کوئی دلیل شرعی نہیں یہ تو حرمین میں بھی ہوتا ہے دلیل: قرآن وحدیث اور فقہ ہے، قرآن وحدیث تو چاروں ائمہ کا مشترک سرمایہ ہے اور فقہ چاروں اماموں کی الگ الگ ہے، ہمارے نزدیک قرآن، حدیث اور فقہ حنفی حجت اور دلیل ہیں، فاؤنڈیشن اور حرمین کوئی دلیل نہیں۔

حضورؐ نے رمضان میں دو یا تین راتیں جماعت سے تراویح پڑھائی تھی

پھر میں نے انہیں سمجھایا کہ نبی پاک ﷺ لوگوں کو رمضان کی راتوں میں سونے سے پہلے اضافی نفلیں پڑھنے کی ترغیب دیا کرتے تھے، رات میں اٹھ کر تہجد کی نماز تو بارہ مہینہ پڑھنی ہے رمضان میں بھی پڑھنی ہے لیکن رمضان میں ایک اضافی نماز ہے جس کا نام: قیام رمضان ہے، حضور ﷺ اس کی ترغیب دیا کرتے تھے اس کے لئے کوئی جماعت نہیں کرتے تھے، فرمایا: **من قام رمضان إيمانا و احتسابا غفر له ما تقدم من ذنبه:** جس نے رمضان کی راتوں میں سونے سے پہلے نفلیں پڑھیں ان نفلوں پر جو ثواب کا وعدہ ہے اس کا یقین کرتے ہوئے اور اس ثواب کو پیش نظر رکھتے ہوئے تو اس کے پچھلے گناہ معاف کر دیئے جائیں گے، اس طرح حضور ﷺ ترغیب دیا کرتے تھے اور صحابہ خوب نفلیں پڑھتے تھے جب تک اللہ تعالی ان کو توفیق دیتے تھے، اور یہ سب مسجد نبوی میں پڑھتے تھے، ایک رات نبی پاک ﷺ اپنے چٹائیوں والے اعتکاف کے مخصوص کمرے سے باہر نکلے کیونکہ یہ واقعہ رمضان کے آخری دنوں کا ہے اور حضور ﷺ آخری عشرہ میں اعتکاف کیا کرتے تھے، اور اعتکاف کا کمرہ صرف حضورؐ کے لئے بنایا جاتا تھا، کسی اور صحابی کے لئے نہیں بنایا جاتا تھا،

سہارن پور میں جب ہم اعتکاف کرتے تھے تو مسجد میں پانچ سو اعتکاف کرنے والے ہوتے تھے اور مسجد میں صرف حضرت شیخ قدس سرہ کے لئے چار پانچ آدمیوں کی جگہ کے بقدر کمرہ بنتا تھا، کیونکہ حضرت کے پاس صبح سے شام تک مریدین آیا کرتے تھے، اپنے حالات سنایا کرتے تھے اور مشورے لیتے تھے، تو حضرت کے لئے ہی حجرہ بنتا تھا باقی کسی کے لئے نہیں بنتا تھا۔

الغرض حضور ﷺ اپنے کمرہ سے باہر نکلے اور مسجد میں جو صحابہ نماز پڑھ رہے تھے ان سے کہا: آؤ میں تمہیں نماز پڑھاؤں، حضورؐ نے کافی دیر تک نماز پڑھائی نماز کے بعد آپ کمرہ میں چلے گئے، صبح اس نماز کا چرچا ہوا تو اس امید پر کہ شاید اگلی رات بھی حضور ﷺ نماز پڑھائیں، کافی تعداد ان لوگوں کی مسجد میں رک گئی جو گھر میں نفلیں پڑھتے تھے، چنانچہ پچھلے دن جتنا وقت گذرا تھا اتنا وقت گذرنے کے بعد حضور ﷺ پھر تشریف لائے، آپؐ نے نماز پڑھائی اور آج کل سے بھی زیادہ وقت لیا، جب دو دن پڑھائی تو اب لوگوں کو ظن غالب ہو گیا کہ اب آپ ہر رات یہ نماز پڑھائیں گے چنانچہ اگلی رات مجمع اور بڑھ گیا، تیسری رات میں بھی آپؐ معینہ وقت پر نکلے، آپؐ نے نماز پڑھائی اور پہلے دو دنوں سے بھی زیادہ آج وقت لیا، جب تیسری رات بھی آپؐ نے نماز پڑھائی تو اب لوگوں کو یقین ہو گیا کہ آپؐ ہر رات یہ نماز پڑھائیں گے کیونکہ راتیں دو یا تین رہ گئی تھیں، پس چوتھی رات کو اتنے لوگ اکٹھا ہو گئے کہ مسجد میں تل دھرنے کی جگہ نہ رہی، مقررہ وقت ہوا مگر آپ باہر تشریف نہیں لائے، لوگوں نے یہ خیال کرتے ہوئے کہ شاید آپؐ کی آنکھ لگ گئی ہو زور سے تکبیر اور تسبیح پڑھی، کسی نے چٹائی پر کنکری ماری تا کہ آپ کی آنکھ کھل جائے، مگر حضور ﷺ سوئے نہیں تھے۔ بہر حال آج حضور ﷺ نہیں نکلے لوگ مایوس ہو کر منتشر ہو گئے، فجر کی نماز کے بعد حضورؐ نے تقریر کی کہ رات کا تمہارا عمل مجھ سے مخفی نہیں تھا، مگر میں نے تمہارا جو اشتیاق دیکھا تو مجھے ڈر ہوا کہ کہیں یہ نماز تم پر لازم نہ ہو جائے، اس لئے آئندہ میں یہ نماز نہیں پڑھاؤں گا، اپنے اپنے طور پر جیسے پہلے پڑھتے تھے پڑھتے رہو۔

اکثر احکام اللہ کی طرف سے خود آتے ہیں مگر بعض احکام اللہ کی طرف سے اس وقت آتے ہیں جب امت خواہش کرے اور نبی صاد کرے یا نبی خواہش کرے اور امت صاد کرے تو وہ حکم لازم ہو جاتا ہے، اور اگر دونوں میں سے کوئی ایک پیچھے ہٹ جائے تو پھر وہ حکم

لازم نہیں ہوتا، یہ نماز اسی قبیل کی تھی کہ امت خواہش کر رہی تھی مگر نبیؐ پیچھے ہٹ گئے۔

اور جو میں نے حدیث بیان کی اس میں روایتیں مختلف ہیں بعض روایتوں میں یہ ہے کہ آپؐ نے دو راتیں نماز پڑھائی اور تیسری رات تشریف نہیں لائے اور کچھ روایتوں میں یہ ہے کہ آپؐ نے تین راتیں نماز پڑھائی اور چوتھی رات تشریف نہیں لائے۔

یہ حدیث جو میں نے آپ حضرات کے سامنے بیان کی اس میں غور کیجئے کہ حضورؐ نے یہ جو دو یا تین راتیں نماز پڑھائی تھی وہ کونسی نماز تھی؟ تراویح یا تہجد؟ غیر مقلدین کہتے ہیں: یہ حضور نے تہجد پڑھائی تھی اور چاروں ائمہ کے متبعین کہتے ہیں: یہ حضورؐ نے تراویح پڑھائی تھی اور اس سلسلہ میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث ہے کہ حضور ﷺ ماہ رمضان میں تنہا بیس رکعتیں اور وتر پڑھا کرتے تھے[1] پس ظاہر یہ ہے کہ آپ ﷺ نے ان دو یا تین راتوں میں یہی بیس رکعتیں پڑھائی ہونگی، غیر مقلدین کہتے ہیں: یہ روایت ضعیف ہے اس میں فلاں راوی ضعیف ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ ضعیف ہے تو کیا آسمان ٹوٹ پڑا؟ اس کے مقابل کوئی صحیح روایت ہو تو لاؤ۔ وہ کہتے ہیں: حضرت عائشہ کی بخاری اور مسلم والی روایت ہے! ہم کہتے ہیں وہ تو تہجد کے بارے میں ہے، تراویح کے بارے میں بتاؤ کہ اس کے علاوہ کوئی روایت ہے؟ کوئی نہیں ہے۔

اور مسئلہ یہ ہے کہ صحیح اور ضعیف میں ٹکراؤ ہو تو صحیح لیں گے ضعیف نہیں لیں گے، لیکن اگر کسی مسئلہ میں صحیح روایت نہ ہو ضعیف حدیث ہی ہو تو وہ ضعیف حدیث لی جائے گی، چنانچہ یہاں بھی عبداللہ بن عباس کی روایت لی جائے گی پھر جب اس ضعیف حدیث کے مطابق ساری دنیا کے مسلمانوں کا تعامل شروع ہو گیا تو اس کا ضعف ختم ہو گیا، اب مسئلہ کا سارا مدار تعامل پر ہو جائیگا۔

بہر حال یہ اختلاف ہو گیا، چاروں ائمہ کے ماننے والے حضورؐ کی پڑھائی ہوئی نماز کو قیام رمضان (تراویح) سمجھتے ہیں اور غیر مقلدین اس کو قیام اللیل (تہجد) سمجھتے ہیں۔ تو فاؤنڈیشن

---

(۱) عن ابن عباس، قال: کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم یصلی فی شهر رمضان فی غیر جماعة عشرین رکعة والوتر تفرد به أبو شیبة إبراهیم بن عثمان العبسی الکوفی، وهو ضعیف (سنن بیہقی کبری ۲:۴۹۶)

والوں یا حرمین والوں کا خیال اگر یہ ہے کہ حضور ﷺ نے یہ نماز قیام اللیل پڑھائی تھی تو تم قیام اللیل جماعت سے پڑھو، تراویح جماعت سے کیوں پڑھتے ہو جب تمہارے خیال میں حضور ﷺ نے تراویح پڑھائی ہی نہیں تو اس کو کیوں پڑھتے ہو؟

اور چاروں ائمہ کے ماننے والوں کا خیال یہ ہے کہ حضور ﷺ نے یہ تراویح کی نماز پڑھائی تھی اس لئے وہ پورا مہینہ یہ نماز جماعت کے ساتھ پڑھتے ہیں، اور حضور ﷺ نے پورا مہینہ اس لئے نہیں پڑھائی تھی کہ فرضیت کا اندیشہ تھا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ملت کی تنظیم کی اور اس کا باقاعدہ نظام بنایا اور خلفائے راشدین کے وہ طریقے جو ملک وملت کی تنظیم سے تعلق رکھتے ہیں ان کو لینا ضروری ہے حضور ﷺ نے اس کا حکم دیا ہے، اس لئے ہم پورا مہینہ تراویح جماعت سے پڑھتے ہیں اور قیام اللیل جماعت سے نہیں پڑھتے کیونکہ ہمارے خیال میں حضور ﷺ نے یہ نماز نہیں پڑھائی۔ پس ہم جو سمجھتے ہیں اس پر عمل کرتے ہیں اور وہ لوگ جو سمجھتے ہیں اس پر وہ خود عمل نہیں کرتے۔ بہرحال قیام اللیل خواہ رمضان میں ہو یا غیر رمضان میں حضور ﷺ کا جماعت سے پڑھنا ثابت نہیں، اس لئے ہماری فقہ میں یہ مسئلہ ہے کہ رمضان میں قیام اللیل جماعت سے پڑھنا مکروہ ہے۔

یہاں اگر کوئی سوال کرے کہ حضرت مدنی قدس سرہ تہجد کی نماز جماعت سے پڑھتے تھے اور ان کے پیچھے بڑا مجمع ہوتا تھا، اس کا جواب یہ ہے کہ ہم حنفی ہیں اور امام ابوحنیفہؒ کی فقہ مدون ہے اس پر عمل کرنے والے ہم حنفی ہیں، اور احناف میں اکابر کے کچھ تفردات ہوتے ہیں، کچھ الگ رائیں ہوتی ہیں، یہ حضرت مدنی کا تفرد تھا،[1] اس کو حضرت کے ساتھ خاص رکھیں گے اور ہم اتباع کریں گے فقہ حنفی کا، جیسے علامہ ابن ہمام بہت بڑے حنفی عالم ہیں، ان

(۱) حضرت مدنی قدس سرہٗ کی رائے تھی کہ رمضان میں نوافل جماعت کے ساتھ پڑھے جاسکتے ہیں، تداعی کے ساتھ بھی اور بغیر تداعی کے بھی۔ حضرتؒ ایک تحریر میں لکھتے ہیں: ''اس لئے تمام وہ نوافل جو رمضان کی راتوں میں پڑھی جائیں مراد ہونگی، خواہ تراویح میں خواہ تہجد میں، اوائل شب میں ہوں یا اواخر میں، سب میں جماعت کی اجازت ہوگی'' پھر آگے تحریر فرماتے ہیں: ''پس رمضان کے جملہ نوافل کی جماعت خواہ بالتداعی ہو یا بلاتداعی سب کی سب ماذون فیہ، بلکہ مستحب ہوگی'' (فتاوی شیخ الاسلام ص: ۴۴ و ۴۵ مرتبہ مولانا مفتی سلمان صاحب منصور پوری)

کی چودہ مسئلوں میں امام ابوحنیفہؒ سے الگ رائے ہے، اوران کے شاگرد قاسم بن قطلوبغاؒ نے لکھا ہے کہ استاذ کے تفردات مفتی بہ نہیں۔ تو ہر بڑے عالم کی کچھ مسائل میں الگ رائے ہوتی ہے، اس کی ہم اتباع نہیں کریں گے، اتباع ہم فقہ حنفی کی کریں گے۔

جاننا چاہئے کہ فقہی اصطلاحات کے معانی کتب فقہ سے لینے چاہئیں، لغت سے اس کے معنی نہیں لینے چاہئیں جیسے دارالاسلام اور دارالحرب فقہ کی دو اصطلاحیں ہیں، دارالاسلام کے لغت میں معنی ہیں: وہ ملک جہاں تمام اسلامی قوانین جاری ہوں، ایسا ملک تو دنیا میں سعودیہ کے علاوہ کوئی نہیں، اور دارالحرب کے لغت میں معنی ہیں: لڑائی کا ملک، یعنی جہاں مسلمانوں کے ساتھ جنگ چل رہی ہے، تو انڈیا اور کناڈا میں مسلمانوں کے ساتھ کہاں جنگ چل رہی ہے؟ پس انڈیا اور کناڈا جیسے ملک دارالحرب کیسے ہونگے؟ چنانچہ لوگ اشکال کرتے ہیں کہ انڈیا اور کناڈا جیسے ملک دارالحرب کیسے ہوسکتے ہیں؟ یہاں کونسی مسلمانوں کے ساتھ جنگ چل رہی ہے، یہاں تو مذہبی اعتبار سے مکمل آزادی ہے، لوگوں نے یہ اشکال ان کے معنی لغت میں دیکھ کر کھڑا کیا ہے، یہ تو فقہ کی اصطلاحیں ہیں، لہٰذا فقہ کی کتابوں میں ان کے معنی دیکھ کر مفہوم طے کیا جائے اور فقہ میں دارالحرب اس ملک کو کہا جاتا ہے جہاں اقتدار اعلیٰ کافروں کے ہاتھ میں ہو، اور جہاں اقتدار اعلیٰ مسلمانوں کے ہاتھ میں ہو وہ دارالاسلام ہے، چاہے وہاں اسلامی قوانین جاری ہوں یا نہ ہوں، ایسے ہی تداعی کے معنی لغت میں دیکھ کر طے نہیں کئے جائیں گے یہ فقہ کا اصطلاحی لفظ ہے چنانچہ اس کے معنی بھی فقہ کی کتابوں میں دیکھ کر طے کئے جائیں گے اور فقہ میں تداعی کے معنی ہیں: کوئی بھی نفل نماز اگر اس میں ایک امام اور تین مقتدی ہوں تو تداعی ہے چاہے بلایا گیا ہو یا نہ بلایا گیا ہو۔

اسی لئے فتاوی شیخ الاسلام میں حضرت کے نواسے: مفتی محمد سلمان منصور پوری نے اس مسئلہ پر حاشیہ لکھا ہے کہ فقہ حنفی کی رو سے تداعی کے یہ معنی ہیں، اور حضرت نے جو کچھ لکھا ہے یہ حضرت کا تفرد ہے[1] لہٰذا ہم حنفی ہونے کی حیثیت سے اس کی اتباع نہیں کریں گے۔

بہر حال یہ جو سوال تھا کہ قیام اللیل جماعت سے پڑھنے کا کیا حکم ہے؟ اس کا جواب یہ

(۱) مفتی سلمان صاحب کا حاشیہ یہ ہے: ''یہ مسئلہ حضرتؒ کے تفردات میں سے ہے، جسے ←

ہے کہ اگر ایک امام اور دو مقتدی ہوں تو کوئی کراہیت نہیں، لیکن اگر ایک امام اور تین مقتدی ہوں تو پھر مکروہ ہے چاہے بلایا گیا ہو یا نہ بلایا گیا ہو، اور جو لوگ پڑھتے ہیں ان کو پڑھنے دو، دنیا میں اعمال میں اتحاد کہاں ہے؟ ہماری اسی مسجد میں آدھے آمین بالجہر کہتے ہیں اور آدھے بالسر۔ آدھے رفع یدین کرتے ہیں اور آدھے نہیں کرتے، نہ یہ ان سے لڑتے ہیں اور نہ وہ ان سے لڑتے ہیں، کوئی کھڑا ہوتا ہے تو پیروں کے درمیان چار چھ انگلیوں کا فاصلہ رکھتا ہے اور کوئی کھڑا ہوتا ہے تو پیروں کے درمیان ایک ہاتھ کا فاصلہ رکھتا ہے، تو اعمال میں اتحاد کہاں ہے؟ اتحاد ایمان وعقائد میں ہونا چاہئے، پس اگر فلاں اور فلاں جگہ کے لوگ قیام اللیل جماعت سے پڑھتے ہیں تو پڑھنے دو، آپ اپنے طریقہ پر چلیں اور وہ اپنے طریقہ پر، ایک منہاج پر چلو یہ نہیں کہ کبھی ادھر اور کبھی ادھر، یوں دین کی خیر نہیں رہے گی۔

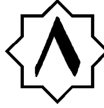
وآخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمين

تقریر کے بعد ایک سوال: دارالعلوم دیوبند کی مسجد رشید اور مسجد چھتہ میں تو تہجد کی جماعت ہوتی ہے، جبکہ دارالعلوم مسلک حنفی کا ترجمان ہے؟

جواب: یہ صاحبزدگان کا عمل ہے، دارالعلوم کا عمل نہیں۔ رمضان میں حضرت مدنی قدس سرہ کے صاحبزدگان ان دو مسجدوں میں اپنے مریدین کے ساتھ اعتکاف کرتے ہیں۔ اور حضرتؒ کے بعض خلفاء کی طرح یہ حضرات بھی جماعت کے ساتھ تہجد پڑھتے ہیں، پس یہ ان کا اپنا عمل ہے، دارالعلوم دیوبند سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ چنانچہ دارالعلوم کی مسجد قدیم میں یہ عمل نہیں ہوتا۔

← حضرتؒ نے مجتہدانہ بصیرت سے کام لیتے ہوئے براہ راست احادیث شریفہ سے مستنبط فرمایا ہے، لیکن احقر کو حضرت کے اس موقف کی تائید فقہ حنفی کے کسی جزئیہ سے نہیں ملی، بلکہ مبسوط سرخسی اور دیگر معتبر کتب احناف میں تین چار سے زیادہ مقتدی ہونے کی صورت میں نوافل کی جماعت کو مطلقاً مکروہ قرار دیا ہے (مبسوط سرخسی ۲: ۱۴۴) بریں بنا مسئلہ زیر بحث میں فقہ حنفی کی رو سے حضرت گنگوہیؒ کا موقف ہی راجح اور مضبوط ہے" محمد سلمان۔

نوٹ: حضرت گنگوہیؒ نے فتاوی رشیدیہ میں جماعتِ تہجد کو مکروہ لکھا ہے ۱۲



سعودیہ کے چاند کا مسئلہ

خطبہ مسنونہ کے بعد: ﴿يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْأَهِلَّةِ؟ قُلْ هِيَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ، وَلَيْسَ الْبِرُّ بِأَنْ تَأْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰى، وَأْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ أَبْوَابِهَا، وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ﴾

بزرگو اور بھائیو: ابھی ہمارے قاری صاحب نے جو تلاوت کی ہے اس میں یہ آیت بھی پڑھی ہے اس آیت میں چاند کا مسئلہ ہے اور مغربی دنیا میں یہ مسئلہ جھگڑے کا باعث بنا ہوا ہے، پس کیوں نہ آج اسی آیت پاک کی تفسیر سمجھ لی جائے؟

شان نزول

آیت کریمہ کا شان نزول یہ ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے نبی پاک ﷺ سے سوال کیا کہ سورج ہمیشہ ایک حال پر رہتا ہے مگر چاند ہمیشہ ایک حال پر نہیں رہتا، ایسا کیوں ہے؟ مہینہ کی تین راتوں میں یعنی تیرہ، چودہ اور پندرہ میں تو ماہ کامل ہوتا ہے پھر گھٹنا شروع ہوتا ہے، اور گھٹتے گھٹتے برائے نام رہ جاتا ہے، پھر بالکل غائب ہو جاتا ہے، پھر کھجور کی ٹہنی کی طرح دوبارہ نمودار ہوتا ہے، جو مہینہ کی پہلی تاریخ کہلاتی ہے، پہلی تاریخ کے چاند کو عربی میں 'ہلال' کہتے ہیں، اردو میں بھی یہی لفظ مستعمل ہے، پھر چاند بڑھتا ہے اور بڑھتے بڑھتے ماہ کامل بن جاتا ہے، ایسا کیوں ہے؟ سورج کی طرح چاند ہمیشہ ایک حالت پر کیوں نہیں رہتا؟

اس سوال کا ایک پس منظر ہے، صحابہؓ نے حضور ﷺ سے یہ بات اس لئے پوچھی تھی کہ عرب کا ملک گرم ملک ہے، جیسے یہاں (یورپ وامریکہ میں) آٹھ مہینے سردی رہتی ہے عرب میں آٹھ مہینے گرمی رہتی ہے اور عرب میں پہاڑ بہت ہیں، وہاں کچھ پیدا نہیں ہوتا،

مدینہ اور طائف میں تو تھوڑا بہت پیدا ہو جاتا ہے مگر ملک کی ضرورت کو پورا نہیں کرتا، اس لئے عربوں کی معیشت کا مدار اسفار پر تھا، سال میں ایک مرتبہ شام جاتے تھے اور ایک مرتبہ یمن، اونٹوں پر سفر ہوتا تھا اور اونٹ پورے دن نہیں چل سکتے، زمین گرم ہو جاتی ہے، زیادہ سے زیادہ نو بجے تک چل سکتے ہیں، پھر سفر روک دینا پڑتا ہے، پھر شام کو عصر کے بعد جب سمندر کی طرف سے ٹھنڈی ہوائیں چلتی ہیں اور موسم ٹھنڈا ہو جاتا ہے تب سفر شروع کرتے ہیں، دن میں سفر نہیں کر سکتے، اس لئے دن کی تلافی رات میں کرتے تھے اور چاند جیسا تیرہ چودہ اور پندرہ میں کامل ہوتا ہے اگر ایسا ہی پورا مہینہ رہے تو سفر پُر لطف ہو جائے، یہ پس منظر تھا جس کی وجہ سے سوال کیا تھا کہ جس طرح سورج ایک حال پر رہتا ہے چاند ایک حال پر کیوں نہیں رہتا؟ پس آیت پاک نازل ہوئی کہ لوگ آپؐ سے پوچھتے ہیں ہلالوں کے بارے میں؟ ہلال نہیں فرمایا بلکہ ہلالوں فرمایا، جمع لانے میں اس طرف اشارہ ہے کہ ساری دنیا کا ہلال ایک نہیں، اگر ساری دنیا کا ہلال ایک ہوتا تو مفرد ہلال لایا جاتا، أهلة جمع لانے کی ضرورت نہیں تھی، بہر حال لوگ آپ ﷺ سے مہینہ کے شروع کے چاندوں کے بارے میں پوچھتے ہیں، آپ ان کو جواب دیں: مہینہ کے شروع کے چاند لوگوں کے لئے اوقات مقرر کرتے ہیں اور حج کے لئے وقت مقرر کرتے ہیں، یہاں غور کرنے کی بات یہ ہے کہ حج کو الگ کیوں کیا؟ موا قیت للناس کافی تھا، حج کو الگ کرنے کی ضرورت کیا پیش آئی؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ مہینہ کے نئے چاند ساری دنیا کے لئے الگ الگ تاریخیں مقرر کرتے ہیں۔

بعض احکام سورج سے متعلق ہیں اور بعض چاند سے

کیلنڈر دو طرح کے بنتے ہیں، ایک سورج کا اور ایک چاند کا، سورج کا کیلنڈر ہر آدمی نہیں بنا سکتا جو فلکیات کا ماہر ہے وہی بنا سکتا ہے، اور چاند کا کیلنڈر ہر شخص بنا سکتا ہے، چاند نظر آئے تو اگلا مہینہ شروع کر دو، ورنہ تیس دن مکمل کر لو، اس کے لئے کسی حساب کی ضرورت نہیں اور سورج کا کیلنڈر بنانے کے لئے حساب کا جاننا ضروری ہے۔

پھر شریعت نے کچھ احکام سورج سے متعلق کئے ہیں اور کچھ چاند سے، وہ احکام جن کو

سال میں دائر نہیں کرنا ان کو سورج سے متعلق کیا ہے، اور جن احکام کو سال میں دائر کرنا ہے ان کو چاند سے متعلق کیا ہے، جیسے رمضان شریف کو سال میں دائر کرنا ہے، اگر ہمیشہ رمضان گرمی میں آئے گا تو لوگ پریشان ہونگے اور ہمیشہ سردی میں آئے گا تو کچھ مشقت نہ ہوگی، پھر زمین کا کرہ گول ہے، شمال کی سردی گرمی کا اعتبار ہوگا یا جنوب کی؟ ایک جانب والا ہمیشہ مزہ میں رہے گا دوسری جانب والا پریشان! پس رمضان پورے سال میں گھومے اس لئے اس کو چاند سے متعلق کیا تا کہ کبھی اور کہیں رمضان سردیوں میں آئے اور کبھی اور کہیں گرمیوں میں، اور نمازیں سال بھر پڑھنی ہے، گرمی اور سردی کا اس پر اثر نہیں پڑتا اس لئے ان کو سورج سے متعلق کیا۔

پھر جو احکام سورج سے متعلق ہیں ان میں بھی حساب کا اعتبار نہیں، آنکھ سے دیکھو اور عمل کرو اور جو احکام چاند سے متعلق ہیں ان میں بھی حساب کا اعتبار نہیں آنکھ سے دیکھو اور عمل کرو کیونکہ نبی پاک ﷺ کی امت اتنی بڑی ہے کہ اگر درختوں کے پتے گنے جا سکتے ہیں تو حضور ﷺ کی امت گنی جا سکتی ہے، اگر ریت کے ذرے گنے جا سکتے ہیں تو حضور ﷺ کی امت گنی جا سکتی ہے، اگر آسمان کے تارے گنے جا سکتے ہیں تو حضور ﷺ کی امت گنی جا سکتی ہے، اور سب لوگ شہروں اور دیہاتوں میں نہیں رہتے، کچھ لوگ پہاڑوں میں رہتے ہیں، کچھ جنگلوں میں، پس اگر ان کو سورج اور چاند کا حساب سیکھنے کے لئے کہا جائے گا تو یہ بات امت کے لئے ناقابل عمل ہوگی، اس لئے حکم دیا کہ آنکھ سے دیکھو اور عمل کرو چاہے وہ حکم سورج سے تعلق رکھتا ہو یا چاند سے۔

ہندی مہینے یکساں کیوں ہوتے ہیں؟

ہندؤوں کا کیلنڈر بھی قمری ہے مگر وہ موسم فکس کرنے کے لئے ہر تین سال میں ایک مہینہ بڑھا دیتے ہیں، ہر تیسرے سال: سال کے تیرہ مہینے کر دیتے ہیں اور اس طرح ان کے قمری مہینے ایک سیزن میں آتے ہیں، جیٹھ ہمیشہ گرمیوں میں آتا ہے، اسلام سے پہلے عرب بھی مہینوں کے ساتھ یہی عمل کرتے تھے، وہ بھی ہر تیسرے سال کبیسہ کے نام سے

ایک مہینہ بڑھاتے تھے، چنانچہ رمضان کا جو رمضان نام پڑا ہے وہ اس وجہ سے پڑا ہے کہ رمضان کے معنی ہیں: وہ زمانہ جس میں پتھر نہایت گرم ہو جاتے ہیں، چونکہ رمضان ہمیشہ نہایت گرمی میں آتا تھا اس لئے اس مہینہ کو رمضان کہنے لگے، قرآن کی آیت ﴿إِنَّمَا النَّسِيْءُ زِيَادَةٌ فِي الْكُفْرِ﴾ میں اسی کا بیان ہے، اسلام نے اس سسٹم کو ختم کر دیا پس مہینے سال میں گھومنے لگے۔

نمازوں کے اوقات میں جنتری اور گھڑی کا اعتبار نہیں

کچھ لوگ کہتے ہیں کہ نمازوں کے اوقات کیلئے جنتریاں بنائی جاتی ہیں اور ان کے حساب سے اذانیں دی جاتی ہیں اور نمازیں پڑھی جاتی ہیں، پس جب نمازوں میں حساب کا اعتبار کیا جاتا ہے تو رمضان کے چاند میں حساب کا اعتبار کیوں نہیں کیا جاتا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ نمازوں کے اوقات میں جنتریوں کا اعتبار نہیں، مشرق میں دیکھو! پو پھٹے اور لال دھاری نمودار ہو تو صبح صادق ہو گئی، سحری بند کرو اور فجر کی نماز پڑھو، گھڑی میں چاہے کچھ بھی بجا ہو اس کا اعتبار نہیں، اسی طرح سورج نکلا اس کا اوپر کا کنارہ نمودار ہوا تو سورج نکل آیا اب فجر کی نماز کا وقت ختم ہو گیا، پھر جب سورج بلند ہوا اور ہر چیز کا سایہ گھٹتا ہوا درجہ صفر پر آ گیا یعنی سورج سر پر آ گیا تو ہر نماز ممنوع ہو گئی، پھر جب سورج ڈھلا اور سایہ مشرق کی طرف بڑھنا شروع ہوا تو زوال ہو گیا اب ظہر پڑھو، پھر اصلی سایہ چھوڑ کر جب ہر چیز کا سایہ اس کے مانند ہو جائے تو ائمہ ثلاثہ اور صاحبین کے نزدیک ظہر کا وقت ختم ہو گیا اور امام اعظمؒ کے نزدیک ابھی ظہر کا وقت باقی ہے، ان کے نزدیک اصلی سایہ چھوڑ کر ہر چیز کا سایہ دوگنا ہو جائے تب ظہر کا وقت ختم ہوتا ہے، اور جب بھی ظہر کا وقت ختم ہو عصر کا وقت شروع ہو جائے گا، اور جب سورج کا اوپر کا کنارہ چھپ جائے تو مغرب کا وقت ہو گیا، پھر سورج ڈوبنے کے بعد جب تک مطلع پر روشنی رہے مغرب کا وقت ہے، اور جب بالکل اندھیرا چھا جائے تو عشاء کا وقت شروع ہو گیا صبح صادق تک عشاء پڑھ سکتے ہیں، غرض کسی حساب کی ضرورت نہیں اور کوئی گھڑی نہیں چاہئے، آنکھوں سے دیکھو اور پانچوں نمازیں پڑھو، نمازوں

میں جنتریوں کا حساب ضروری نہیں، جنتریاں لوگوں نے سہولت کے لئے سے بنائی ہیں، لیکن فرض کرو: جنتری کہتی ہے ابھی پانچ منٹ کے بعد سورج طلوع ہوگا اور ہم اپنی آنکھ سے دیکھ رہے ہیں کہ سورج نکل آیا، تو اعتبار دیکھنے کا ہوگا، جنتری اور گھڑی کا نہیں ہوگا، چاند کا بھی یہی معاملہ ہے، اعتبار آنکھ سے دیکھنے کا ہے، اگرچہ قمری کیلنڈر بھی بنتے ہیں، اور سال میں دس مہینے اس کے حساب سے چاند نظر آتا ہے، مگر سال میں دو ماہ اس کیلنڈر کے مطابق چاند نظر نہیں آتا، اس لئے اعتبار حساب کا نہیں، بلکہ آنکھ سے دیکھنے کا ہے۔

ترقی یافتہ دور میں حساب پر مدار رکھنے میں حرج کیا ہے؟

برطانیہ میں اور اس ملک (امریکہ) میں کچھ مسلمان جو ماہرین حساب ہیں کہتے کہ چاند کو آنکھ سے دیکھنے کا زمانہ چودہ سو سال پہلے تھا جبکہ اونٹوں اور پتھروں کا زمانہ تھا، اب ہم ترقی یافتہ ہیں، لکھنا پڑھنا جانتے ہیں، حساب کتاب جانتے ہیں، ہم حساب سے بتا سکتے ہیں کہ چاند کب نکلے گا اور کب ڈوبے گا؟ اسی طرح ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ نیا چاند کب پیدا ہوگا اور کب آنکھ سے دیکھنے کے قابل ہوگا۔

میں ان بھائیوں سے پوچھتا ہوں: بتاؤ حساب کتاب جاننے والے کتنے مسلمان ہیں؟ پوری دنیا میں ایک فیصد بھی نہیں، پس شریعت احکام کا مدار ایسی چیز پر کیسے رکھے گی جس کے جاننے والے ایک فیصد بھی نہیں، چنانچہ حدیث میں نبی پاک ﷺ کا ارشاد ہے: **نحن أمة أمية لا نكتب ولا نحسب**: ہم ناخواندہ امت ہیں یعنی امت کی اکثریت ناخواندہ ہے، اور ناخواندہ ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اردو فارسی انگریزی نہیں جانتے، بلکہ ناخواندہ ہونے کا مطلب ہے: **لا نكتب ولا نحسب**: ہم لکھتے نہیں اور گنتے نہیں، چنانچہ آج بھی امت کی اکثریت حساب کتاب نہیں جانتی ایسی صورت میں شریعت اکثریت کا لحاظ کر کے احکام مقرر کرتی ہے کچھ خاص بندوں کا لحاظ کر کے احکام مقرر نہیں کرتی، پارلیمنٹ جو قوانین بناتی ہے ان میں بھی اکثریت کا لحاظ کرتی ہے بعض کا لحاظ نہیں کرتی۔

پس ماہرین حساب کا یہ کہنا کہ دنیا اب بہت ترقی یافتہ ہوگئی ہے، اب ہم حساب کے

ماہر ہو گئے ہیں ان کا یہ کہنا صحیح ہے، بے شک وہ ماہر ہو گئے ہیں، ہم ان کی مہارت کا انکار نہیں کرتے لیکن شریعت نے اکثریت کا لحاظ کر کے چاند کا مدار حساب پر نہیں رکھا، بلکہ آنکھوں کی رویت پر رکھا ہے۔

بہر حال کوئی ماہر ہے یا نہیں؟ اس قصہ کو چھوڑو، اگر ماہر ہے بھی تو احکام کا مدار حساب پر نہیں، سورج سے متعلق احکام کا بھی اور چاند سے متعلق احکام کا بھی، دونوں کا مدار آنکھ سے دیکھنے پر ہے کیونکہ امت کی اکثریت حساب کتاب نہیں جانتی اور شریعت احکام کے نازل کرنے میں اکثریت کا لحاظ کرتی ہے۔

آیت کریمہ پر ایک نظر پھر ڈالو، اللہ پاک فرماتے ہیں: آپؐ جواب دیں: چاند گھٹتا بڑھتا اس لئے ہے کہ لوگوں کے لئے اوقات مقرر کرے اور حج کے لئے وقت مقرر کرے، اس میں صاف اشارہ ہے کہ مدار آنکھ سے دیکھنے پر ہے اور آنکھ سے دیکھنے کے اعتبار سے مہینہ کا پہلا چاند پوری دنیا میں ایک نہیں ہو سکتا پس لامحالہ چاند کا مہینہ پوری دنیا میں الگ الگ شروع ہوگا، جہاں چاند نظر آئے گا وہاں مہینہ شروع ہوگا، صرف حج ایک ایسی عبادت ہے جس میں ساری دنیا کے مسلمان اپنی تاریخیں چھوڑ کر مکہ کی قمری تاریخ کے اعتبار سے معین دن میں حج کریں گے۔

سعودیہ کا چاند

آج سے تقریباً چالیس سال پہلے جبکہ میں راندیر میں تھا، مکہ کے حکومتی ادارے رابطہ عالم اسلامی نے اجلاس بلایا، دنیا کے بڑے بڑے علماء اس کے رکن ہیں، ہندوستان سے اس وقت حضرت مولانا محمد منظور نعمانی صاحب رحمہ اللہ اور حضرت مولانا ابوالحسن علی میاں صاحب ندوی رحمہ اللہ تھے، دونوں حضرات اجلاس میں شرکت کے لئے تشریف لے گئے، اس کانفرنس کے ایجنڈے میں توحید اھلہ کا مسئلہ بھی تھا، توحید کے معنی ہیں: ایک ہونا، اور اھلہ: ہلال کی جمع ہے، یعنی دنیا میں چاند کی الگ الگ تاریخیں شروع ہوتی ہیں، یہ نظام ختم کیا جائے اور پوری دنیا میں چاند کی تاریخیں ایک ساتھ شروع ہوں ایسا نظام بنایا جائے توحید

اھلہ کا مطلب یہی ہے، تمام ممبران نے حتی کہ سعودیہ کے ممبران نے بھی اس کو نامنظور کیا انھوں نے کہا: یہ قرآن وحدیث کے خلاف ہے، قرآن کی تو یہی آیت ہے اور حدیث میں نبی پاک ﷺ نے فرمایا ہے: صوموا لرؤیته وأفطروا لرؤیته: جب چاند نظر آئے رمضان کے روزے شروع کرو اور چاند نظر آئے تو رمضان کے روزے ختم کرو، غرض تمام ممبران نے اس تجویز کو رد کر دیا کہ پوری دنیا کا چاند ایک نہیں ہوسکتا۔

پوری دنیا کے لئے ایک چاند مقرر کرنے کی ایک ہی صورت ہے کہ چاند کو آنکھ سے دیکھنے کا مسئلہ ختم کر دیا جائے اور قمر جدید یعنی نیو مون کا اعتبار کر لیا جائے، اس صورت میں ساری دنیا کا چاند ایک ہو جائے گا۔

قمر جدید (نیا چاند) کیا ہے؟

سورج مشرق سے نکل کر مغرب میں ڈوبتا ہے، چاند بھی اسی طرح مشرق سے نکل کر مغرب میں ڈوبتا ہے، یہ چاند کی روزمرہ کی چال ہے البتہ چاند کی ایک دوسری چال بھی ہے، وہ مغرب سے مشرق کی طرف بھی چلتا ہے، دو متضاد چالیں ایک ساتھ چلتا ہے اور یہ بات اللہ کے لئے کچھ مشکل نہیں، جیسے ہم فٹ بال کو لات مارتے ہیں تو گیند سامنے کی طرف بھی جاتی ہے اور گول بھی گھومتی ہے، اسی طرح چاند چوبیس گھنٹے میں ایک راؤنڈ لیتا ہے، اور دوسری چال مغرب سے مشرق کی طرف چوبیس گھنٹوں میں ۲۴ ڈگری چلتا ہے اور انتیس دن میں ایک راؤنڈ پورا کرتا ہے۔ اور جیسے آدھی زمین روشن رہتی ہے اور آدھی پر اندھیرا چھایا رہتا ہے، یہاں رات ہے اور چین میں سورج نکلا ہوا ہے، یہی حال چاند کا بھی ہے، اس کا آدھا حصہ جو سورج کی طرف ہے وہ روشن ہوتا ہے اور دوسرا آدھا جو سورج کے مقابل نہیں وہ تاریک ہوتا ہے، پس آدھا روشن اور آدھا غیر روشن ہونے میں چاند اور زمین یکساں ہیں، اور جب ہم چاند کو زمین سے دیکھیں اور اس کا روشن حصہ نظر نہ آئے تو اس کا نام مُحاق ہے، پھر جب ہمارے دیکھنے کا زاویہ بدلتا ہے تو چاند کے روشن حصہ کا ایک کنارہ ہمیں نظر آتا ہے، یہ ہلال ہے، پھر جوں جوں زاویہ بدلتا رہتا ہے ہر دن کا چاند بڑا ہوتا رہتا ہے، پھر ایک وقت ایسا

آتا ہے کہ چاند زمین اور سورج کے بیچ میں آجاتا ہے، پس چاند کا آدھا روشن حصہ دوسری طرف ہوجاتا ہے اور ہماری طرف تاریک والا حصہ ہوجاتا ہے، یہ زمانہ محاق کہلاتا ہے، پھر جب چاند مشرق کی طرف ہٹتا ہے اور سورج کے تقابل سے نکل جاتا ہے تو قمر جدید کہلاتا ہے، لیکن ابھی اس کا زاویہ اتنا باریک ہوتا ہے کہ زمین سے اس کے دیکھنے کا امکان نہیں ہوتا، جب چاند سورج سے کم از کم سولہ ڈگری پیچھے ہوجائے تب زمین سے دیکھنے کے قابل ہوتا ہے اور کھجور کی ٹہنی کی طرح نظر آتا ہے۔

غرض قمر جدید کا اعتبار کرلیں تو پوری دنیا کی تاریخ ایک ہوجائے گی، توحید اہلہ کی یہی صورت ہے، یہ تجویز رابطہ کے اجلاس میں پیش ہوئی مگر دنیا کے تمام علماء نے اس کو نامنظور کردیا، کانفرنس سے جب وہ دونوں حضرات لوٹے تو حضرت مولانا محمد منظور نعمانی صاحب رحمہ اللہ تبلیغی دورے پر سورت تشریف لائے، میں چونکہ ان کے رسالہ الفرقان میں لکھتا تھا اس لئے میرا ان سے تعارف تھا، حضرت نے ساری تفصیل مجھے سنائی اور فرمایا سعودیہ نے ایک خطرناک اسکیم شروع کی ہے اور اچانک یہ مسئلہ کھڑا کیا ہے تاکہ بے خبری میں اس کو پاس کرالیا جائے، علماء نے اگرچہ اس کو بالکل نامنظور کردیا ہے لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ یہ فتنہ رکے گا نہیں، اس سے پہلے کہ یہ بہت بڑا فتنہ بن جائے اس پر مضامین لکھنے چاہئیں، چنانچہ میں نے اسی زمانہ میں اس مسئلہ پر ایک مضمون لکھا جو الفرقان میں دو قسطوں میں شائع ہوا[۱] اس کے بعد کیا ہوا؟ سعودیہ خاموش ہوگیا، اس نے آگے مسئلہ نہیں چھیڑا مگر اس وقت سے اس کو ساری دنیا سے پہلے چاند نظر آتا ہے اور باقاعدہ اخباروں میں چھپتا ہے کہ فلاں قاضی کے پاس دو گواہوں نے گواہی دی، اس کو دو ہی گواہ ملتے ہیں، جبکہ سعودیہ کا مطلع عام طور پر صاف ہوتا ہے مگر کبھی رویت عامہ نہیں ہوتی۔

سعودیہ کا انوکھا چاند

اس سال (۲۰۰۹) میں تو عجیب تماشہ ہوا، مدینہ منورہ میں مولانا...... ہیں جو حضرت مولانا

(۱) یہ مضمون اس تقریر کے بعد ہے ۱۲

...... صاحب رحمہ اللہ کے خلیفہ ہیں اور ایک مولانا...... ہیں، ان کا لندن میں ایک صاحب کے پاس فون آیا کہ ہم نے فجر کے بعد سورج نکلنے سے پہلے اپنی آنکھوں سے چاند دیکھا اور شام کو سعودیہ نے رمضان کے چاند کا اعلان کر دیا، یہ اسی سال کا قصہ ہے اور یہ سلسلہ ۱۹۷۴ء سے چل رہا ہے جس کا پس منظر میں نے آپ حضرات کو سنایا، اُس وقت سعودیہ نے جو سوچا تھا اسی کے مطابق کرتا ہے، مگر چونکہ مسلمان اس کو مانیں گے نہیں اس لئے رویت کا ڈھونگ رچاتا ہے۔

کیا سعودیہ والے مسلمان نہیں؟

کچھ لوگ کہتے ہیں: کیا سعودیہ والے مسلمان نہیں؟ کیا وہ جھوٹ بولتے ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ مشرق میں جب چاند نظر آئے گا تو مغرب میں ضرور نظر آئے گا، کیونکہ مغرب میں چاند کا سورج سے فاصلہ بڑھ جائے گا، مگر آپ دیکھتے ہیں کہ سعودیہ چاند دیکھنے کا اعلان کرتا ہے، پھر ڈھائی گھنٹے بعد براعظم افریقہ میں سورج غروب ہوتا ہے، مگر پورے براعظم افریقہ میں یہ چاند کسی مسلمان کو نظر نہیں آتا، سعودیہ والے مسلمان ہیں تو کیا افریقہ والے مسلمان نہیں؟ اس کے بعد براعظم امریکہ میں سورج غروب ہوتا ہے، پورے براعظم امریکہ میں کسی مسلمان کو یہ چاند نظر نہیں آتا مگر سعویہ میں دو آدمیوں کو نظر آجاتا ہے بلکہ بعض مرتبہ تو ایسا ہوتا ہے کہ پورے راؤنڈ میں کہیں چاند نظر نہیں آتا، اس سال جس چاند کے دیکھنے کا سعودیہ نے اعلان کیا ہے وہ چاند پورے افریقہ میں کسی کو نظر نہیں آیا، پورے امریکہ میں کسی کو نظر نہیں آیا، چائنا میں نظر نہیں آیا، ملیشیا میں نظر نہیں آیا، انڈیا میں نظر نہیں آیا، ہاں مغربی انڈیا میں نظر آیا، گجرات کی جو پٹی ہے وہاں چاند نظر آیا اور وہاں سے جو نظر آنا شروع ہوا تو پورے راؤنڈ میں سب جگہ نظر آیا، مگر سعودیہ کا دیکھا ہوا چاند پورے راؤنڈ میں گجرات تک کہیں نظر نہیں آیا پس سعودیہ والے مسلمان ہیں تو کیا دنیا کے سارے مسلمان آنکھ بند کر کے چاند دیکھتے ہیں؟ اگر سعودیہ صاف کہہ دے کہ ہم قمر جدید پر اعلان کرتے ہیں تو کوئی جھگڑا نہیں، جس کو ماننا ہوگا مانے گا اور جس کو نہیں ماننا ہوگا نہیں مانے گا۔

مشکوک بات چھوڑ واور یقینی بات اختیار کرو

اور امر مشکوک کے بارے میں شریعت کا حکم وہ ہے جس کو نبی پاک ﷺ نے ایک حدیث میں فرمایا ہے: دَعْ مَا يُرِيْبُكَ إلى ما لا يريبك فإنَّ الصدق طُمَأْنِيْنَةٌ، وَالْكَذِبَ رِيْبَةٌ: کھٹک والی بات چھوڑ واور بے کھٹک بات اختیار کرو، سچ سے اطمینان ہوتا ہے اور جھوٹ سے دل بے چین ہوتا ہے، مثال کے طور پر آپ پولیس کے ہاتھوں میں پھنس جائیں اور آپ جھوٹ بول کر اپنا الو سیدھا کر لیں تو کر لیں، لیکن دل آپ کا بے چین رہے گا اور اگر آپ اس معاملہ میں سچ بولیں اور چار پیسے کا نقصان برداشت کر لیں تو اگر چہ نقصان ہوگا مگر دل آپ کا مطمئن رہے گا، پس سعودیہ کو ہم جھوٹا نہیں کہتے لیکن وہ مشکوک تو ضرور ہے اور شریعت کا حکم مشکوک کے بارے میں میں نے حدیث کے حوالہ سے بتایا کہ مشکوک کو یقینی بنالو، یقینی بات کیا ہے؟ حدیثوں میں حکم آیا ہے کہ ہر جگہ کی اور ہر ملک کی رویت پر رمضان شروع کیا جائے اور رویت ہی پر ختم کیا جائے، ہاں اگر کوئی ملک ایسا ہو کہ وہاں سال کا بیشتر حصہ مطلع ابر آلود رہتا ہو، چاند نظر نہ آتا ہو تو وہ نزدیک والے ملک کی رویت کا اعتبار کرے، اور اگر کبھی کبھی مطلع ابر آلود رہتا ہو تو وہ نزدیکی ملک کا اعتبار نہیں کرے گا، بلکہ وہ اپنے چاند کا اعتبار کرے گا، چاند نظر آیا تو ٹھیک ہے، نہیں نظر آیا تو مہینہ تیس کا شمار کریں گے، اس سال گجرات میں چاند دیکھا گیا اور انتیس کے اعتبار سے عید ہوئی لیکن پورے ہندوستان نے وہ رویت نہیں لی کیونکہ گجرات مغرب میں ہے اور مغرب کا چاند مشرق میں نظر نہ آئے ایسا ہو سکتا ہے لیکن مشرق کا چاند مغرب میں نظر نہ آئے یہ ممکن نہیں، یہ عجوبہ تو چالیس سال سے چل رہا ہے کہ سعودیہ میں چاند نظر آتا ہے اور افریقہ اور امریکہ میں نظر نہیں آتا، اگر سعودیہ کی رویت حقیقی ہوتی تو دنیا میں کوئی مسئلہ پیدا نہ ہوتا، یہ آیت پاک کے شروع حصہ کی وضاحت ہوئی، اس کے بعد جو ٹکڑا ہے اس کی بھی وضاحت کردوں تا کہ بات پوری ہو جائے۔

اسلام سے پہلے جب عرب حج کا احرام باندھتے تھے تو دروازہ سے گھر میں داخل نہیں ہوتے تھے اور گھر میں آنا ضروری ہے، پس وہ پچھلے دروازے سے گھر میں آتے تھے اور وہیں سے نکلتے بھی تھے، جیسے یہود کے یہاں سنیچر کو کوئی کام نہیں کر سکتے، لائٹ اگر کھلی ہے اور سنیچر

شروع ہو گیا تو اب اس کو بند نہیں کر سکتے، بند ہے اور سنیچر شروع ہو گیا تو اب اس کو کھول نہیں سکتے، لیکن کرتے سب کام ہیں، کرتے کیا ہیں؟ سڑک سے کسی مسلمان کو پکڑ لاتے ہیں اور اس سے کہتے ہیں: ذرا بٹن آن کر دو، یہ کیا دین پر عمل ہوا؟ یہ تو اللہ کو دھوکہ دینا ہوا، ایسا ہی حیلہ انہوں نے پرانے زمانہ میں مچھلیوں کے تعلق سے کیا تھا، بہر حال جیسا یہ یہودی کرتے ہیں ایسا ہی عرب بھی کرتے تھے کہ حج کا احرام باندھنے کے بعد سامنے کے دروازے سے گھر میں نہیں آتے تھے، پیچھے سیڑھی لگا کر گھر میں آتے تھے، قرآن نے کہا: ﴿وَلَيْسَ الْبِرُّ بِأَنْ تَأْتُوا الْبُيُوتَ مِنْ ظُهُورِهَا﴾ یہ کونسا نیکی کا کام ہے کہ تم گھروں میں پچھواڑے سے آؤ ﴿وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰى﴾ بلکہ نیکی کا کام یہ ہے کہ اللہ کے حکم پر عمل کرو اس کے حکم کی خلاف ورزی مت کرو۔

اللہ سے ڈرنے کا مطلب

اور اللہ سے ڈرنا ایسا ڈرنا نہیں جیسے سانپ سے، شیر سے اور دشمن سے ڈرتے ہیں، اللہ تو وہ ذات ہے جس سے محبت کرنی ہے، بلکہ اللہ سے ڈرنے مطلب یہ ہے کہ جیسے اطاعت شعار بیٹا باپ سے ڈرتا ہے، مخلص طالب علم استاذ سے ڈرتا ہے، عقیدت مند مرید پیر سے ڈرتا ہے، بیٹا سوچتا ہے کہ مجھے کوئی ایسا کام نہیں کرنا چاہئے کہ ابا ناراض ہو جائیں، جنت تو ماں باپ کے قدموں کے نیچے ہے اور وہی ناراض ہو گئے تو میرا کیا ہوگا؟ طالب علم پھونک پھونک کر قدم رکھتا ہے سوچتا ہے کہ میں کوئی ایسا کام نہ کروں کہ استاذ ناراض ہو جائیں، اگر وہ ناراض ہو گئے تو مجھے چار لفظ کہاں سے آئیں گے؟ عقیدت مند مرید سوچتا ہے کہ مجھے کوئی کام ایسا نہیں کرنا چاہئے کہ پیر ناراض ہو جائے، اگر پیر ناراض ہو گیا تو میرا اللہ سے تعلق کون جوڑے گا؟ تو جیسے یہ تینوں حضرات اپنے بڑوں کے احکام کی خلاف ورزی سے ڈرتے ہیں، ان کی ناراضگی سے ڈرتے ہیں ایسے ہی اللہ سے ڈرنا ہے کہ مومن بندے کو کوئی کام ایسا نہیں کرنا چاہئے کہ جس سے اللہ ناراض ہو جائیں، قرآن و حدیث میں جہاں جہاں آتا ہے کہ اللہ سے ڈرو، اللہ سے ڈرو، اس کا یہی مطلب ہے۔

غرض قرآن نے مشرکین سے کہا: ﴿وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰى﴾ نیکی کا کام یہ ہے کہ تم اللہ

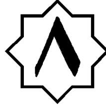
کے احکام کی خلاف ورزی سے ڈرو، اگر اللہ نے یہ حکم دیا ہو کہ احرام باندھنے کے بعد گھر میں مت جاؤ تو مت جاؤ، یہ کیا بات ہوئی کہ دروازے سے نہیں گئے، پیچھے سے گھس گئے ﴿وَأْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ أَبْوَابِهَا﴾ گھروں میں ان کے دروازوں سے آؤ، یعنی شریعت کا یہ حکم نہیں ہے کہ احرام باندھنے کے بعد گھر میں نہیں آسکتے، یہ تو تم نے خود گھڑ لیا ہے، ﴿وَاتَّقُوا اللّٰهَ﴾ اور اللہ سے ڈرو، یعنی اللہ نے جو احکام دیئے ہیں ان کی خلاف ورزی مت کرو، اللہ نے کہا ہے: احرام میں ٹوپی مت پہنو، مت پہنو، اللہ نے کہا ہے: احرام میں پگڑی مت باندھو، مت باندھو اللہ نے جو احکام دیئے ہیں ان کا پالن کرو اپنی طرف سے کچھ مت بڑھاؤ، ﴿لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ﴾ تاکہ تم کامیاب ہوؤ، مومن کی کامیابی اللہ کے احکام کی اطاعت میں ہے اپنی طرف سے احکام تجویز کرنے میں نہیں ہے۔

ربط مضامین

آیت میں مذکور دونوں مضمون میں نے آپ حضرات کو سمجھا دیئے، میرے بھائیو! آپ اس پر غور کریں کہ ان دونوں مضمونوں میں جوڑ کیا ہے؟ کہیں کی اینٹ کہیں کا روڑا تو بھان متی نے نہیں جوڑا؟ نہیں ایسا نہیں ہے، پہلا مضمون یہ ہے کہ مہینہ کے نئے چاند تمام لوگوں کے لئے الگ الگ اوقات مقرر کریں گے اور حج کے لئے ایک وقت مقرر کریں گے، اور دوسرا مضمون یہ ہے کہ اللہ نے جو احکام دیئے ہیں ان کی خلاف ورزی مت کرو، نہ اپنی طرف سے کسی حکم کا اضافہ کرو، یہی برو تقویٰ ہے، کامیابی کا راز اسی میں ہے، اپنی طرف سے نئے نئے شوشے چھوڑنا کہ اب تو ہم بڑے ماہر ہوگئے ہیں، حساب کتاب جاننے لگے ہیں، اب آنکھ سے چاند دیکھنے کی ضرورت نہیں، اب ہم ہیلی کاپٹر میں اڑ کر جائیں گے اور اوپر جا کر چاند دیکھیں گے، دوربینوں سے چاند دیکھیں گے، یہ کریں گے وہ کریں گے، ارے بھائی یہ سب باتیں چھوڑو اور جو اللہ کا حکم ہے اس پر عمل کرو، کامیابی اسی میں ہے۔

و آخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمين



توحیدا ھلہ کی تجویز سے متعلق سوال کا جواب

(از جناب مولانا سعید احمد صاحب پالن پوری استاذ دارالعلوم اشرفیہ راندیر)

محرم کے الفرقان میں رمضان وعید وغیرہ سے متعلق بعض ممالک اسلامیہ کے کچھ علماء کی اس رائے اور تجویز کا ذکر کیا تھا کہ کسی ایک ملک میں رویت ہلال ثابت ہو جانے پر دنیا کے تمام ملکوں کے لئے اسی رویت کو تسلیم کر کے پورے عالم اسلامی میں ایک ہی دن رمضان شروع اور ختم ہو اور ایک ہی دن عید اور بقرعید منائی جائے ''توحید اہلہ'' ان حضرات کی اسی تجویز کا عنوان ہے، اوران کے اس نقطۂ نظر کی بڑی دلیل اکثر ائمہ مجتہدین کا یہ نظریہ ہے کہ رویت ہلال میں اختلاف مطالع کا اعتبار نہیں۔

اس سلسلہ میں الفرقان میں مندرجہ ذیل سوالات کئے گئے تھے:

(۱) اس بارہ میں ہمیں براہ راست کتاب وسنت سے کیا رہنمائی ملتی ہے؟

(۲) جن ائمہ نے اختلاف مطالع کے اعتبار کا انکار کیا ہے اُن کا مقصد اس انکار سے کیا ہے؟ اور اس مسئلہ میں اختلاف حقیقی ہے یا صرف لفظی اور تعبیری؟

(۳) کیا حنفیہ کے مشہور مذہب عدم اعتبار اختلاف مطالع کی بنا پر ہندوستان و پاکستان کے احناف کے لئے اس تجویز کو قبول کرنے کی گنجائش ہے؟

گذشتہ اشاعت میں اس سوال کا ایک جواب شائع ہو چکا ہے، دوسرا جواب مولانا سعید احمد صاحب پالن پوری استاذ دارالعلوم اشرفیہ راندیر ضلع سورت کے قلم سے ہے۔ اس اشاعت میں نذر ناظرین کیا جارہا ہے۔ جوابات کا یہ سلسلہ ان شاءاللہ ابھی جاری رہے گا۔ (نعمانی)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پہلے سوال کا جواب

کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ ﷺ میں ہمیں 'تعدد اھلہ' کے لئے واضح حکم ملتا ہے، اس لئے 'توحید اھلہ' کا نظریہ قرآن وحدیث کے خلاف جائے گا، کتاب اللہ کی دو آیتیں مسئلہ ہلال سے بحث کرتی ہیں، ایک مسئلہ باب میں عبارت النص ہے اور دوسری کے 'اشارہ' سے مسئلہ ثابت ہوتا ہے۔

پہلی آیت: ﴿يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْأَهِلَّةِ، قُلْ هِيَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ﴾ (البقرہ ۱۸۹) مہینہ کے پہلے روز کے چاندوں کے سلسلہ میں لوگ آپ سے پوچھتے ہیں، آپ فرما دیجئے کہ وہ لوگوں کے لئے اور حج کے لئے اوقات (متعین کرنے والے) ہیں۔

تشریح: آیت کی تشریح پڑھنے سے پہلے ایک حدیث بھی ملاحظہ فرمالیں کیونکہ حدیث قرآن کا 'بیان' ہے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما اور طلق بن علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: **إن الله جعل هذه الأهلة مواقيت فإذا رأيتموه فصوموا وإذا رأيتموه فأفطروا، فإن غم عليكم فعدوا ثلاثين** (کنز العمال ج ۴ ص ۳۰۲، روایت ابن عمر حدیث ۶۰۸۴) اللہ پاک نے پہلی رات کے چاندوں کو اوقات مقرر کرنے والا بنایا ہے، لہٰذا جب اس کو دیکھو تو روزے رکھنا شروع کرو اور روزوں کا اختتام بھی اسے دیکھ کر ہی کرو اور اگر پہلی رات کا چاند تم سے چھپالیا جائے تو پھر (شعبان یا رمضان کے) تیس دن شمار کرو (اور شمار پورا ہونے پر رمضان کی ابتدا کرو یا روزوں کو ختم کرو)

اس حدیث میں چاند دیکھ کر روزہ رکھنے اور چاند دیکھ کر رمضان پورا کرنے کا حکم آیتِ پاک ہی سے مستنبط کیا گیا ہے یعنی حضور پاک ﷺ نے صوم کا مدار ''رویت'' پر رکھا ہے اور

وہ حکم اسی آیت سے مستنبط اور مستفاد ہے، لہٰذا مندرجہ ذیل حدیث بھی جو مختصر ہے اسی آیت کی تفسیر ہوگی۔

إذا رأيتُم الهلال فصوموا وإذا رأيتم فأفطروا، وإن غم عليكم فعدوا ثلاثين يوما (رواہ جابر وابو ہریرہ وابن عباس وحذیفہ، وطلق بن علی رضی اللہ عنہم) جب ہلال دیکھ لو تو روزے شروع کرو اور جب اسے دیکھ لو تو روزے ختم کرو اور اگر وہ تم سے چھپ جائے تو پھر تیس دن شمار کرلو۔

بہر حال ان احادیث کے پیشِ نظر تمام علماء نے آیت کا مطلب یہی سمجھا ہے کہ ہر مہینے کی پہلی رات کو نمودار ہونے والے چاند (اھلہ) لوگوں کے لئے تعیین اوقات کا ذریعہ ہیں یعنی ان کے ذریعہ مہینوں کا نظام بنتا ہے جس کے مطابق معاملات وکاروبار بھی چلتے ہیں اور تمام عبادات ادا کی جاتی ہیں علامہ آلوسی رحمۃ اللہ علیہ نے آیت کے ربط ماقبل سے بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ احکام صیام کے بعد یہ آیت اس لئے بیان ہوئی ہے کہ روزوں کا مدار رویت ہلال پر ہے (دیکھئے روح المعانی)

خلاصہ یہ ہے کہ حج کے علاوہ تمام عبادات ومعاملات میں ''تعدد اھلہ'' ہی اصل ہے۔ چاند ان کے لئے ایک وقت نہیں مقرر کرے گا بلکہ ان کے مطالع کے اختلاف سے علاحدہ علاحدہ اوقات مقرر کرے گا۔ صرف حج میں ''توحید اھلہ'' (اگر یہ تعبیر مناسب اور صحیح ہو) ہوگا اور حج کے لئے مکہ شریف کا ہلال معتبر ہوگا اور اسی کے لحاظ سے حج کا وقت مقرر ہوگا اور دنیا کے تمام خطوں کے لوگوں کو اس کی اتباع لازم ہوگی۔

دوسری آیت: ﴿فَمَنْ شَهِدَ مِنكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ﴾ (البقرہ ۱۰۵) سو جو کوئی تم میں سے مہینہ (رمضان) کو دیکھے وہ اس کا روزہ رکھے۔

تشریح: **شهد** کا مصدر **الشهادة** ہے اور اس کے معنی ہیں: **الإخبار بصحة الشيئ عن مشاهدة وعيان، مشتقة من المشاهدة التى تنبئ عن المعاينة** (عنایہ شرح ہدایہ فی اول کتاب الشہادۃ) اس سے معلوم ہوا کہ شہادت کے مفہوم میں رویت (دیکھنا) ملحوظ ہے اور مہینہ کا دیکھنا موقوف ہے چاند کے دیکھنے پر، اور چاند کا دیکھنا موقوف ہے اس کے افق پر

موجود ہونے پر۔

اب اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ”توحیداھلہ“ کی صورت میں سارے عالم اسلامی میں ”ہلال“ کا علم تو حاصل ہوسکتا ہے۔لیکن یہ تو من علم منکم الشهر ہوا۔حالانکہ قرآن پاک نے ﴿مَنْ شَهِدَ مِنكُمُ الشَّهْرَ﴾ فرمایا ہے، لہٰذا صرف علم کافی نہ ہوگا بلکہ اس سے مزید کسی چیز کی ضرورت ہوگی۔اب اگر ہمارے مطلع پر چاند ہے ہی نہیں تو پھر اس کے دیکھنے کا سوال کہاں پیدا ہوتا ہے، لہٰذا اس آیت پر اسی وقت عمل ہوسکتا ہے جبکہ ہمارے مطلع پر چاند موجود ہو۔ بلکہ صرف وجود بھی کافی نہیں اس کا دیکھنا بھی شرط ہے، چنانچہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث میں ہے کہ:صوموا لرؤيته وأفطروا لرؤيته، فإن حالت دونه غياية فأكملوا ثلاثين (کنز العمال) چاند دیکھ کر روزہ شروع کرو اور چاند دیکھ کر ہی روزے ختم کرو، لیکن اگر ہلال کے وَرے بادل آجائے (اور وہ نہ دیکھا جاسکے) تو پھر تیس دن کو شمار کرلو۔

بہرحال آیت عبارۃ النص (ما سيق لأجله الكلام) نہیں ہے بلکہ لفظ شہد کے اشارہ سے مسئلہ مفہوم ہوتا ہے۔عبارۃ النص میں تو مسئلہ یہ بیان ہورہا ہے کہ جو ماہ رمضان میں موجود ہو اسے ضرور اس میں روزہ رکھنا چاہئے اور فدیہ کی اجازت جو اوپر مذکور ہوئی منسوخ وموقوف کی گئی ہے (بیان القرآن، تھانویؒ) البتہ پہلی آیت عبارۃ النص ہے جیسا کہ آلوسی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے:وكفى به قدوةً۔

جواب (۲):

اختلاف مطالع کا اعتبار ہے یا نہیں؟ اس مسئلہ کو بیان کرنے والے فقہاء کرام تین ادوار میں تقسیم کیے جاسکتے ہیں۔متقدمین، زمانۂ وسطی کے فقہاء اور متاخرین۔تینوں زمانوں میں مسئلہ کی نوعیت علاحدہ علاحدہ رہی ہے، ذیل میں اجمالاً اس کو بیان کیا جاتا ہے۔

(الف) متقدمین کے یہاں اس میں اختلاف حقیقی ہے صرف لفظی اور تعبیری اختلاف نہیں ہے، لیکن پہلے یہ معلوم کرلینا ضروری ہے کہ ان کے نزدیک مسئلہ کی نوعیت کیا تھی؟

مطالع جمع ہے مطلع کی جس کے معنی ہیں ''طلوع کی جگہ'' لیکن ''اختلاف مطالع'' کی بحث میں اس لفظ کے معنی میں وسعت کردی گئی ہے، یہاں ''طلوع کی جگہ اور غروب کی جگہ'' ترجمہ ہوگا۔ اور یہ فقہاء کی اپنی اصطلاح ہے، لغت کا اس کے بالکل موافق ہونا ضروری نہیں۔

اور یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ سورج کے طلوع وغروب کے نقاط اسی طرح چاند کے طلوع کا افقی نقطہ ہر مقام کے لئے علاحدہ علاحدہ ہوتا ہے، کوئی بھی دو مقام متحد المطلع نہیں ہوتے جو مقامات قریب ہوتے ہیں (مثلاً میل دو میل کے فاصلے والے مقامات) وہاں اس اختلاف کا فرق عام طور پر محسوس نہیں کیا جاسکتا۔

فقہاء کرام نے پانچوں نمازوں کے اوقات اور یومیہ سحر وافطار میں اختلاف مطالع کا اعتبار کیا ہے بلکہ اس پر امت کا اجماع ہے، مثلاً ایک جگہ آفتاب غروب ہوگیا تو وہاں مغرب شروع کی جاسکتی ہے اور اس سے مغربی مقام میں جہاں غروب میں ابھی ایک منٹ باقی ہے، مغرب کی نماز شروع کرنا جائز نہیں ہے۔ وقس علی ہذا۔

اب سوال سامنے آتا ہے کہ طلوع ہلال کا مشاہدہ یہ ہے کہ اس میں معمولی بُعد مسافت سے اختلاف مطالع نہیں ہوتا۔ پھر رسول مقبول ﷺ کا دیہات کے اعرابی کی رویت کو تسلیم کرنا بھی مروی ہے [1] نیز یہاں مطالع کے اختلاف کا اعتبار کرنا باعثِ حرج بھی ہے اور فلکیاتِ کا سہارا بھی لینا پڑے گا جسے شریعت میں پسند نہیں کیا [2] یہ تمام امور ملحوظ رکھتے ہوئے جمہور کی رائے یہ ہوئی کہ ''طلوع ہلال'' کے مسئلہ میں مطالع کے اختلاف کا اعتبار نہ کیا جائے مثلاً ایک مقام پر رویت ہوئی تو اس مقام سے جانب مغرب جو مقامات ہوں گے وہاں رویت یقینی امر ہے، لیکن مذکورہ مقام سے جو مقامات جانب مشرق واقع ہوں وہاں رویت اور عدم رویت کے دونوں احتمال ہیں، لیکن جمہور نے مندرجۂ بالا وجوہ سے اس احتمال کو نظر انداز کردیا۔ جمہور نے مسئلہ کی تعبیر اس طرح کی ہے: **لا اعتبار لاختلاف المطالع فیلزم أهل المشرق برؤية أهل المغرب** (درمختار) لیکن حضرات شوافع نے دقیقہ سنجی سے کام لیا

(۱) رواہ ابوداؤد والترمذی والنسائی، وابن ماجہ والدارمی مشکوٰۃ ۱:۴/۱۷۴ (۲) قال النبی صلی اللہ علیه وسلم: **إنا أمة أمية لانكتب ولا نحسب إلخ** (حوالہ مذکورہ)

اور فقہ کی مشہور اصل کہ ”شک سے کوئی بات ثابت نہیں ہوسکتی اور نہ ثابت حکم ختم ہوسکتا ہے“ پیش نظر رکھ کر اختلافِ مطالع کا اعتبار کیا اور مذکورہ مقام کے مشرقی مقامات کے لئے اس رویت کو حجت نہیں مانا کیوں کہ احتمال سے نہ رمضان ثابت ہوسکتا ہے نہ ختم ہوسکتا ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ نہ تو دلائل کے اعتبار سے اس قول کو قوت مل سکتی تھی نہ ہی عملی آسانی سے اس کی تائید ہوسکتی تھی، اس لئے بعض شوافع نے بھی مجبور ہوکر جمہور کی ہمنوائی اختیار فرمائی۔

یہاں یہ بات بالکل فراموش نہ ہونی چاہئے کہ مشرق ومغرب دو اضافی لفظ ہیں کوئی بھی دو بستیاں ایک دوسرے کے لئے مشرقی اور مغربی مقامات کہلائیں گی بعد میں ان لفظوں کے معنی میں جو وسعت ہوئی ہے وہ متقدمین کی عبارتوں میں ہرگز مراد نہیں لی جاسکتی۔

(ب) ازمنۂ وسطی میں آکر یہ مسئلہ فقہاء کرام کے اذھان کی آماجگاہ بن گیا اور فقہاء کرام تین طرح کی باتیں کرتے نظر آتے ہیں۔

وہ حضرات جنھوں نے مسئلہ کے دائرے کو بہت زیادہ وسیع کردیا اور مشرق ومغرب (جو اضافی لفظ تھے) کا مفہوم بھی ان کے زمانہ میں بدل گیا، کیونکہ اب مغرب سے اندلس اور مشرق سے ایشا مراد لیا جانے لگا اور اس وسیع مفہوم پر ”ظاہر روایت“ کے الفاظ (**فليزم أهل المشرق برؤية أهل المغرب**) ان کو فٹ نظر نہ آئے تو وہ مجبور ہوئے اور ظاہر روایت کے حقیقی مفہوم کو وہ اچھی طرح سمجھ کر مسئلہ کی دوسری تعبیر کرنے لگے اور انھوں نے بلدان نائیہ اور قریبہ کی اصطلاح وضع کی اور ظاہر روایت کو انھوں نے بلدان قریبہ پر محمول کیا اور اس میں اختلاف مطالع کا اعتبار نہیں کیا اور بلدان نائیہ میں مطالع کے اختلاف کے اعتبار کرنے پر قرآن وحدیث کی روشنی میں وہ مجبور ہوگئے۔

متقدمین میں اور فقہاء کرام کے اس طبقہ میں اختلاف صرف لفظی ہے جیسا کہ بیان ہوچکا۔ دوسرے وہ فقہاء ہیں جنھوں نے یا تو اس لئے کہ مشرق ومغرب کے مفہوم کو اتنی وسعت نہیں دی تھی یا کچھ اور وجوہ ہوں گے بہرحال وہ اسی راہ پر جمے رہے جو انھوں نے متقدمین کے کلام سے متعین کی تھی، چنانچہ وہ بلدان شاسعہ اور قریبہ کا فرق کئے بغیر اختلاف مطالع کے اعتبار کا انکار کرتے رہے۔

اور کچھ حضرات وہ بھی ہیں جن کے ذہن میں مشرق ومغرب کا بدلا ہوا مفہوم ہے اور اس سلسلہ میں ظاہر روایت کا اعتبار کرنے سے جو الجھنیں رونما ہوتی ہیں اور قرآن وحدیث کے خلاف ظاہر روایت چلی جاتی ہے وہ اس سے بے خبر نہیں، نیز بعض حضرات نے جو بلدان نائیہ اور قریبہ کی تقسیم کر کے ظاہر روایت کا مصداق بلدان قریبہ کو بنایا ہے اس سے بھی وہ مطمئن نہیں یا یہ کہ قدیم مسلک کے خلاف صاف صاف واضح اور غیر مبہم انداز میں اعلان کرنے کے لئے وہ تیار نہیں، اس لئے یہ حضرات کچھ مبہم سی گول گول باتیں کرتے ہیں۔ مثلاً درمختار کی مذکورہ عبارت پیش نظر ہوتے ہوئے بھی علامہ شامی رحمہ اللہ نے حاشیہ **رد المحتار** میں عدم اعتبار اختلاف کی مثال دوسری دی ہے، وہ فرماتے ہیں:

"اگر مشرق میں جمعہ کی رات کو چاند دیکھا گیا اور مغرب میں سینچر کی رات کو چاند دیکھا گیا تو کیا اہل مغرب پر اہل مشرق کی رویت کا اعتبار جو ایک دن مقدم ہے ضروری ہوگا؟ ـــــ بعض حضرات فرماتے ہیں کہ اختلاف کا اعتبار ہوگا اور ہر مقام کے لوگوں کے لئے ان کی اپنی رویت ہی حجت ہوگی، یہ زیلعی، صاحب فیض اور بعض شوافع کا مختار ہے، لیکن ظاہر روایت یہ ہے کہ اختلاف مطالع کا اعتبار نہ ہوگا بلکہ جس کی رویت سابق ہے اسی کا اعتبار ہے۔ مالکیہ حنابلہ اور ہمارا یہی مختار ہے"

(ردالمحتار الی الدار المختار جلد ثانی بحث اختلاف مطالع)

حالانکہ علامہ نے جو مثال فرض کی ہے اس میں تو کسی کا اختلاف نہیں، کیونکہ جب چاند سورج سے بوقت غروب ایک خاص مقدار سے منفصل ہو جاتا ہے تو اب اس کی رویت ہوتی ہے، لہٰذا اس کے بعد والے مغربی ممالک میں چاند لامحالہ موجود ہوگا کیونکہ چاند کا انفصال بڑھتا ہی جائے گا ـــــ اور جب اُفق پر چاند کا وجود قطعی طور پر ہے تو اب اہل مشرق کی خبر ان کو لامحالہ ماننا ہوگی۔

اختلاف اس کے برعکس صورت میں ہے جو درمختار کی عبارت میں مذکور ہے، لیکن علامہ نے اس مثال کو چھیڑا ہی نہیں ـــــ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ وہ مثال اُلٹ کر مسئلہ کو بالکل ہلکا کر دینا چاہتے ہیں یا ظاہر روایت ان کے خیال میں جو الجھن پیدا کر رہی ہے وہ اس کا صالح

محمل تیار فرمارہے ہیں۔

مذکورہ تفصیل سے واضح ہو چکا ہوگا کہ اس دور کی ان تینوں جماعتوں میں اختلاف حقیقی ہے، لیکن پہلی جماعت اور ظاہر روایت کے درمیان اختلاف صرف لفظی ہے۔

(ج) تیسرا دور متأخرین فقہاء کا ہے۔ اس دور میں مشرق ومغرب کے ایک نئے معنی وضع کر لیے گئے ہیں اور آج کے ہر فقیہ کے ذہن میں مشرق ومغرب کے تقریباً وہی معنی ہیں جو آج کا جغرافیہ نویس لکھتا ہے۔

بہرحال متأخرین فقہاء کے یہاں بھی وہ تین جماعتیں موجود ہیں جو دوسرے دور میں تھیں، کوئی آج کے جغرافیہ کی اصطلاح ذہن میں رکھ کر ظاہر روایت کو مستدل بنا کر بانگ دہل کہتا ہے کہ اختلاف مطالع کا اعتبار نہیں اور مغرب یعنی امریکہ اور بلاد افریقہ کی رویت جب اہل مشرق یعنی ہندوچین میں طریق موجب سے پہنچ جائے تو اس کا اعتبار ضروری ہے، لیکن یہ مفتی زمانہ خوب جانتا ہے کہ اگر ایسا عمل ہونے لگا تو قرآن وحدیث کی صریح خلاف ورزی ہوگی اس لئے وہ بضد ہے کہ فتوی تو اس کا وہی رہے، لیکن عملاً وہ ایسا کبھی نہ ہونے دے اس لئے اس نے سہارا لیا ”طریق موجب“ کا۔ اور وہ ریڈیو، ٹیلی ویژن، ٹیلیفون وغیرہ جدید ذرائع خبر رسانی سے علم حاصل ہونے کا قطعاً انکار کر دیتا ہے۔ دنیا کے دیگر تمام معاملات میں اس کو ان ذرائع سے علم حاصل ہوسکتا ہے، لیکن نہیں حاصل ہوسکتا تو صرف اس مسئلہ میں نہیں حاصل ہوسکتا فیا للعجب! لیکن اب تو ہوائی جہاز اور راکٹ تیار ہو گئے ہیں اور خود چاند دیکھنے والا رات بھر میں سب جگہ سفر کر کے اطلاع کرسکتا ہے اور شہادت دے سکتا ہے ممکن ہے اب یہ کہا جانے لگے کہ طریق موجب یہ ہے کہ چاند دیکھنے والا پیدل چل کر گواہی دے۔

دوسری جماعت متاخرین فقہاء کی ہے جو بلدان شاسعہ میں اختلاف کا اعتبار کرتی ہے اور قریبہ میں نہیں کرتی اور ظاہر روایت کا محمل وہ اسی کو قرار دیتی ہے اور بلدان نائیہ کا مسئلہ ایک بالکل جدید مسئلہ قرار دیتی ہے، اور اس کا حکم قرآن وحدیث سے اخذ کرتی ہے۔

اسی طرح مذبذبین کی ایک جماعت بھی آج موجود ہے وہ حیران ہے کہ کیا کرے۔ ظاہر روایت جو اس کے خیال میں عام ہے چھوڑ دے یا پھر توحید اھلہ کی صدا بلند کرے،

حالانکہ قرآن پاک کی نصوص، احادیث اور صحابہ کا عمل (میری مراد حضرت کریب رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ ہے جس میں انھوں نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی شب جمعہ کی رویت کی اطلاع حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کو دی تھی لیکن انھوں نے اپنی سنیچر والی رویت ہی کا اعتبار کیا تھا اور فرمایا تھا: **هٰكذا أمرنا رسول الله صلى الله عليه وسلم**) بلدان نائیہ میں مطالع کے اختلاف کا اعتبار کرنے کے بارے میں نص قطعی ہیں۔

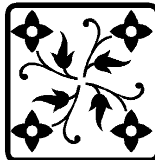
اب رہ جاتا ہے سوال ممالک شاسعہ اور قریبہ کی تعیین کا تو اس مسئلہ میں احقر کی ناقص رائے یہ ہے کہ حساب وتجربہ سے جن دو جگہوں میں تاریخیں نہیں بدلتی وہ تمام ممالک قریبہ ہیں اور جہاں کی تاریخیں ہمیشہ الگ رہتی ہیں یا گاہے گاہے بدل بھی جاتی ہیں وہ ممالک بعیدہ اور شاسعہ ہیں۔

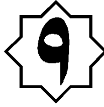
بہر حال یہ ہے اختلاف مطالع کے اعتبار کرنے نہ کرنے کے سلسلہ کی تفصیل —— سال بھر ہوا حضرت مولانا محمد میاں صاحب مدظلہ شیخ الحدیث مدرسہ امینیہ دہلی کا ایک سوال آیا تھا اس میں ضمنی سوال یہ بھی تھا اس کے جواب میں میں نے عرض کیا تھا کہ:

''متقدمین فقہاء احناف نے جو فرمایا تھا: **لا اعتبار لاختلاف المطالع**: اس ہیچ میرز کے خیال میں فقہاء متاخرین نے مراد متکلم سے زیادہ عموم پیدا کر دیا ہے''

وہ تفصیل کا محل نہیں تھا اس لئے بات مجمل کہی گئی تھی آج اللہ کے فضل سے اس کی تفصیل ہوگئی، کہاں دورِ اول کے مشرق ومغرب کا سیدھا سادہ مفہوم اور کہاں آج کے جغرافیہ کی وضع کردہ اصطلاح؟ متقدمین کی اصطلاح کو اس قدر وسعت دینا کیسے جائز ہے؟

جواب (۳): ہندو پاک کے حنفیہ کے لئے ہی نہیں بلکہ کسی بھی مسلمان کے لئے جائز نہیں کہ مصر، ترکی کے دیکھے ہوئے چاند کی خبر پر عمل کرے خواہ کیسے ہی قوی ترین ذرائع سے وہ خبر کیوں نہ پہنچ جائے۔ **اللّٰهم اهدنا فيمن هديت، وصل وسلّم على سيد المرسلين وعلى آله وأصحابه أجمعين۔**





اصلاح معاشرہ کے لئے ضروری احکام

خطبۂ مسنونہ کے بعد: ﴿قُلْ لِلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ أَبْصَارِهِمْ، وَيَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ، ذٰلِكَ أَزْكٰى لَهُمْ إِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌ بِمَا يَصْنَعُوْنَ ٥ وَقُلْ لِلْمُؤْمِنَاتِ يَغْضُضْنَ مِنْ أَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ، وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ إِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوْبِهِنَّ، وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ إِلَّا لِبُعُوْلَتِهِنَّ أَوْ آبَائِهِنَّ أَوْ آبَاءِ بُعُوْلَتِهِنَّ أَوْ أَبْنَائِهِنَّ أَوْ أَبْنَاءِ بُعُوْلَتِهِنَّ أَوْ إِخْوَانِهِنَّ أَوْ بَنِيْ إِخْوَانِهِنَّ أَوْ بَنِيْ أَخَوَاتِهِنَّ أَوْ نِسَاءِ هِنَّ أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُنَّ أَوِ التَّابِعِيْنَ غَيْرِ أُوْلِي الْإِرْبَةِ مِنَ الرِّجَالِ أَوِ الطِّفْلِ الَّذِيْنَ لَمْ يَظْهَرُوْا عَلٰى عَوْرَاتِ النِّسَاءِ، وَلَا يَضْرِبْنَ بِأَرْجُلِهِنَّ لِيُعْلَمَ مَا يُخْفِيْنَ مِنْ زِيْنَتِهِنَّ، وَتُوْبُوْا إِلَى اللّٰهِ جَمِيْعًا أَيُّهَا الْمُؤْمِنُوْنَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ﴾ (النور:۲۹و۳۰)

بزرگو اور بھائیو! آج نماز میں سورۃ النور پڑھی گئی ہے، اس سورت میں اصلاح معاشرہ کے احکام ہیں، معاشرہ میں خرابیاں کیسے پیدا ہوتی ہیں؟ اور معاشرہ کی اصلاح کیسے ہوگی؟ اور وہ کیا احکام ہیں جن کی پیروی کرنے سے معاشرہ سنور جائے گا؟ اس سورت میں یہی احکام ہیں۔

زنا بڑا بھاری گناہ ہے

ان احکام میں سے ایک حکم یہ ہے کہ خواہ مرد ہو یا عورت ہر ایک اپنی نگاہ کی حفاظت کرے، اس سے کیا فائدہ ہوگا؟ دونوں کی شرمگاہیں محفوظ رہیں گی، شرمگاہ کو محفوظ نہ رکھنے ہی سے زنا کا صدور ہوتا ہے اور زنا کی سزا بڑی سخت ہے جو سورت کے شروع میں بیان ہو چکی ہے اور زنا ان تین گناہوں میں سے ایک ہے جو بڑے بھاری گناہ ہیں، ایک: اللہ کے ساتھ شریک ٹھہرانا، دوسرا: کسی کو ناحق قتل کرنا، تیسرا: زنا کرنا۔ آج ہی عباد الرحمٰن کے گیارہ اوصاف پڑھے گئے ہیں، کچھ مثبت ہیں کچھ منفی۔ منفی اوصاف یہ ہیں: ﴿وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ

﴿إِلٰهًا آخَرَ﴾: اللہ کے خاص بندے اللہ کے ساتھ کسی دوسرے معبود کو نہیں پکارتے، یعنی شرک سے بالکل پاک ہیں ﴿وَلَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ إِلَّا بِالْحَقِّ﴾: اور وہ شخص جس کے قتل کرنے کو اللہ نے حرام کیا ہے اس کو قتل نہیں کرتے۔ مگر حق کی وجہ سے۔

چند حقوق جن کی وجہ سے قتل کیا جاتا ہے

کچھ قتل ایسے ہیں جن کے کرنے کو اللہ نے حلال کیا ہے، جیسے جہاد ہو تو اس میں دشمن کو قتل کرنا جائز ہے، بلکہ اس کا بڑا ثواب ہے، یا کسی نے جان بوجھ کر کسی کو قتل کیا تو قصاص میں قاتل کو قتل کرنا جائز ہے، یا شادی شدہ آدمی زنا کرے تو وہ سنگسار کیا جائے گا۔ یہ قتل کرنا بھی جائز ہے، اسی طرح مرتد کو قتل کرنا بھی ضروری ہے، مذہب اسلام میں داخل ہونے میں تو کوئی زبردستی نہیں، لا إكراه فی الدين لیکن مذہب اسلام سے نکلنے پر سخت پابندی ہے، کیونکہ اس سے فتنہ پیدا ہوگا، ساری دنیا میں وہ اسلام کو بدنام کرے گا، پس جب کوئی مرتد ہو جائے تو پہلے اس کے اشکالات رفع کرنے کی پوری کوشش کی جائے، پھر تین دن کی مہلت دی جائے، پھر بھی اگر وہ اسلام کی طرف واپس نہ لوٹے اور مرتد مرد ہے تو اسلامی حکومت اسے قتل کردے، اور عورت ہے تو اس کو نظر بند کردے، قتل نہ کرے، کیونکہ عورت گھر میں پوری زندگی گذار سکتی ہے، اس لئے اس کو نظر بند کر دیا جائے اور مرد کو جیل میں نہیں رکھ سکتے، اسلامی قانون میں جیل کی کوئی سزا نہیں، اس لئے لامحالہ وہ باہر گھومے گا اور فتنہ پھیلائے گا اس لئے اس کو قتل کر دیا جائے۔

یہ چند حقوق ہیں جن کی وجہ سے قتل کیا جاتا ہے، باقی جس نفس کو اللہ نے حرام کیا ہے اس کو قتل کرنا جائز نہیں، جیسے عام مسلمان یا اسلامی حکومت کا کوئی بھی شہری خواہ وہ کسی بھی مذہب کا ماننے والا ہو، اس کو قتل کرنا جائز نہیں۔

اور تیسرا گناہ ہے: ﴿وَلَا يَزْنُوْنَ﴾: وہ زنا نہیں کرتے ﴿وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ يَلْقَ أَثَامًا﴾: اور جو یہ تین کام کرے گا وہ گناہ سے ملاقات کرے گا یعنی گنہ گار ہوگا ﴿يُضَاعَفْ لَهُ الْعَذَابُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ﴾ قیامت کے دن اس کی سزا دو چند کر دی جائے گی ﴿وَيَخْلُدْ فِيْهٖ مُهَانًا﴾ اور وہ اس سزا میں ہمیشہ ذلیل ہو کر رہے گا۔

نگاہ نیچی رکھنا زنا سے بچاتا ہے

جب زنا کا گناہ اتنا سخت ہے تو اس سے بچنے کا سامان بھی کرنا پڑے گا، دریا میں اترو اور چاہو کہ کپڑے نہ بھیگیں یہ کیسے ممکن ہے؟ ننگے معاشرہ میں گھومو، نظریں لڑاتے پھرو اور چاہو کہ زنا نہ ہو یہ کیسے ممکن ہے؟ اس لئے زنا سے بچنے کے لئے کچھ اسباب بھی اختیار کرنے پڑیں گے تا کہ زنا کا گناہ وجود میں نہ آئے۔

وہ سبب یہ ہے کہ سب مرد و زن نظریں نیچی رکھیں، ایک دوسرے پر نظر نہ ڈالیں، زنا کے گناہ سے بچ جائیں گے۔ نظر بازی اس گناہ کا پہلا زینہ ہے، نگاہوں کے لڑنے کے بعد گناہ میں کوئی آڑ باقی نہیں رہتی، اب کسی بھی وقت گناہ صادر ہوسکتا ہے۔

نظر دو طرح کی ہوتی ہے

مرد اور عورتیں دو طرح کی نظر ڈالتے ہیں، ایک: اوپن (کھلی ہوئی) جس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ یہ اس عورت کو دیکھ رہا ہے، دوسری: ہیڈن (چھپی ہوئی) دیکھنے میں پتہ نہیں چلتا کہ دیکھ رہا ہے مگر دیکھ رہا ہے، اس کو نظر کی چوری کہتے ہیں، اللہ پاک ارشاد فرماتے ہیں: ﴿يَعْلَمُ خَائِنَةَ الْأَعْيُنِ وَمَا تُخْفِي الصُّدُوْرُ﴾: نگاہیں جو چوری کرتی ہیں اللہ اسے بھی جانتے ہیں اور دلوں میں جو باتیں چھپی ہوئی ہیں ان کو بھی جانتے ہیں۔ بہر حال مرد چونکہ برقعہ نہیں اوڑھتے اس لئے وہ عورتوں کو دو طرح سے دیکھتے ہیں اور عورتوں نے برقعہ ہی ایسا بنا رکھا ہے کہ اس میں آنکھیں کھلی رہتی ہیں، وہ سمجھتی ہیں کہ انھوں نے کپڑا اوپر نیچے باندھ لیا ہے اس لئے اب نگاہیں آزاد ہیں جس کو چاہیں دیکھیں حالانکہ پردے کا مقصد ہی نگاہوں کی حفاظت ہے۔ عورتیں برقعہ اوڑھ کر سمجھتی ہیں کہ ہم حجاب میں ہیں، اری! حجاب میں کہاں ہو؟ ساری دنیا کو تو دیکھ رہی ہو۔ اسی لئے قرآن میں دونوں کو یکساں حکم دیا: ﴿قُلْ لِلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ أَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ﴾ آپ مؤمنین سے کہیں: اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں۔ ﴿وَقُلْ لِلْمُؤْمِنَاتِ يَغْضُضْنَ مِنْ أَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ﴾ اور مسلمان عورتوں سے کہو کہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں، اور

اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں۔ان دونوں حکموں میں (نظر نیچی رکھنے میں اور شرمگاہ محفوظ رہنے میں) جوڑ یہ ہے کہ شرمگاہ کا گناہ نگاہ کی حفاظت نہ کرنے سے وجود میں آتا ہے، پس جب شرمگاہ کی حفاظت ضروری ہے تو اس کا سبب 'نگاہ نیچی رکھنا' بھی ضروری ہے، لہٰذا شروع سے اگر تم چلوگے تو گناہ سے بچ سکوگے ورنہ نہیں ﴿ذٰلِكَ أَزْكٰى لَهُمْ﴾ یہ بات مردوں کے لئے زیادہ ستھری ہے، مرد اگر ستھرے رہنا چاہتے ہیں، شرمگاہ کے گناہ سے بچے رہنا چاہتے ہیں تو اس کا راستہ یہی ہے کہ اپنی نگاہ نیچی رکھیں ان کی شرمگاہیں خود بخود محفوظ رہیں گی ﴿إِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌ بِمَا يَصْنَعُوْنَ﴾: بیشک اللہ تعالیٰ باخبر ہیں ان کاموں سے جو وہ کرتے ہیں، یعنی اللہ تعالیٰ اوپن نظر اور ہیڈن نظر دونوں سے واقف ہیں۔ پھر ٹھیک یہی حکم عورتوں کو دیا: اور آپ مؤمن عورتوں سے کہیں کہ وہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں۔ وہی مضمون جو مردوں کے لئے تھا وہی عورتوں کے لئے بھی ہے، لیکن مردوں کے لئے تو اتنی بات کافی تھی کہ وہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں، عورتوں کے لئے اتنی بات کافی نہیں، ان کے لئے کچھ دوسرے احکام بھی ہیں اور یہ احکام اگلی آیت میں ہیں اور یہی احکام مجھے بیان کرنے ہیں۔

مرد اور عورت کا ستر ایک ہے

ستر: مرد اور عورت کا ایک ہے، ناف سے لے کر گھٹنے کے نیچے تک ستر ہے، یعنی چھپانے کا بدن ہے، اس کو بے ضرورت کسی کے سامنے کھولنا جائز نہیں، ایک عورت دوسری عورت کے سامنے جسم کا یہ حصہ بے ضرورت نہیں کھول سکتی، مجبوری کی بات الگ ہے، جیسے بچہ کی ولادت ہے یا کوئی آپریشن کرانا ہے تو وہ الگ مسئلہ ہے لیکن بے ضرورت نہیں کھول سکتی۔مرد وعورت دونوں کا یہی ستر ہے۔

عورت کے لئے حجاب ہے اور وہ تین مرحلوں میں ہے

پھر مرد کے لئے کوئی حجاب نہیں، لیکن عورت کے لئے ستر کے علاوہ حجاب بھی ہے اور وہ حجاب تین مرحلوں میں ہے:

پہلا حجاب

اللہ سے بندی کا حجاب ہے، جب عورت نماز کے لئے کھڑی ہو تو چہرہ: جتنا وضو میں دھونا فرض ہے اور دونوں ہاتھ پہنچوں تک اور دونوں پیر ٹخنوں سے نیچے تک کھلے رہ سکتے ہیں۔ یہ تین اعضاء نماز کے حجاب میں داخل نہیں، لیکن اگر کوئی عورت ہاتھ میں دستانے اور پیر میں موزے پہن کر نماز پڑھے تو اچھی بات ہے، ضروری نہیں، کیونکہ یہ نماز کے حجاب میں داخل نہیں، البتہ ٹخنے چھپانے ضروری ہیں اگر وہ کھلے رہیں گے تو عورت کی نماز نہیں ہوگی، ایسے ہی کان چھپانے بھی ضروری ہیں اگر ان کو کھلے رکھ کر نماز پڑھے گی تو نماز نہیں ہوگی۔ صرف تین اعضاء ہی کھلے رہ سکتے ہیں باقی بدن چھپا کر نماز پڑھنا ضروری ہے۔ یہ بندی کا اللہ سے حجاب ہے۔

دوسرا حجاب

محارم کا حجاب ہے، یعنی ان لوگوں کے ساتھ ہے جن سے نکاح ہمیشہ کے لئے حرام ہے، ان کے سامنے پیٹ اور اس کے مقابل کی پیٹھ نہیں کھول سکتی، اس کے علاوہ باقی بدن کھول سکتی ہے، سینہ، سینے کے مقابل کی پیٹھ، سینہ سے اوپر کا حصہ، دونوں ہاتھ اور دونوں پنڈلیاں یہ سب اعضاء محارم کے سامنے عورت کھول سکتی ہے لیکن کھول سکنے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ کھول کر رہے۔

پنڈلی، سر اور گردن وغیرہ میں تو آپ کو کوئی اشکال نہیں ہوگا لیکن سینہ اور اس کے مقابل کی پیٹھ حجاب میں نہ ہونے پر آپ کو اشکال ہو سکتا ہے، پس جاننا چاہئے کہ یہ ایک معاشرتی ضرورت ہے، عورت گھر میں چھاتی کھول کر بچہ کو دودھ پلاتی ہے اور اسی گھر میں باپ، خسر اور بھائی ہیں، پس اگر سینہ کو حجاب میں لیا جائے گا تو عورت بچہ کو دودھ کیسے پلائے گی؟ اس ضرورت سے سینہ کو محارم کے حجاب سے باہر رکھا گیا ہے، اور جب سینہ کا حصہ باہر رکھا گیا تو اس کے مقابل کی پیٹھ کو بھی باہر رکھا گیا۔ اور پیٹ کھولنے کی کوئی ضرورت نہیں، اس لئے پیٹ کو اور اس کے مقابل کی پیٹھ کو حجاب میں لیا۔ غرض یہ ایک معاشرتی ضرورت ہے اگر اس پر پابندی لگائی جائے گی تو کام نہیں چلے گا۔

تیسرا حجاب

اجنبیوں کا حجاب ہے اور وہ پورے بدن کا حجاب ہے، اس میں کوئی استثناء نہیں، ہاتھ، پاؤں، چہرہ سب کا حجاب ہے بلکہ آواز کا بھی حجاب ہے، عورت کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنی آواز اجنبیوں کو نہ سنائے، ٹیلی فون پر بھی نہ سنائے، کوئی دروازے پر دستک دے تو بھی نہ سنائے، ہاں مجبوری ہو تو ٹھیک ہے، فون کی گھنٹی بج رہی ہے اور گھر میں کوئی مرد نہیں، تو عورت فون اٹھا کر جواب دے سکتی ہے، مگر سریلی آواز میں جواب نہ دے کراری آواز میں جواب دے یہ حکم قرآن میں ہے: ﴿فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَيَطْمَعَ الَّذِیْ فِیْ قَلْبِهٖ مَرَضٌ﴾ کراری آواز میں جواب دے کہ صاحب خانہ گھر میں نہیں۔ عورت کا یہ پوچھنا کہ تم کون ہو؟ تمہارا نسب نامہ کیا ہے؟ تم کہاں سے بول رہے ہو؟ یہ سب غلط ہے، عورتوں کو اس سے کیا لینا ہے، بس اتنا کہہ دے کہ صاحب خانہ گھر میں نہیں، اور اگر گھر میں کوئی مرد ہے یا سمجھ دار بچہ ہے تو وہ فون اٹھا کر جواب دے، عورتیں فون نہ اٹھائیں۔ مگر آج کل ایسی مصیبت آئی ہوئی ہے کہ کسی کے گھر فون کرو پہلے عورت فون اٹھاتی ہے، وہ دنیا بھر کی تفصیل پوچھتی ہے، پھر شوہر کو دیتی ہے، وہ بھی وہیں بیٹھا ہے۔ یہ اسلامی معاشرہ کے خلاف ہے، عورتوں کو اس سے پرہیز کرنا چاہئے۔

حجاب کے اس تیسرے مرحلے کا ذکر سورۃ الاحزاب میں ہے: ﴿يٰاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ وَبَنَاتِكَ وَنِسَاءِ الْمُؤْمِنِيْنَ يُدْنِيْنَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيْبِهِنَّ﴾: اے پیغمبر! آپ اپنی بیویوں سے، بیٹیوں سے اور مسلمانوں کی عورتوں سے کہہ دیں کہ وہ اپنے چہرے پر اپنی چادریں کھینچ لیں، یعنی جب کسی ضرورت سے گھر سے نکلیں تو اوڑھنا چہرے پر کھینچ لیں، یہ چہرے کا حجاب ہے اور جب چادریں اپنے چہرے پر کھینچ لیں گی تو ہاتھ تو چھپے ہوئے ہونگے ہی، اگر چھپے ہوئے نہ ہوں تو کوئی خاص حکم ان کے بارے میں نہیں دیا۔ اسی طرح پیروں کے بارے میں بھی کوئی خاص حکم نہیں دیا، صرف چہرے کے بارے میں حکم دیا کہ عورتیں چہرے پر چادر کھینچ کر گھر سے نکلیں، کیونکہ چہرہ مجمع المحاسن ہے سارے جسم کی بیوٹی (خوبصورتی) چہرے میں اکٹھا ہوتی ہے، اور وہ پانچ حواس خمسہ جن سے علم حاصل کیا جاتا ہے جو انسان کا کمال ہیں، وہ سب چہرے میں جمع ہیں، اس لئے سارے جسم کی خوبصورتی چہرے میں آجاتی ہے، اس

لئے خاص طور پر اسی کے حجاب کا حکم دیا اور ہاتھوں اور پیروں کے بارے میں کچھ نہیں فرمایا۔

اور یہاں سورۃ النور میں جو لمبی آیت ہے وہ حجاب سے متعلق نہیں، بلکہ اس کا تعلق اصلاح معاشرہ سے ہے یعنی عورتوں کو اپنے محارم اور محارم جیسوں کے سامنے کس طرح رہنا چاہئے؟ کونسا جسم کھولنا جائز ہے اور کونسا ناجائز۔ چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں: ﴿وَلَا یُبْدِیْنَ زِیْنَتَهُنَّ اِلَّا مَاظَهَرَ مِنْهَا﴾: اور ظاہر نہ کریں عورتیں اپنی زینت۔ زینت سے مراد زیور بھی ہے اور زیور کا محل بھی ﴿اِلَّا مَاظَهَرَ مِنْهَا﴾ مگر وہ اعضاء جو عام طور پر کھلے رہتے ہیں جن کو ہر وقت چھپائے رکھنا دشوار ہے، ان کو مستثنیٰ کیا۔ وہ اعضاء کونسے ہیں؟ چہرہ، ہتھیلیاں اور دونوں پیر۔ پیروں کا روایت میں ذکر نہیں، چہرے اور ہتھیلیوں کا ذکر ہے مگر فقہاء نے ہتھیلیوں کے حکم میں پیروں کو بھی لیا ہے۔ گھر میں ہر وقت ان تین اعضاء کو چھپائے رکھنا بہت مشکل ہے، اس لئے ان کا استثناء کیا کہ ان کو کھول سکتے ہیں، اور ان سے زائد بدن بھی اگرچہ کھولنا جائز ہے جیسا کہ محارم کے حجاب کے بیان میں آیا ہے، مگر معاشرہ کی درستگی کا تقاضا یہ ہے کہ بدن کا اور حصہ کھلا نہ رہے۔

بلکہ جسم کے وہ حصے جو کپڑے کے اوپر سے جھلکتے ہیں جیسے عورت جوان ہو تو چھاتی جھلکے گی، اس کے بارے میں مستقل حکم دیا کہ اوڑھنی سینہ پر ڈالے رہیں تا کہ سینہ کا ابھار محسوس نہ ہو: ﴿وَلْیَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰی جُیُوْبِهِنَّ﴾: اپنی اوڑھنیاں اپنے گریبانوں پر ڈالے رکھیں معلوم ہوا کہ کچھ اعضاء وہ ہیں جو کپڑے کے اوپر سے بھی محسوس نہیں ہونے چاہئیں، اسی وجہ سے میں کہتا ہوں کہ پتلون میں آدمی آدھا ننگا ہوتا ہے، دیکھو عورت نے کرتہ پہن رکھا ہے، مگر چھاتی کے ابھار پر قرآن نے دوپٹہ ڈلوایا تا کہ وہ ابھار ظاہر نہ ہو، معلوم ہوا کہ صرف کپڑا پہن لینا کافی نہیں، کپڑا ایسا ہونا چاہئے کہ اس میں جسم کے پچھلے حصہ کا ابھار محسوس نہ ہو۔

قرآن کے دو خاص اسلوب

اس کے بعد جاننا چاہئے کہ قرآنِ کریم کا ایک خاص اسلوب ہے اور وہ یہ ہے کہ اگر قرآنِ کریم کو ایک سوال کے بارے میں دو باتیں بتانی ہوتی ہیں تو وہ ایک ساتھ نہیں بتاتا بلکہ

سوال مکرر لاتا ہے، اسی طرح ایک مستثنیٰ منہ سے دو استثناء کرنے ہوتے ہیں تو دونوں استثناء ایک ساتھ نہیں کرتا، بلکہ مستثنیٰ منہ دوبارہ لاکر دوسرا استثناء کرتا ہے، جیسے سورۂ عنکبوت میں ہے: ﴿یَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ﴾: لوگ آپ سے عذاب جلدی طلب کرتے ہیں، قرآن نے اس کا جواب دیا۔ پھر اگلی آیت میں فرمایا: ﴿وَیَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ﴾ پھر دوسرا جواب دیا۔ یہ کوئی الگ الگ سوال نہیں تھے، ایک ہی سوال تھا، مگر اس کے بارے میں دو باتیں بتلانی تھیں اس لئے پہلے سوال لاکر پہلی بات بتائی پھر وہی سوال دوبارہ لاکر دوسری بات بتائی، یہ قرآنِ کریم کا خاص انداز بیان ہے، ایسا ہی یہاں کیا ہے چونکہ دو استثناء ایک ساتھ کرنے سے کلام پیچیدہ ہو جاتا ہے اور فصاحت سے خارج ہو جاتا ہے اس لئے ﴿وَلَا یُبْدِیْنَ زِیْنَتَهُنَّ﴾ کہہ کر ﴿إِلَّا مَاظَهَرَ مِنْهَا﴾ کا پہلا استثناء کیا، پھر دوسرا استثناء کرنے کے لئے مستثنیٰ منہ کو دوبارہ لائے، فرمایا: ﴿وَلَا یُبْدِیْنَ زِیْنَتَهُنَّ﴾ پھر دوسرا استثناء شروع کیا: فرمایا: ﴿إِلَّا لِبُعُوْلَتِهِنَّ أَوْ آبَائِهِنَّ﴾ الآیۃ یعنی پہلے جو حکم دیا تھا کہ عورتیں چہرہ، ہتھیلیاں اور پیروں کے علاوہ اپنی زینت ظاہر نہ کریں تو کس کے سامنے ظاہر نہ کریں؟ شوہر کے سامنے، باپ کے سامنے، خسر کے سامنے، عورت کے اپنے بیٹوں (پہلے شوہر سے) کے سامنے، اپنے شوہر کے بیٹوں (دوسری بیوی سے) کے سامنے، بھائیوں کے سامنے، بھتیجوں کے سامنے، بھانجوں کے سامنے، ہی اپنی زینت ظاہر کریں یعنی صرف ہاتھ پاؤں اور چہرہ کھلا رکھیں۔

پھر چند اور لوگوں کو محارم کے ساتھ ملایا، فرمایا: ﴿أَوْ نِسَائِهِنَّ﴾: یا اپنی عورتوں کے سامنے، یعنی مسلمان عورتوں کے سامنے چہرہ وغیرہ کھول سکتی ہیں۔ قرآنِ کریم میں یہ مسئلہ دو جگہ آیا ہے۔ غیر مسلم عورت اجنبی مردوں کے حکم میں ہے، اس سے پردہ واجب ہے۔ مگر ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: جن احکام میں مسلمان غفلت برتتے ہیں ان میں سے ایک غیر مسلم عورتوں سے پردہ کرنے کا مسئلہ ہے، اور ایک استیذان کا مسئلہ ہے جب دوسرے کے گھر جائیں تو اجازت کے بغیر گھر میں نہ گھسیں، لوگ اس میں بھی غفلت برتتے ہیں، خاص طور پر عورتیں تو اجازت لیتی ہی نہیں۔ بہر حال مسلمان عورتیں بھی مستثنیٰ ہیں، ان کے سامنے عورتیں زینت ظاہر کرسکتی ہیں۔

دوم:﴿أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُنَّ﴾: یا غلام باندیوں کے سامنے زینت ظاہر کرسکتی ہیں اگرچہ باندی غیر مسلم ہو۔ پرانے زمانے میں غلام باندی ہوتے تھے، مالکہ اپنے غلام باندی کے سامنے زینت کی جگہیں جو مستثنیٰ ہیں ظاہر کرسکتی ہے یا نہیں؟ فرمایا کہ چہرہ وغیرہ ظاہر کرسکتی ہیں، کیونکہ مالکہ کو ان سے ہر وقت کام لینا ہوتا ہے، اس لئے حرج کی وجہ سے ان کا بھی استثناء کیا۔

سوم:﴿أَوِ التَّابِعِينَ غَيْرِ أُولِي الْإِرْبَةِ مِنَ الرِّجَالِ﴾: یا طفیلی آدمی جو کسی گھر والوں کے ساتھ رہتا ہے، کھانا پینا ان کے ساتھ ہے اور اس میں مردانی خواہش نہیں ہے، تو اس کو بھی مستثنیٰ کیا اور محارم کے ساتھ لاحق کیا۔

چہارم:﴿أَوِ الطِّفْلِ الَّذِينَ لَمْ يَظْهَرُوا عَلَىٰ عَوْرَاتِ النِّسَاءِ﴾: یا وہ بچے جن کو ابھی عورتوں کے راز معلوم نہیں، یعنی زنانہ باتیں وہ ابھی نہیں سمجھتے ان کو بھی محارم کے ساتھ لاحق کیا۔ رہی یہ بات کہ بچہ کتنی عمر تک زنانہ باتوں کو نہیں سمجھتا؟ یہ زمانے اور ملکوں کے حساب سے مختلف ہوتا ہے، آج کل ٹی وی کا منحوس دور آ گیا ہے، اس میں تو بچہ سات سال ہی میں سب کچھ سمجھنے لگتا ہے۔

پھر ایک حکم تو پہلے دیا تھا کہ عورتیں اپنے سینے پر دوپٹے ڈالے رہیں تا کہ سینہ کا ابھار محسوس نہ ہو، اب ایک دوسرا حکم اسی قبیل کا دیتے ہیں:﴿وَلَا يَضْرِبْنَ بِأَرْجُلِهِنَّ لِيُعْلَمَ مَا يُخْفِينَ مِنْ زِينَتِهِنَّ﴾: چلتے وقت پاؤں زمین پر زور سے نہ پٹخیں تا کہ کپڑے میں چھپا ہوا زیور نہ بجے اور گھر کے لوگوں کو پتا نہ چل جائے کہ کپڑے کے اندر یہ زیور ہے، کہاں تک احتیاط کے احکام ہیں؟ یہ سب وہ احکام ہیں جن کا پاس ولحاظ کرنے سے معاشرہ پاکیزہ رہتا ہے۔ لیکن انسان بہرحال انسان ہے، کوتاہی مردوں سے بھی ہوسکتی ہے اور عورتوں سے بھی، اس لئے آخر میں فرمایا:﴿وَتُوبُوا إِلَى اللَّهِ جَمِيعًا أَيُّهَ الْمُؤْمِنُونَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ﴾: اے مؤمنو! تم سب مرد وزن اللہ کے سامنے توبہ کرو، تا کہ تم کامیاب ہوؤ۔ یہ میں نے آیت کا ترجمہ کیا ہے، زیادہ تفصیل نہیں کی، اور دھیان میں رکھنے کی خاص بات یہ ہے کہ یہ آیت حجاب کی آیت نہیں ہے، وہ تو سورۂ احزاب میں ہے، یہ آیت تو معاشرہ میں عورتوں کو اپنے محارم وغیرہ کے سامنے کس طرح رہنا چاہئے اس کو بیان کرتی ہے، اجنبیوں کے ساتھ حجاب

کے مسائل اس آیت میں نہیں ہیں۔ بعض بڑے لوگوں کو دھوکہ اس سے ہوا ہے کہ انھوں نے دونوں استثناؤں کو الگ الگ کر دیا، حالانکہ آیت میں ایک مستثنیٰ منہ سے دو استثناء ہیں اور دونوں استثناء ایک ہی مسئلہ سے متعلق ہیں۔ وآخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمین

سوال (۱): چچا اور ماموں کا ذکر آیت میں کیوں نہیں؟ وہ بھی تو محرم ہیں۔

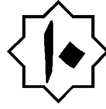
جواب: بے شک وہ بھی محرم ہیں، مگر معاشرہ میں ہر وقت ان کے ساتھ رہنا نہیں ہوتا۔ اور آیت میں ذکر ان لوگوں کا ہے جن کے ساتھ عورتوں کو ہر وقت رہنا ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے مسلمان عورتوں، عورتوں سے مطلب نہ رکھنے والے طفیلیوں، غلاموں اور نابالغ بچوں کا تذکرہ کیا اور چچا ماموں کا تذکرہ نہیں کیا۔

سوال (۲): اس زمرہ میں شوہر کا تذکرہ کیوں کیا، اس سے تو کوئی پردہ نہیں؟

جواب: عورت کو شوہر کے سامنے بھی سلیقہ سے رہنا چاہئے، خاص وقت کی بات الگ ہے، علاوہ ازیں: شوہر کو اس زمرہ میں اس لئے لیا گیا ہے کہ آیت میں مذکور تخفیف اس عورت کے لئے ہے جو شوہر والی ہے اور شوہر گھر پر موجود ہے، سفر میں گیا ہوا نہیں ہے۔ کنواری لڑکی اور بیوہ عورت کے لئے اجنبیوں کے سامنے چہرہ وغیرہ کھولے رکھنے کی گنجائش نہیں، اسی طرح جس عورت کا شوہر لمبے سفر میں گیا ہوا ہے اس کے ساتھ اجنبیوں کو تنہائی میں جمع ہونے کی بھی اجازت نہیں، حدیث میں اس کی ممانعت آئی ہے۔

سوال (۳): ہمارے معاشرہ میں جیٹھ، دیور بھی ساتھ رہتے ہیں، کیا ان کے ساتھ بھاوج کے لئے رہن سہن میں کچھ تخفیف ہے؟

جواب: ممکن ہے، مگر تین شرطوں کے ساتھ: ایک: شوہر گھر پر موجود ہو، لمبے سفر میں گیا ہوا نہ ہو، دوم: جیٹھ، دیور گھر میں اطلاع کر کے آئیں، ایسے ہی گھس نہ آئیں۔ سوم: تنہائی میں بھاوج کے ساتھ جمع ہو کر بے تکلف باتیں نہ کریں۔ حدیث میں ہے: ''عورتوں کے پاس تنہائی میں جانے سے بچو!'' ایک انصاری نے پوچھا: جیٹھ، دیور کا کیا حکم ہے؟ آپؐ نے فرمایا: ''جیٹھ دیور تو موت ہیں!'' یعنی بڑا فتنہ ہیں۔ کیونکہ جیٹھ دیور کی بھاوج سے بے تکلفی ہوتی ہے، اس لئے فتنہ پیش آنے میں دیر نہیں لگتی۔



تین کام جو کامیابی کی کنجی ہیں

خطبۂ مسنونہ کے بعد:﴿قَدْ أَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى ۝ وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى۝ بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا۝ وَالآخِرَةُ خَيْرٌ وَأَبْقٰى۝ إِنَّ هٰذَا لَفِي الصُّحُفِ الْأُوْلٰى۝صُحُفِ إِبْرَاهِيْمَ وَمُوْسٰى﴾

بزرگو اور بھائیو! اللہ تعالیٰ کا ہم پر بے پایاں احسان ہے کہ اس نے ہمیں سیدھا راستہ دکھایا، اگر اللہ تعالیٰ ہماری راہنمائی نہ کرتے، انبیاء ورسل کو مبعوث نہ فرماتے، وحی نازل نہ کرتے، تو ہم اپنی عقل سے سیدھا راستہ نہیں پاسکتے تھے، اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو عقل دی ہے، علم حاصل کرنے کے وسائل دیئے ہیں، آنکھیں، ناک، کان، سوچنے سمجھنے اور ادراک کرنے کی قوت دی ہے، مگر اُن سے انہی چیزوں کا علم حاصل ہوسکتا ہے جو ان کے دائرہ میں آتی ہیں، اور جو چیزیں پس پردہ ہیں ان کو دریافت کرنے کے لئے انسانی عقل کافی نہیں، انسان اپنی عقل وفہم سے ان کو بوجھ نہیں سکتا، جبکہ ان حقیقتوں کو جاننا اور سمجھنا ضروری تھا۔

معرفتِ الٰہی کے لئے وحی کی ضرورت

اللہ عزوجل ہمارے خالق ومالک اور پالنہار ہیں وہ ہماری اس محسوس دنیا سے ماوراء ہیں۔ ان کی معرفت ان کی صفات کی معرفت کے لئے انسانی عقل کافی نہیں۔ انسان اپنی عقل سے نہ اللہ کی ذات کی معرفت حاصل کرسکتا ہے، نہ ان کی صفات کی، کیونکہ یہ چیزیں انسانی عقل کے دائرہ میں نہیں آتیں، اس کے لئے انبیاء ورسل اور وحی کی ضرورت ہے، انبیاء ہی انسان کو اس حقیقت سے واقف کرسکتے ہیں، بلکہ جنت وجہنم جو انسان کا آخری ٹھکانہ ہیں ان کو بھی انسان بذات خود نہیں جان سکتا، جنت وجہنم کی حقیقت جاننے کے لئے اور جہنم سے

بچنے اور جنت پانے کے لئے بھی انسان خدائی رہنمائی کا محتاج ہے، چنانچہ اللہ عزوجل نے نبیوں کے ذریعہ انسان کی صراط مستقیم کی طرف رہنمائی فرمائی، اور ذات وصفات کی معرفت اور جنت وجہنم اور ہماری اس دنیا سے ماوراء جو حقیقتیں ہیں وہ سمجھائیں، اور یہ سلسلہ برابر جاری رہا، یہاں تک کہ اللہ کے سب سے بڑے اور سب سے افضل رسول اور انبیاء ورسل کے سلسلہ کی آخری کڑی محبوب رب العالمین، سید الاولین والآخرین جناب محمد ﷺ کو اللہ نے مبعوث فرمایا، اور اپنی آخری کتاب قرآن مجید نازل فرمائی، اور قرآن کے ذریعہ تمام انسانوں کی صراط مستقیم کی طرف راہنمائی فرمائی یہ اللہ کا ہم پر بڑا احسان اور انعام ہے۔

قیامت کے دن ہر شخص کو قرآن کی قدر و قیمت معلوم ہوگی

آج انسان کو کتابِ ہدایت قرآنِ مجید کی کوئی قدر نہیں، مسلمانوں کو الحمد للہ تھوڑی بہت قدر ہے، لیکن تمام انسانوں کو اس کی کوئی قدر نہیں کہ نبوت انسانیت کے لئے کتنی بڑی رحمت ہے، اور اللہ کی نازل کردہ کتابیں اور قرآنِ مجید کتنی بڑی نعمت ہے، لیکن ایک وقت آئے گا کہ ہر انسان اس کی عظمت کا اعتراف کرے گا، اللہ نے ہمیں آنکھیں دی ہیں، ہم اس کی کیا قدر کرتے ہیں؟ کون اس نعمت کو یاد کرتا ہے؟ اور شکر بجالاتا ہے؟ لیکن اللہ نہ کرے اگر کسی کی آنکھیں نہ رہیں تو اس وقت آنکھوں کی قدر معلوم ہوگی، اگر اس کے پاس کل کائنات ہو تو وہ ایک آنکھ پانے کے لئے اس کو خرچ کردے، مگر آج نعمت حاصل ہے تو کوئی قدر نہیں۔ اسی طرح اللہ نے جو کتابیں نازل فرمائی ہیں، اور جو انبیاء مبعوث کئے ہیں اور ان کے ذریعہ صراط مستقیم کی راہنمائی کی ہے، لوگوں کو اس کی بالکل قدر معلوم نہیں۔ اور ہمیں اللہ کے فضل سے اس کی تھوڑی بہت قدر معلوم ہے، مگر پوری قدر ہمیں بھی معلوم نہیں۔ لیکن جب یہ دنیا ختم ہوگی، اور قیامت قائم ہوگی، اور جزاء وسزا کے فیصلے ہونگے، اور جنتی جنت میں اور جہنمی جہنم میں جائیں گے تب جنتیوں کو بھی اور جہنمیوں کو بھی اس نعمت کی قدر معلوم ہوگی۔

جہنمیوں کا افسوس کرنا اور قرآن کی قدر کا اعتراف کرنا

سورۃ الفرقان میں اللہ عزوجل نے یہ مضمون بیان فرمایا ہے کہ قیامت کے دن کافر

پچھتائیں گے اور افسوس کریں گے اور کہیں گے: ﴿يٰلَيْتَنِى اتَّخَذْتُ مَعَ الرَّسُوْلِ سَبِيْلاً﴾: کاش ایسا ہوتا کہ میں نے رسول کا اتباع کیا ہوتا، جہنمی یہ اعتراف کریں گے کہ اللہ کی ایک بہت بڑی نعمت ہمیں پہنچی تھی، مگر ہم نے اس نعمت کی قدر نہیں کی، اس سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا، اس لئے ہمیں آج یہ برادن دیکھنا پڑا۔ اگر میں نے اس نعمت کی قدر کی ہوتی اور اس نعمت سے فائدہ اٹھایا ہوتا، اور رسول کا راستہ اختیار کیا ہوتا تو یہ برادن آج مجھے دیکھنا نہ پڑتا۔

جنتیوں کا اعتراف کرنا اور اللہ کی تعریف کرنا

اور مؤمنین کا ذکر سورۂ مائدہ میں ہے، جب سب مسلمان جنت میں پہنچ جائیں گے تو جنت میں مجلسیں ہونگی، اور ان مجلسوں میں ہر قسم کی باتیں ہونگی، وہ باہم ایک دوسرے سے کہیں گے: ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِىْ هَدَانَا لِهٰذَا وَمَا كُنَّا لِنَهْدِىَ لَوْلاَ أَنْ هَدَانَا اللّٰهُ، لَقَدْ جَاءَ تْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ﴾: جنتی سب ایک زبان ہوکر کہیں گے: تمام تعریفیں اس اللہ کے لئے ہیں جس نے ہمیں اس جنت کا راستہ دکھایا، اگر اللہ ہمیں جنت کا راستہ نہ دکھاتے تو ہم اپنی سمجھ سے جنت کا راستہ نہیں پا سکتے تھے، بخدا! واقعہ یہ ہے کہ ہمارے پروردگار کے رسول جو دین ہمارے پاس لے کر آئے تھے وہ برحق دین تھا، یعنی جنت میں پہنچنے کے بعد تمام جنتی اقرار کریں گے کہ ہم جو جنت میں آئے ہیں، اللہ کی راہنمائی سے آئے ہیں۔ نبیوں کی تشریف آوری کی وجہ سے آئے ہیں، اللہ کی وحی اور دینِ شریعت کی برکت سے آئے ہیں، ورنہ ہم اپنی عقل وفراست سے جنت تک نہیں پہنچ سکتے تھے، اور کافر انگلیاں کاٹیں گے، افسوس کریں گے، پچھتائیں گے اور کہیں گے: کاش میں نے دنیا میں رسول کا راستہ اپنایا ہوتا، ان کے طریقہ کو اختیار کیا ہوتا تو آج مجھے یہ برادن دیکھنا نہ پڑتا، غرض آخرت میں جنتیوں کو بھی انبیاء ورسل اور نبوت وہدایت کی قدر معلوم ہوگی اور جہنمیوں کو بھی۔

رسولوں کی بعثت اللہ کا خاص انعام ہے

میرے بھائیو! اللہ کا یہ ہم پر بہت بڑا انعام اور احسان ہے کہ انھوں نے ہمیں سیدھا

راستہ دکھانے کے لئے انبیاء مبعوث فرمائے اور انسانوں میں سے مبعوث فرمائے، اللہ پاک کا ارشاد ہے: ﴿لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ إِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلاً مِنْ أَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ آيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ﴾: بخدا! واقعہ یہ ہے کہ اللہ نے مؤمنین پر احسان کیا، انہی میں سے اپنا بہت بڑا رسول بھیج کر، یعنی انسان رسول بھیج کر، انسان رسول بھیجنا بذاتِ خود بڑا انعام ہے، اس لئے کہ اگر اللہ تعالیٰ ہاتھی کو، طوطے کو، جنات اور فرشتوں کو رسول بنا کر بھیجتے تو ہم کیا فائدہ اٹھاتے؟ ہاتھی چنگھاڑتا، ہم کیا سمجھتے؟ طوطا بولتا ہمارے پلّے کیا پڑتا؟ شیر دھاڑتا تو ہمارا استنجاء خطا ہوجاتا، جنات اور فرشتے ہمیں نظر نہیں آتے پھر ہم ان سے کیا فائدہ اٹھاتے؟ پھر جنات اور فرشتوں کی ضرورتیں الگ ہیں، اور ہماری ضرورتیں الگ، وہ اپنے اعتبار سے شریعت سازی کرتے اور ہم اپنے اعتبار سے چاہتے، اللہ کا کرم دیکھئے کہ انسانوں کے پاس انسان ہی رسول بھیجا، ہمارے اور رسول کے جذبات ایک ہیں، ضرورتیں ایک ہیں، چاہتیں ایک ہیں، مجبوریاں ایک ہیں، اعذار ایک ہیں، وہ ہماری ضرورتوں کو اور مجبوریوں کو سمجھتے ہیں اور شریعت سازی میں اس کا خیال رکھتے ہیں، اس لئے انسان رسول کی بعثت بذاتِ خود ایک بہت بڑا کرم ہے۔ پس یہ تین احسان ایک ساتھ ہیں: ایک: رسول بھیجنا۔ دوسرا: انسان رسول بھیجنا۔ تیسرا: سب سے بڑا رسول یعنی سید الاولین والآخرین، خاتم النّبیین حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کو بھیجنا اور ہمیں ان کی امت ہونے کی سعادت بخشنا، یہ وہ عظیم احسان ہے جس کی ہر نبی نے تمنا کی ہے۔ تمام انبیاء آرزوئیں کرتے رہے ہیں کہ ہمیں نبوت ملنے کے بجائے نبی آخر الزماں ﷺ کا امتی بنایا جاتا تو کیا اچھا ہوتا، اور ہمیں اللہ تعالیٰ نے محض اپنے فضل و کرم سے بغیر کسی استحقاق کے اپنے محبوب کا امتی ہونے کا شرف بخشا، یہ سب سے بڑا احسان ہے۔

نبی ﷺ کے تین کام

۱- نبی ﷺ کا پہلا کام یہ ہے کہ اللہ کی آیتیں یعنی قرآنِ کریم لوگوں کو پڑھ کر سنائیں، آپ حضرت جبرئیل علیہ السلام سے قرآنِ کریم لیتے تھے، پھر لوگوں کو پہنچاتے تھے۔

۲-آپؐ لوگوں کو ستھرا کرتے تھے، جیسے میلا کپڑا اور میلا برتن دھوکر اور مانجھ کر صاف کیا جاتا ہے، اسی طرح آپؐ انسانوں کو ستھرا کرتے تھے۔ آپؐ انسانوں کے ظاہر کو ستھرا نہیں کرتے تھے، ظاہر تو انسان خود صاف کرتا ہے، چہرے پر دھبہ لگتا ہے تو آئینہ کے سامنے کھڑے ہوکر چہرہ صاف کرتا ہے، کپڑے میلے ہوجاتے ہیں تو ان کو دھوکر صاف کرتا ہے، کیونکہ انسان کو ان کا میلا ہونا معلوم ہوجاتا ہے، مگر باطن کا میل نہ صرف یہ کہ انسان خود اس کو صاف نہیں کرسکتا، بلکہ اس کو باطن کے میل کا پتہ بھی نہیں چلتا۔ اور یہ بڑی عجیب بات ہے کہ آدمی جتنا اندر سے میلا ہوتا ہے اتنا ہی خوش فہمی میں مبتلا ہوتا ہے، وہ یہ سمجھتا ہے کہ میں ہی سب سے زیادہ صاف وشفاف ہوں، مگر جو اللہ کے نیک بندے ہیں وہ ہمیشہ اپنا محاسبہ کرتے ہیں، اپنے باطن کا جائزہ لیتے ہیں، اور اپنے آپ کو سب سے کمتر سمجھتے ہیں، پس اللہ کے نیک بندوں کو تو اپنے اندر کمزوریاں نظر آتی ہیں، مگر جن کا باطن گناہوں سے میلا ہوتا ہے وہ نہ اپنا محاسبہ کرتے ہیں اور نہ ان کو اپنی خامیاں نظر آتی ہیں، بلکہ وہ اپنے آپ کو سب سے زیادہ پاک صاف تصور کرتے ہیں۔

انبیاء اور علماء لوگوں کو اخلاق حمیدہ سے آراستہ کرتے ہیں

جب انسان اپنی خامیوں کا ادراک نہیں کرسکتا، اس کو اندر کی خرابیوں کا پتہ نہیں چلتا، تو ضروری ہے کہ کوئی ایسی شخصیت ہو جو انسانوں کو اس کے عیوب سے مطلع کرے اور باطنی خرابیوں سے اور اخلاق رذیلہ سے اس کو پاک کرے اور اخلاق حمیدہ سے آراستہ کرے، یہ کام انبیاء کرام کا ہے، اور ان کے بعد علماء اور صوفیاء کا ہے، وہ بھی لوگوں کو رذائل سے پاک کرتے ہیں اور اچھے اخلاق سے آراستہ کرتے ہیں، یہی لوگوں کو ستھرا کرنا ہے ﴿یُزَکِّیْهِمْ﴾ کا یہی مطلب ہے۔

نبی ﷺ کا ارشاد ہے: بُعِثْتُ لِأُتَمِّمَ مَکَارِمَ الْأَخْلَاقِ: میری بعثت کا ایک مقصد یہ ہے کہ میں اچھے اخلاق کی تکمیل کروں، لوگوں میں اچھے اخلاق پیدا کروں، اور اچھے اخلاق پیدا کرنے کے لئے پہلے برے اخلاق نکالنے ہونگے، جس آدمی میں خودغرضی ہے وہ سخی بن

جائے ممکن نہیں، پہلے اندر سے خودغرضی نکالنی پڑے گی، تب فیاضی اور سخاوت کی صفت پیدا ہوگی۔ غرض انبیاء اور ان کے بعد علماء اور صوفیاء کا یہ مشن ہے کہ لوگوں کے اندر جو پوشیدہ عیوب اور برے اخلاق ہیں ان سے ان کو پاک کریں، ان کے باطن کو مجلّی کریں، پھر اخلاق حسنہ اور صفاتِ محمودہ سے ان کو مزین کریں۔

انسان کی کمزوریاں انسان ہی سمجھ سکتا ہے

اور لوگوں کو اخلاقِ رذیلہ سے انسان رسول ہی پاک کرسکتا ہے، کیونکہ وہی انسان کی کمزوریوں کو پوری طرح سمجھ سکتا ہے، اگر فرشتہ رسول بن کر آتا، جن ّرسول بن کر آتا، چرند و پرند رسول بنکر آتے تو وہ لوگوں کو ستھرا نہیں کر سکتے تھے، کیونکہ وہ انسانوں کی خامیوں کو سمجھ نہیں سکتے، پھر ستھرا کیسے کریں گے؟ جیسے میں ہندوستان کا ہوں اور ہندوستان میں بھی گجرات کا ہوں، پس گجرات کے لوگوں کی کمزوریوں کو سمجھ سکتا ہوں۔ مگر امریکہ کا شخص گجرات کے لوگوں کی کمزوریاں اچھی طرح نہیں سمجھ سکتا اور میں امریکہ کے لوگوں کی کمزوریاں پوری طرح نہیں سمجھ سکتا، کچھ سمجھ سکتا ہوں، مگر پوری طرح نہیں سمجھ سکتا۔ یہاں کے لوگوں کی کمزوریاں اور خوبیاں یہاں کا آدمی ہی سمجھ سکتا ہے، جو یہاں رہا ہے، اور یہاں کی سوسائٹی میں پلا بڑھا ہے وہی اچھی طرح ان کو سمجھ سکتا ہے۔

ہر قوم میں نبی اسی قوم کا بھیجا گیا

اس لئے اللہ نے ہر قوم میں اسی قوم کا بنی بھیجا، ایک قوم کا نبی دوسری قوم میں نہیں بھیجا، صرف حضرت لوط علیہ السلام غیر قوم کی طرف مبعوث کئے گئے تھے، ان کے علاوہ ایک قوم کا نبی دوسری قوم کی طرف نہیں بھیجا گیا، جس قوم کی طرف اللہ کو نبی بھیجنا منظور ہوتا ہے اسی قوم میں سے کسی شخصیت کو منتخب فرماتے ہیں، کیونکہ قوم کی خوبیاں، خرابیاں اور ان کی نفسیات کا ادراک قوم کا فرد ہی اچھی طرح کرسکتا ہے۔ اور زبان کا معاملہ بھی اہم معاملہ ہے، یہاں امریکہ میں بہت سے بھائی ہیں، میں اپنی بات ان کو نہیں سمجھا سکتا، کیونکہ وہ انگریزی بولتے ہیں اور میں انگریزی نہیں جانتا، اس لئے اللہ نے ہمیشہ ہر قوم میں اسی زبان کا پیغمبر بھیجا، کسی قوم کے

پاس ایسا رسول کبھی نہیں بھیجا جو قوم کی زبان نہ جانتا ہو، سورۂ ابراہیم کے پہلے رکوع میں یہ آیتِ کریمہ ہے: ﴿وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَسُوْلٍ إِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهِ﴾: اللہ نے ہمیشہ لوگوں کے پاس ان کی زبان جاننے والا رسول بھیجا ہے تا کہ جو وحی آئے وہ قوم کو ان کی زبان میں سمجھائے۔

وحی سمجھانا انبیاء کا کام ہے

۳- انبیاء کا تیسرا کام وحی سمجھانا ہے، جو وحی نازل ہوئی ہے اس کو پڑھ کر سنانا الگ کام ہے، پھر اس کی تبیین وتشریح کرنا دوسرا کام ہے، علاوہ ازیں نبی اپنی امت کو حکمت کی باتیں بھی سکھاتا ہے، حکمت ودانشمندی کی یہ باتیں احادیث شریفہ کہلاتی ہیں۔

قرآنِ کریم مال ودولت سے بہتر ہے

اللہ نے انبیاء بھیج کر جو انسانوں کی اصلاح فرمائی ہے اور ان کو راہ راست دکھائی ہے، یہ اللہ کا انسانوں پر بہت بڑا کرم ہے، ارشاد پاک ہے: ﴿قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهِ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا﴾: آپ کہہ دیجئے! یہ قرآن اللہ کا فضل اور اس کی مہربانی ہے، یہ اللہ کا بھیجا ہوا دین ہے، اللہ کی بھیجی ہوئی شریعت ہے اس انعام پر خوشیاں مناؤ ﴿هُوَ خَيْرٌ مِمَّا يَجْمَعُوْنَ﴾ وہ قرآن وہ دین وشریعت اس مال سے بہتر ہے جس کو تم اکٹھا کرتے ہو، جس دنیا پر تم شاداں فرحاں ہو، اس سے کہیں زیادہ بہتر یہ ہے، اس پر خوشیاں مناؤ۔

تین باتیں جو کامیابی کی کنجی ہیں

میں نے جو آیاتِ کریمہ تلاوت کی ہیں، ان میں ایک قیمتی مضمون ہے، وہ مضمون گذشتہ انبیاء کی کتابوں میں بھی تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی کتابوں میں بھی تھا، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی کتابوں میں بھی تھا، یہ مضمون کی اہمیت بیان کی کہ وہ اتنا قیمتی مضمون ہے کہ گذشتہ انبیاء کی کتابوں میں بھی نازل کیا گیا تھا، وہ کیا مضمون ہے؟ فرمایا: ﴿قَدْ أَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى﴾: وہ شخص کامیاب ہوا جس نے اپنے آپ کو سنوار لیا یعنی کفر وشرک سے کنارہ کشی اختیار کرلی ﴿وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهِ فَصَلّٰى﴾ اور اللہ کا نام لیا پس اس نے نماز پڑھی، جس آدمی

میں یہ تین باتیں جمع ہوں اس کے لئے کامیابی یقینی ہے۔

ایک: شرک وکفر سے علاحدہ ہو جائے، اور ظاہری اور باطنی، حسّی اور معنوی نجاستوں سے پاک ہو جائے، اور قلب وقالب کو عقائد صحیحہ اور اعمالِ فاضلہ سے آراستہ کر دے۔

اور دوسری چیز جس پر کامیابی کا مدار ہے یہ ہے کہ ہمیشہ اللہ کو یاد رکھے، اور ہر حال میں اللہ کو یاد رکھنے کا فارمولہ یہ ہے کہ بندہ جو بھی کام کرے اس میں جائز ناجائز کا خیال رکھے، ہر ناجائز کو چھوڑ دے اور جائز کو اپنائے، کاروبار میں یہی اللہ کو ہر وقت یاد رکھنا ہے، اور گھریلو زندگی میں ہمیشہ یاد رکھنا یہ ہے کہ والدین کے ساتھ جو معاملات کرے، بھائی بہنوں کے ساتھ، بیوی بچوں کے ساتھ، پڑوسیوں کے ساتھ اور اعزہ واقارب کے ساتھ جو معاملات کرے شریعت کے مطابق کرے، کسی معاملہ میں شریعت کی خلاف ورزی نہ کرے، اور اللہ کے حکم کے مطابق ہر ایک کا حق ادا کرے، یہ فیملی لائف میں ہر وقت اللہ کو یاد رکھنا ہے، اسی طرح کھانے پینے میں حلال وحرام کا خیال رکھے، مشتبہ چیزوں سے بچے، اللہ کے نام سے کھانا شروع کرے، دائیں ہاتھ سے کھائے، دسترخوان پر لقمہ گر جائے اور دسترخوان صاف ہو تو اس کو اٹھا کر کھالے، کھانا ضائع نہ کرے، یہ کھانے پینے میں اللہ کو یاد رکھنا ہے۔ غرض ہمیشہ اللہ کا استحضار رکھے اور اللہ کے احکام کے مطابق زندگی گذارے، یہی کامیابی کی کنجی ہے۔

اور تیسری چیز یہ ہے کہ نمازیں پڑھے، یہ ہمیشہ اللہ کو یاد رکھنے کی ایک شکل ہے، اور یہ تین کام کامیابی کی ضمانت ہیں۔

نماز اللہ کو یاد رکھنے کا ذریعہ ہے

میرے بھائیو! جو نماز کا جتنا زیادہ اہتمام کرتا ہے وہ اللہ کو اتنا ہی زیادہ یاد رکھتا ہے، یہ نماز اللہ کو یاد رکھنے کا ذریعہ ہے، اور اللہ کو جو یاد رکھے گا وہی نماز پڑھے گا، اور نماز کا اہتمام کرے گا، اور جو اللہ کو بھول گیا وہ نماز نہیں پڑھے گا۔

اور نماز کے دو فائدے ہیں، اکیسویں پارہ کی پہلی آیت ہے: ﴿اُتْلُ مَا اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنَ الْكِتٰبِ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ﴾: جو کتاب ہم نے تمہاری طرف اتاری ہے اس کی تلاوت کرو

اور نماز کا اہتمام کرو، یعنی پابندی کے ساتھ صحیح طریقہ پر نماز پڑھو، اس لئے کہ نماز کے دو فائدے ہیں:

ایک: نماز بے حیائی کے کاموں سے اور ناجائز کاموں سے روکتی ہے، بعض بھائی یہ سوال کرتے ہیں کہ ہم نے ایسے نمازی دیکھے ہیں جو نماز بھی پڑھتے ہیں اور بے حیائی کے کام اور ناجائز کام بھی کرتے ہیں، پس نماز نے ان کو برائیوں سے کہاں روکا؟

یہ سوال ایک معمولی بات نہ سمجھنے کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ نماز روکتی ہے، نماز روک دیتی ہے یہ نہیں فرمایا، اور روک دینے کا مطلب یہ ہے برائیاں صادر نہیں ہونے دیتی، اللہ نے یہ نہیں فرمایا، بلکہ یہ فرمایا ہے کہ نماز بے حیائی کے کاموں سے اور ناجائز کاموں سے روکتی ہے، جیسے باپ بیٹے کو برائیوں سے روکتا ہے مگر بیٹا نہیں مانتا، برائیاں کرتا ہے، پس یہ نہیں کہہ سکتے کہ باپ نے نہیں روکا، باپ نے تو روکا مگر وہ نہیں سنتا، اسی طرح نماز برائیوں سے روکتی ہے مگر نمازی نہیں سنتا، برائیاں کرتا ہے۔ غرض یہ اعتراض 'روکنے' اور 'روک دینے' میں فرق نہ کرنے کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔

اور یہ بات اس طرح بھی سمجھی جاسکتی ہے کہ آپ دو 'دل' لیں: ایک: نمازی بندے کا، دوسرا: بے نمازی کا، جو ایک ہی گناہ میں مبتلا ہوں، اور ان کو کسی لیبارٹی میں بھیجیں، اور تجزیہ کرائیں، اور ایسی لیبارٹی نہ ملے تو اپنے ذہن میں تجزیہ کریں، نمازی بندے کا دل روتا ہوگا جب وہ گناہ کرتا ہوگا، اور بے نمازی کو اس گناہ کے کرنے میں کوئی پشیمانی نہیں ہوگی، یہ نماز کے روکنے کا اثر ہے جو پشیمانی کی شکل میں دل میں موجود ہوتا ہے۔

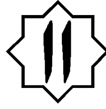
اور نماز کا دوسرا فائدہ: اللہ کی یاد ہے، یہ پہلے فائدے سے بھی بڑا فائدہ ہے، یعنی بے حیائی اور ناجائز کاموں سے روکنے سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ نماز اللہ کو یاد رکھنے کا ذریعہ ہے، آدمی جتنی دیر نماز پڑھتا ہے اتنی دیر تو اللہ کو یاد کرتا ہی ہے، اس سے پہلے بھی اور بعد میں بھی یاد کرتا ہے، پہلے ہی سے خیال رکھتا ہے کہ باجماعت نماز پڑھنی ہے، پھر جب نماز پڑھ کر فارغ ہوجاتا ہے اور کاروبار میں مشغول ہوتا ہے تو بھی یہی خیال رہتا ہے کہ اگلی نماز بھی باجماعت پڑھنی ہے، سوتا بھی ہے تو نماز نہ چھوٹ جائے اس لئے الارم لگا کر یا کسی سے کہہ کر سوتا ہے،

اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جب نماز کا حکم دیا تو ساتھ ہی اس کا یہ فائدہ بھی بتایا ﴿أَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِىْ﴾ آپ نمازوں کا اہتمام کریں مجھے یاد رکھنے کے لئے۔ غرض ان دونوں آیتوں سے صاف مفہوم ہوتا ہے کہ جو جتنا نماز کا اہتمام کرے گا وہ اتنا ہی اللہ کو یاد کرے گا۔ علاوہ ازیں: زندگی کی ہر لائن میں جائز ناجائز کا خیال رکھے گا یہ بھی اللہ ہی کی یاد کی وجہ سے ہے اور یہی کامیابی کی کنجی ہے اس لئے اپنے آپ کو ستھرا بھی کرنا ہے اور نمازوں کا اہتمام بھی کرنا ہے، تا کہ اللہ ہر وقت یاد رہیں، دنیا و آخرت کی کامیابی کا مدار اسی پر ہے۔

دنیا کے لئے محنت حرماں نصیبی ہے

مضمون پورا ہوا، اس کے بعد اس سے لگتا ایک دوسرا مضمون ہے: ﴿بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا﴾: مگر انسان دنیا کو آخرت پر ترجیح دیتا ہے، حالانکہ اصل محنت آخرت کی زندگی کے لئے کرنی ہے، اصل فکر آخرت کو سنوارنے کی کرنی ہے، کیونکہ دنیا کی زندگی تو معمولی ہے، آنکھ جھپکتے پوری ہو جائے گی اور آخرت کی زندگی ہمیشہ رہنے والی ہے، وہ ختم ہونے والی نہیں، مگر انسان دنیا کی ذراسی زندگی کو سنوارنے کے لئے رات دن تگ و دو کرتا ہے اور آخرت کی پرواہ نہیں کرتا ﴿بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا وَالآخِرَةُ خَيْرٌ وَّأَبْقٰى﴾ مگر تم دنیا کی زندگی کو ترجیح دیتے ہو حالانکہ آخرت بہتر ہے اور ہمیشہ رہنے والی ہے۔ دنیا کے لئے بلاشبہ محنت کرنی ہے مگر بقدر ضرورت کرنی ہے، اصل تیاری آخرت کی کرنی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: کن فی الدنیا کأنك غریب أو عابر سبیل: دنیا میں پردیسی یا مسافر کی طرح رہو۔ جس طرح غریب الوطن کے پاس معمولی سامان ہوتا ہے اور مسافر بس میں جگہ مل جائے تو بیٹھ جاتا ہے ورنہ کھڑے کھڑے سفر پورا کر لیتا ہے۔ اسی طرح دنیا بھی گذار دینی ہے۔ اللہ تعالیٰ مدد فرمائیں اور اس دولت جاودان سے نوازیں، دنیا میں ٹھاٹھ ضرور کرو، مگر ٹھاٹھ کے لئے غلط راہیں نہ اپناؤ۔ نہ اللہ کو بھولو، اللہ تعالیٰ ہمیں اس حقیقت کو سمجھنے کی اور اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائیں۔

و آخر دعوانا أن الحمدللہ رب العالمین



پانچ باتیں اللہ تعالیٰ ہی کو معلوم ہیں

خطبہ مسنونہ کے بعد: ﴿إِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهُ عِلْمُ السَّاعَةِ، وَيُنَزِّلُ الْغَيْثَ، وَيَعْلَمُ مَا فِي الْأَرْحَامِ، وَمَا تَدْرِيْ نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا، وَمَا تَدْرِيْ نَفْسٌ بِأَيِّ أَرْضٍ تَمُوْتُ، إِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ﴾

بزرگو اور بھائیو! یہ سورۂ لقمان کی آخری آیت ہے اس میں ایک مضمون آیا ہے کہ اللہ ہی اس چیز کو جانتے ہیں جو بچہ دانیوں میں ہے۔ لوگ اس پر سوال کرتے ہیں کہ اب تو ایسی مشینیں ایجاد ہو گئیں ہیں جن کے ذریعہ ڈاکٹر پہلے ہی بتا دیتے ہیں کہ پیٹ میں بچہ ہے یا بچی؟ بلکہ یہ بھی بتا دیتے ہیں کہ بچہ تندرست ہے یا معذور؟ جبکہ آیت میں یہ ہے کہ اللہ اس چیز کو جانتے ہیں جو بچہ دانیوں میں ہے۔ اس لئے آج کی مجلس میں میں چاہتا ہوں کہ اس آیت کی کچھ وضاحت آپ کے سامنے پیش کروں۔

اللہ پاک ارشاد فرماتے ہیں: ﴿إِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهُ عِلْمُ السَّاعَةِ﴾: **بیشک اللہ تعالیٰ کے پاس قیامت کا علم ہے۔** جیسے اردو زبان میں 'ہی' وغیرہ لگانے سے حصر ہوتا ہے اسی طرح عربی زبان میں بھی حصر کرنے کے کچھ طریقے ہیں، ان طریقوں میں سے ایک طریقہ یہ ہے کہ تاکید کے لئے إن لاتے ہیں، پھر إن کے اسم وخبر لاتے ہیں، پس آیت یوں ہونی چاہئے تھی إن عندَ الله علمَ الساعة، مگر جملہ کی ساخت بدل دی اب ترجمہ یوں ہوگا: **بیشک اللہ ان ہی کے پاس قیامت کا علم ہے،** پس یہ آیت میں حصر ہو گیا جبکہ آپ جانتے ہیں کہ قیامت کا تھوڑا بہت علم سبھی کو ہے، سورۂ طٰہٰ میں یہ آیت ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا: ﴿إِنَّ السَّاعَةَ آتِيَةٌ أَكَادُ أُخْفِيْهَا لِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍ بِمَا تَسْعٰى﴾: **بیشک قیامت آنے والی ہے، قریب تھا میں کہ اس کو چھپا لوں تا کہ ہر نفس کو اس کام کا بدلہ دیا جائے**

جو اس نے کیا ہے، یعنی قیامت اس لئے آنی ہے کہ آدمی جو بھی کام اس دنیا میں کرتا ہے اس کا بدلہ دیا جائے، اور درمیان میں فرمایا: ﴿أَكَادُ أُخْفِيهَا﴾: قریب تھا میں کہ قیامت کو چھپالوں، یعنی صحیح امتحان تو اس وقت ہوگا جب یہ بھی نہ بتایا جائے کہ امتحان لیا جائے گا اور بغیر بتائے اچانک امتحان لے لیا جائے اس وقت پتہ چلے گا کہ کس طالب علم نے پڑھنے میں محنت کی ہے اور کس نے نہیں کی، اور اگر پہلے سے معلوم ہو جائے کہ سال میں دو یا تین امتحان ہونگے، اور فلاں فلاں تاریخوں میں ہونگے پھر امتحان سے ایک مہینہ پہلے اعلان کر دیا جائے کہ فلاں تاریخ سے امتحان شروع ہوگا، یہ کیا امتحان ہوا؟ طالب علم دو مہینے سوتا رہے گا اور امتحان سے ایک مہینہ پہلے دن رات محنت کر کے پاس ہو جائے گا۔ اور اگر یہی پتہ نہ ہو کہ امتحان ہوگا، پھر اچانک امتحان لیا جائے تو صحیح جانچ ہوتی ہے کہ طالب علم پڑھتا ہے یا نہیں۔

پرانے زمانہ کا قصہ ہے: ٹونک سے ایک طالب علم: برکات احمد ٹونکی منطق پڑھنے کے لئے خیر آباد مولانا عبدالحق خیر آبادی کے پاس گیا، مولانا عبدالحق خیر آبادی منطق کے بڑے ماہر تھے، استاذ نے کہا: میں پڑھانے کو تیار ہوں، مگر جب چاہوں گا امتحان لوں گا، طالب علم نے کہا: ٹھیک ہے، سبق شروع ہوا، ایک ہفتہ پڑھایا، آٹھویں دن جب پڑھنے گیا تو کہا آج امتحان ہوگا، طالب علم کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ آٹھویں دن امتحان ہوگا اس لئے اس نے کتاب یاد نہیں کی تھی چنانچہ امتحان ہوا اور سات دن کا سبق یاد نہ نکلا، تو حضرت نے یہ کہتے ہوئے نکال دیا کہ اگر میں تجھے عمر نوح بھی پڑھاؤں گا، پھر بھی تجھے علم نہیں آئے گا، طالب علم وہاں سے کلیر گیا اور حضرت صابر کلیری رحمہ اللہ کے مزار سے لگی ہوئی مسجد میں چالیس دن کا اعتکاف کیا اور چالیس دن تک اللہ سے دعائیں کرتا رہا کہ استاذ راضی ہو جائیں اور دوبارہ پڑھانا منظور کر لیں۔

مزار سے متصل مسجد

کسی مزار سے متصل اگر کوئی مسجد ہو تو اس مسجد کا مزار سے کوئی تعلق نہیں ہوتا لیکن اگر مسجد کے پاس کسی نیک آدمی کی قبر ہو تو اس کا فیض پہنچے گا، جیسے مسجد نبوی میں نبی پاک ﷺ

کی قبر ہے تو اس کا فیض لوگوں کو پہنچے گا، آج کچھ سر پھرے لوگ ہیں جو اس کے قائل نہیں، وہ مسجد نبوی میں کھڑے ہو کر گنبد خضری کی طرف اشارہ کر کے کہتے ہیں: هٰذا هو الصنم الأكبر: یہ سب سے بڑا بت ہے! ایسے بھی سر پھرے انسان ہیں، بہر حال جہاں بھی نیک آدمی ہوگا، زندہ ہو تو اس کا فیض حاضرین کو پہنچے گا، قبر میں چلا گیا تو بھی فیض پہنچے گا۔

دو مسئلے الگ الگ ہیں قبر والے سے مانگنا جائز نہیں، جیسے اگر وہ زندہ ہوتا تو اس سے اولاد مانگنا جائز نہیں تھا ایسے ہی مرنے کے بعد بھی اس سے مانگنا جائز نہیں، لیکن جیسے ایک زندہ بزرگ ہو اور کسی بستی میں رہتا ہو تو اس بستی والوں کو اس کا فیض پہنچے گا، ایسے ہی اگر کسی نیک بندے کی قبر کے پاس مسجد ہے تو اس مسجد والوں کو فیض پہنچے گا، اس کا ذکر قرآن میں ہے، اصحاب کہف کے واقعہ میں جب مسلمانوں نے غار کے منہ پر دیوار چن کر اس کو اصحاب کہف کی اجتماعی قبر بنا دیا تو پھر ان کے درمیان آپس میں اس بات کو لے کر اختلاف ہوا کہ باہر کیا بنایا جائے؟ کسی نے کہا: غار کے باہر 'لاٹ' بناؤ، اللہ نے اس کا رد کیا: ﴿رَبُّهُمْ أَعْلَمُ بِهِمْ﴾ ان کا پروردگار ان کو خوب جانتا ہے۔ یادگار اور لاٹ بنانے کا کیا فائدہ، اور جو اقتدار میں تھے انہوں نے کہا: ہم یہاں مسجد بنائیں گے تا کہ لوگ یہاں آئیں اور عبادت کریں اور ان سات بزرگوں کا فیض ان کو پہنچے اللہ نے اس رائے کا رد نہیں کیا معلوم ہوا کہ قبر کے ساتھ مسجد بنائی جاسکتی ہے اور وہاں اعمال صالحہ کرنے والوں کو قبر کا فیض پہنچے گا اور مسجد میں جو اعمال صالحہ ہونگے اس کا فیض قبر والے کو بھی پہنچے گا۔

مسجد میں یا مسجد کے احاطہ میں قبر بنانا

مسجد میں یا مسجد کے احاطہ میں کسی نیک آدمی کو دفن کرنا جائز نہیں۔ حدیث شریف میں ہے: لَاتَجْعَلُوْا بُيُوْتَكُمْ قُبُوْرًا: اپنے گھروں کو قبریں مت بناؤ، اور جب اپنے گھر میں دفن کرنے کی ممانعت ہے تو اللہ کے گھر میں دفن کرنے کی کہاں سے اجازت ہوگی؟ کتنا ہی بڑا بزرگ ہو اس کی قبر گور غریباں میں بنے گی، نہ گھر میں، نہ مسجد میں اور نہ مسجد سے ملحق گارڈن میں، مگر آج کل یہ بدعت چل پڑی ہے، کراچی کے مدرسہ بنوریہ میں حضرت مولانا یوسف

صاحب بنوری قدس سرہ کی قبر مسجد کے ساتھ بنائی گئی ہے، کلکتہ میں حضرت مولانا طاہر صاحب کی قبر مسجد کے ساتھ بنائی گئی ہے، مرکز نظام الدین میں تین بزرگوں کی قبریں مسجد کے ساتھ بنائی گئی ہیں جبکہ پانچ سوگز کے فاصلہ پر گورغریباں ہے اور مرکز کے تمام بزرگ وہیں دفن ہیں، گنگوہ میں بھی مسجد کے ساتھ قبر بنی ہے، سونگڑہ (اڑیسہ) میں مولانا اسماعیل صاحب کی قبر مسجد کے ساتھ بنی ہے، اور نہ معلوم کتنی جگہیں ہیں جہاں اس طرح کی تدفین عمل میں آئی ہے، یہ سب غلط ہے، کوئی بھی بزرگ ہو قبر گورغریباں میں بنے گی مسجد کے ساتھ یا مسجد کے احاطہ میں قبر نہیں بننی چاہئے۔

اور اگر کہیں پہلے سے قبر ہے اور اس کے قریب مسجد بنائی گئی اور اس مسجد میں قبر کی زیارت کے لئے آنے والے ٹھہرتے ہیں اور اعمال صالحہ کرتے ہیں تو یہ درست ہے اور اس کی دلیل اصحاب کہف کا واقعہ ہے، قبر پہلے ہے اور مسجد بعد میں بنائی گئی ہے، دیوبند میں بھی جہاں حاجی عابد حسین صاحب کی قبر ہے اس سے دوسوگز کے فاصلہ پر ایک چھوٹی سی مسجد ہے جہاں زیارت کے لئے آنے والے ٹھہرتے ہیں اور نماز وغیرہ پڑھتے ہیں۔

یادگاریں بنانے کا جذبہ

یادگاریں دوطرح کی ہوتی ہیں: ایک اشوک کی لاٹ کے مانند یادگار، یہ بیکار یادگار ہے اس کا کوئی فائدہ نہیں، اور ایک یادگار ایسی ہے جس سے لوگ فائدہ اٹھائیں مثلاً بیادگار فلاں مسجد بنادی یا کنواں بنادیا یا سراے بنادی، کوئی ایسی چیز بنائی جس سے مخلوق کو فیض پہنچے تو ایسی یادگار بنانا نہ صرف جائز ہے بلکہ ایسی یادگار بنانی چاہئے اور اصحاب کہف کا یہ واقعہ اس کی دلیل ہے اور لاٹ جیسی یادگاریں بنانا بیکار ہے، کیونکہ اس طرح کی یادگار کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اس گذرے ہوئے شخص کو لوگ یاد رکھیں قرآن نے کہا: ﴿رَبُّهُمْ أَعْلَمُ بِهِمْ﴾: غاروالوں کا پروردگار ان کو خوب جانتا ہے، اس میں اشارہ ہے کہ اشوک کو یا اس کے مانند لوگوں کو جاننے کے لئے یادگار کی ضرورت نہیں اور لوگوں کے جاننے نہ جاننے سے کیا فرق پڑتا ہے، یہ جذبہ کہ میں ایسا کام کر جاؤں کہ لوگ مجھے جانیں یہ بیکار جذبہ ہے، لوگ جانے تو کیا اور نہ جانے

تو کیا، اللہ کا جاننا اصل ہے اور اللہ ہر چیز جانتے ہیں کہ بندہ برا تھا یا اچھا، جنتی تھا یا جہنمی؟ اللہ کو سب معلوم ہے، اگر کسی کو یادگار بنانی ہے تو بنائے مگر ایسی چیز بنائے کہ جس کا لوگوں کو فیض پہنچے اور بنانے والے کو ثواب پہنچے، ایسی یادگار ہوگی تو لوگ یاد بھی رکھیں گے اور ثواب بھی ملتا رہے گا، ایک اعلی درجہ کی حدیث ہے: **من بنى لله مسجداً بنى الله له بيتاً في الجنة**: جو اللہ کے لئے مسجد بناتا ہے اللہ اس کے لئے جنت میں حویلی بناتے ہیں، اس میں یہ ہے: **من بنى لله**: جو اللہ کے لئے یعنی اس کی خوشنودی کے لئے مسجد بناتا ہے، بخاری کی شرح عمدۃ القاری میں یہ مسئلہ لکھا ہے کہ اگر کسی نے مسجد بنائی اور اس پر بانی کی حیثیت سے اپنا نام لکھا تو **كان بعيداً عن الإخلاص** اخلاص باقی نہیں رہا، یہ تو ناموری کے لئے مسجد بنائی، ہاں دوسرے بندے بانی کی ادنی خواہش کے بغیر لکھیں تو اس میں کچھ حرج نہیں۔

الغرض نیک لوگوں کی قبر پر مسجد بنانے کا مسئلہ قرآن کریم میں ہے سلفی اس کو بالکل نہیں مانتے، خود روضہ اقدس کا فیض مسجد نبوی میں نہیں مانتے، یہ سر پھرے ہیں ان کی باتیں سننے کی ضرورت نہیں۔

میں عرض یہ کر رہا تھا کہ مولانا برکات احمد ٹونکی نے کلیر کی مسجد میں چالیس دن کا اعتکاف کیا اور اللہ سے دعا کی کہ استاذ کسی طرح راضی ہو جائیں اور دوبارہ پڑھانا منظور کرلیں، پھر ٹونک گئے، وہ خود بھی بڑے خاندان کے تھے مگر پھر بھی ٹونک کے نواب سے سفارش کے لئے کہا، ٹونک کے نواب کے مولانا عبدالحق صاحب سے تعلقات نہیں تھے اس لئے انہوں نے رامپور کے نواب کے نام جن کے حضرت سے تعلقات تھے سفارش لکھی اور رامپور کے نواب نے حضرت مولانا عبدالحق صاحب سے سفارش کی کہ اس لڑکے کو آپ دوبارہ پڑھانا منظور فرمالیں، حضرت نے فرمایا: ٹھیک ہے بھیج دو، پڑھاؤں گا مگر جب چاہوں گا امتحان لوں گا، اس کے بعد اس طالب علم کا یہ حال تھا کہ روزانہ سونے سے پہلے پچھلا تمام پڑھا ہوا یاد کر کے سوتا تھا، کیونکہ ممکن ہے کل پڑھنے جاؤں اور استاذ امتحان لے لیں، مگر پھر حضرت نے کبھی امتحان نہیں لیا کیونکہ استاذ کو اندازہ ہو گیا تھا کہ طالب علم پچھلا یاد کر کے آتا ہے، اسی طرح قیامت بھی ایک امتحان کا دن ہے، اگر پہلے سے امتحان کی ساری تفصیل بتادی جائے تو پھر

امتحان کیا رہا اس لئے اللہ نے فرمایا: ﴿أَكَادُ أُخْفِيهَا﴾: چاہئے تو یہ تھا کہ میں قیامت کی کسی کو بھنک نہ پڑنے دیتا مگر اللہ کا کرم اور احسان ہے تھوڑا بہت انہوں نے بتادیا، لیکن بالکل صحیح وقت اللہ نے کسی کو نہیں بتایا۔ اس آیت کے پہلے جملے میں تاکیدات ہیں کہ قیامت کا علم اللہ کے سوا کسی کو نہیں، اور جو کچھ باتیں ہم جانتے ہیں اس سے قرآن کریم کے حصر پر کوئی فرق نہیں پڑتا، پھر آگے چار مضمون ہیں: (۱) اللہ تعالی بچہ دانیوں میں جو کچھ ہے اسے جانتے ہیں، آیت میں مَا ہے مَنْ نہیں اور ما غیر ذوی العقول کے لئے آتا ہے، اور ڈاکٹر اس وقت بتاتے ہیں جب وہ مَن بن جاتا ہے (۲) اور اللہ تعالی بارش برساتے ہیں (۳) کوئی شخص نہیں جانتا کہ آئندہ کل کیا کرے گا، آدمی پلان بناتا ہے مگر کل اس پر وہ واقعی عمل پیرا ہو جائے گا یہ آدمی کو معلوم نہیں، حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا مشہور ارشاد ہے: **عرفت ربّی بفسخ العزائم**: میں جو پختہ ارادہ کرتا ہوں پھر وہ پورا نہیں ہوتا تو اس سے میں سمجھتا ہوں کہ میرے ارادے کے اوپر کوئی پروردگار ہے جس کے ارادہ کے مطابق کام ہوتا ہے (۴) اور کوئی شخص یہ بات نہیں جانتا کہ اس کی موت کہاں آئے گی۔

حصر کرنے کا ایک طریقہ

پہلے جملے میں تو حصر کے کلمات ہیں بعد کے ان چاروں جملوں میں حصر کا کوئی لفظ نہیں، عام جملے ہیں، مگر نبی پاک ﷺ نے ایک حدیث میں فرمایا کہ یہ پانچوں باتیں اللہ کے علاوہ کوئی نہیں جانتا، حضرت جبرئیل علیہ السلام نے جب قیامت کے بارے میں پوچھا تھا تو آپؐ نے فرمایا کہ تمہیں معلوم نہیں اس لئے پوچھ رہے ہو مجھے بھی معلوم نہیں اس لئے کیا بتاؤں، پھر فرمایا: **فی خمس لایعلمهن إلا الله**: قیامت کی بات ان پانچ باتوں میں سے ایک ہے جن کو اللہ کے علاوہ کوئی نہیں جانتا، اس حدیث سے معلوم ہوا کہ باقی چار باتوں میں اگرچہ حصر پر دلالت کرنے والا کوئی لفظ نہیں مگر حصر ہے، کیسے حصر ہے؟ جیسے ایک انجن دلی جا رہا ہے اس کے پیچھے چار ڈبے جوڑ دئے جائیں جن میں نہ کوئلہ ہے نہ ڈیزل، جب انجن دلی پہنچے گا تو یہ ڈبے بھی دلی پہنچیں گے، پہلا جملہ جو کہ انجن ہے اس میں حصر ہے تو اس کے

ساتھ جو چار ڈبے جوڑے گئے ہیں ان میں بھی حصر ہو گیا، اور یہ مقام حضور ہی کا ہے، حضور قرآن کی یہ تفسیر کر سکتے ہیں، امت میں سے کسی کے بس میں یہ بات نہیں۔

اس حدیث کو جب آیت کے ساتھ ملایا جائے تو سوال پیدا ہوگا کہ بچہ دانیوں میں جو ہے اس کو صرف اللہ ہی نہیں جانتے حالانکہ ڈاکٹر بھی جانتے ہیں پس سمجھنے کی بات یہ ہے کہ ہر ہر جملہ میں ایسا لفظ ہونا ضروری نہیں جو حصر پر دلالت کرے، پہلا جملہ جو انجن بن کر چل رہا ہے اس میں حصر ہے اور باقی جملے اس پر عطف ہو رہے ہیں پس یہ حصر سب میں چلا جائے گا اور یہ تفسیر ما وشما نہیں کر سکتے اللہ کا رسول ہی کر سکتا ہے۔

حصر کرنے کا ایک اور طریقہ

ایسا ہی حصر کرنے کا ایک اور طریقہ ہے جو ان غیر مقلدوں کے سمجھ میں نہیں آتا، وہ طریقہ یہ ہے کہ کسی چیز میں حصر کا لفظ تو نہ ہو، مگر حصر کا فلیور (خوشبو) ہو جیسے مینگو فروٹی میں آم کا رس نہیں ہوتا، اس کا فلیور ہوتا ہے، ایسے ہی بعض جملے ایسے ہوتے ہیں کہ ان میں حصر کے الفاظ تو نہیں ہوتے مگر حصر کا فلیور ہوتا ہے، اس فلیور کو بھی اللہ کا رسول ہی پہچان سکتا ہے مجتہدین نہیں پہچان سکتے، سورہ نساء کے بالکل شروع میں یہ مضمون ہے کہ لوگ جنگوں میں مارے جاتے تھے، ان کے چھوٹے چھوٹے بچے دوست یا کوئی رشتہ دار پالتا تھا، ان بچوں کے باپ کی جو جائیداد ہوتی تھی وہ بھی اس پرورش کرنے والے کے قبضہ میں ہوتی تھی، پھر جب یتیم بچی بڑی ہو گئی اب اگر اس کا نکاح کسی اور سے کر دیں گے تو اس کی جائیداد بھی اس کو دینی پڑے گی، جائیداد دینے کو جی نہیں چاہتا، پس کرتے یہ تھے کہ اس یتیم بچی سے شادی کر لیتے تھے اور شادی کے بعد نہ تو ڈھنگ سے مہر دیتے تھے، نہ ہی بیوی والے حقوق پوری طرح ادا کرتے تھے، اس شادی کا مقصد صرف اس یتیم بچی کی جائیداد پر قبضہ رکھنا ہوتا تھا چنانچہ اس سلسلے میں قرآن نے احکام نازل کئے اور فرمایا: ﴿وَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تُقْسِطُوْا فِي الْيَتٰمٰى﴾: اگر تمہیں ڈر ہو کہ تم یتیم لڑکی کے ساتھ نکاح کر کے انصاف نہیں کر سکو گے ﴿فَانْكِحُوْا مَاطَابَ لَكُمْ مِنَ النِّسَاءِ مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ﴾ تو تم ان یتیم لڑکیوں سے نکاح مت کرو، ان کا نکاح دوسری

جگہ کرو، اور تمہیں واقعی دوسری بیوی کی ضرورت ہو تو جو عورتیں تمہیں اچھی لگیں ان سے نکاح کرو، دو دو سے کرو، تین تین سے کرو، چار چار سے کرو، چار پر آ کر اللہ پاک رک گئے اور قاعدہ ہے کہ معرض بیان میں آدمی رک جائے تو حصر ہو جاتا ہے، جیسے کسی نے پوچھا کہ آپ انڈیا سے کتابیں لائے ہیں؟ جی ہاں لایا ہوں! اس نے پوچھا: میں ان میں سے لے سکتا ہوں؟ ہاں لے سکتے ہو، ایک لو دو لو تین لو، پس وہ تین ہی لے سکتا ہے چوتھی نہیں لے سکتا کیونکہ میں اجازت دیتا ہوا تین پر رک گیا تو اس میں خود بخود حصر آ گیا اب وہ تین ہی لے سکتا ہے چوتھی نہیں لے سکتا، اسی طرح اللہ تعالی اجازت دیتے ہوئے چار پر رک گئے، معلوم ہوا کہ بس چار تک ہی نکاح ہو سکتے ہیں اس سے آگے نہیں ہو سکتے، اس سے زائد اگر نکاح جائز ہوتے تو اللہ تعالیٰ نہ رکتے کیونکہ یہ معرض بیان ہے، یہ ہے حصر کا فلیور اور اس فلیور کو بھی اللہ کے رسول سمجھیں گے ماوشما کے بس کی یہ بات نہیں، چنانچہ حضرت غیلان ثقفی جب مسلمان ہوئے تو ان کے نکاح میں دس بیویاں تھیں حضور ﷺ نے کہا: چار رکھو چھا لگ کرو یہ حضورؐ نے جو فیصلہ کیا ہے وہ اسی آیت سے کیا ہے، ایک دوسرے صحابی مسلمان ہوئے تو ان کے نکاح میں آٹھ بیویاں تھیں، حضور نے ان سے کہا چار رکھو چار الگ کرو، یہ دو واقعے ہیں، غیر مقلدین ان کو ضعیف بتاتے ہیں، مگر ان حدیثوں سے مسئلہ نہیں ثابت کرنا ان حدیثوں سے آیت پاک کی تفسیر کرنی ہے اور آیت پاک کی تفسیر ضعیف حدیث سے بھی ہو سکتی ہے، بہر حال یہ جو دو حدیثیں ہیں جن میں آپ نے چار سے زائد بیویوں کو الگ کرایا ہے ان سے معلوم ہوا کہ آیت پاک میں اگر چہ حصر کا کوئی لفظ نہیں مگر اس کا فلیور ہے کیونکہ اللہ تعالی معرض بیان میں اجازت دیتے ہوئے چار پر رک گئے ہیں معلوم ہوا کہ اجازت یہیں تک ہے اور یہ اجماعی مسئلہ ہے، ائمہ اربعہ کا اس میں کوئی اختلاف نہیں اور غیر مقلدین اگر اختلاف کرتے ہیں تو کرتے رہیں کیونکہ گمراہ فرقوں کے اختلاف سے اجماع پر کوئی اثر نہیں پڑتا، اگر گمراہ فرقوں کا اختلاف بھی اجماع کو متاثر کرے گا تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت بھی اجماعی نہیں رہے گی کیونکہ شیعہ اس میں اختلاف کرتے ہیں، مگر شیعوں کے نہ ماننے سے صحابہ کے اجماع میں کوئی فرق نہیں پڑتا اسی طرح اس مسئلہ میں غیر مقلدین کے

اختلاف سے ائمہ اربعہ کے اجماع پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

میں عرض یہ کررہا تھا کہ انجن میں حصر ہے تو اس کے ساتھ لگے ہوئے ڈبوں میں بھی حصر ہوگا، لہٰذا آیت میں بعد کے چار جملوں میں بھی حصر ہے، اسی طرح کسی جملہ میں کوئی کلمہ حصر نہ ہو مگر حصر کا فلیور ہو تو وہاں بھی حصر ہو جاتا ہے، یہ اتنی باریک باتیں ہیں کہ مجتہد ان کو سمجھ نہیں سکتا یہ وہی سمجھ سکتا ہے جس پر کلام نازل ہوا ہے۔

علم کی تین قسمیں: علم الیقین، عین الیقین اور حق الیقین

پس کسی بھی معاملہ کا تھوڑا سا حصہ جان لینا جان لینا نہیں، معاملہ سارا جاننا ہی جاننا ہے ورنہ جاننا نہیں، اسی لئے علم کی تین قسمیں کی گئی ہیں علم الیقین: یقینی طور پر جاننا، معاملہ میں ذرا شک نہ رہے جیسے ہم یہ بات جانتے ہیں کہ لا إلٰه إلا الله صرف اللہ ہی معبود ہیں ان کے علاوہ اور کوئی عبادت کے لائق نہیں، یہ بات ہم ایسی جانتے ہیں کہ اس میں شک وشبہ کا کوئی گذر نہیں، یہ علم الیقین آدمی کو جب حاصل ہوتا ہے تب وہ ایمان والا ہوتا ہے، اس سے پہلے ایمان نہیں، اور صرف اتنے سے ایمان کا درجہ حاصل نہیں ہوتا، یہ آدھا مضمون ہے اس کے ساتھ دوسرا جز لگا ہوا ہے محمد رسول اللہ یعنی جس پیغمبر کا زمانہ چل رہا ہے اس پیغمبر پر ایمان لانا اور اس سے پہلے کے تمام پیغمبروں پر ایمان لانا، یہ دوسرا مضمون حاصل ہو تو ایمان ملتا ہے اس کے بغیر نہیں، اور یہ جو میں نے کہا کہ پہلے کے تمام پیغمبروں پر ایمان لانا یہ ہمارے اعتبار سے ہے ہم سے پہلے ایسا نہیں تھا ہم سے پہلے یہ تھا کہ جس نبی کا زمانہ چل رہا ہے اس پر ایمان لانا، اس سے پہلے کے تمام نبیوں پر ایمان لانا اور اس کے بعد آنے والے سب نبیوں پر ایمان لانا ضروری تھا، مگر اب ہمارے آقا کے بعد چونکہ کوئی نبی آنے والا نہیں اس لئے صرف حضور ﷺ پر اور ان سے پہلے والے تمام نبیوں پر ایمان لانا واجب ہے سورہ بقرہ میں ہے:
﴿وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ وَمَا أُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ، وَبِالآخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ﴾ متقی وہ ہیں جو اس کتاب پر ایمان لاتے ہیں جو آپ پر نازل کی گئی اور ان کتابوں پر بھی ایمان لاتے ہیں جو آپ سے پہلے اتاری گئیں، آپ کے بعد؟ آپ کے بعد کوئی نہیں اس لئے اس

کا ذکر نہیں کیا۔

پھر ایسے شواہد، دلائل اور بینات انسان کے سامنے آتے ہیں کہ اس کی وجہ سے یقین بالائے یقین ہو جاتا ہے، یہ حق الیقین کہلاتا ہے جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ سے درخواست کی ﴿رَبِّ أَرِنِیْ کَیْفَ تُحْیِ الْمَوْتٰی﴾ اے میرے پروردگا! مجھے دکھلائیے کہ آپ قیامت کے دن مردوں کو کیسے زندہ کریں گے؟ اللہ نے پوچھا: ﴿ أَوَلَمْ تُؤْمِنْ؟﴾ کیا تم اس بات پر ایمان نہیں رکھتے؟ ﴿قَالَ بَلٰی!﴾ کہا: کیوں نہیں! پکا یقین ہے یہ علم الیقین ہے ﴿وَلٰکِنْ لِیَطْمَئِنَّ قَلْبِیْ﴾ مگر میں اپنی آنکھ سے اس لئے دیکھنا چاہتا ہوں کہ میرے قلب کو اطمینان حاصل ہو جائے یہی حق الیقین ہے۔ چنانچہ اللہ نے ان کو منظر دکھلایا اور حضرت کو منظر دیکھ کر حق الیقین حاصل ہو گیا حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اس واقعہ میں تو یہ سمجھنا آسان ہے کہ یہ علم الیقین ہے اور یہ حق الیقین ہے مگر ہم اپنی زندگی میں الگ الگ کر کے یہ نہیں سمجھا سکتے کہ یہاں تک علم الیقین ہے، پھر یہ واقعات پیش آئے اور وہ ان حالات سے گذرا تو اس کا ایمان پکا ہو گیا اور اس کو حق الیقین کا درجہ حاصل ہو گیا مثال دے کر اس کو نہیں سمجھا سکتے۔

اور اگر چاہو کہ مثال ضرور دی جائے تو یہ مثال سنو ایک حدیث شریف ہے نبی پاک ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص حج کر سکتا ہے یعنی بدن درست ہے ہاتھ میں خرچہ ہے راستہ میں کوئی خطرہ نہیں، پھر بھی اس نے حج نہیں کیا فلا علیه أن یموت یهودیا أو نصرانیا اس پر کوئی حرج نہیں کہ وہ یہودی ہو کر مرے یا عیسائی ہو کر مرے اب میں الفاظ بدلتا ہوں تا کہ بات سمجھ میں آئے آپ نے فرمایا کہ جس کے پاس گنجائش ہے حج کر سکتا ہے پھر بھی حج نہیں کرتا تو اسے مسلمان رہنے کی کیا ضرورت ہے یہودی کیوں نہیں ہو جاتا عیسائی کیوں نہیں ہو جاتا۔ علماء نے اس سے ایک مسئلہ نکالا ہے کہ انسان ہمیشہ معرض ارتداد میں رہتا ہے، ایمان سے ہٹ کر بے ایمان ہو سکتا ہے لیکن جس بندے نے حج کر لیا اور اس کو حج مبرور نصیب ہو گیا تو ان شاء اللہ اس کے ایمان پر مہر لگ گئی اب یہ مرتد نہیں ہوگا۔ اور اگر گنجائش ہے پھر بھی حج نہیں کرتا تو کسی بھی وقت ایسی صورت پیش آسکتی ہے کہ ہندو ہو جائے یا یہودی ہو جائے کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ یہ میں نے مثال دی ہے کہ یہاں تک اس کا ایمان علم الیقین تھا

حج کرنے کے بعد حق الیقین ہو گیا کہ اب وہ اسی پر جان دے گا۔

پھر ایک تیسرا مرحلہ ہے اور وہ یہ ہے کہ آدمی اس حقیقت کو جس کو وہ پہلے جانتا تھا، یقین بالائے یقین ہو چکا تھا اس حقیقت کا آدمی مشاہدہ کر لے یہ آخری درجہ ہے اس سے آگے کوئی درجہ نہیں، یہ عین الیقین ہے۔ یہ درجہ کب آتا ہے؟ یہ درجہ موت کے بعد آتا ہے اس سے پہلے یہ مرحلہ نہیں آتا سورۃ الحجر کی آخری آیت ہے: ﴿وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَأْتِيَكَ الْيَقِيْنُ﴾: اپنے پروردگار کی عبادت کرتے رہو تا آنکہ تمہیں یقین آجائے حدیث شریف میں یقین کی تفسیر موت سے آئی ہے۔ یہ دنیا ایمان بالغیب ہے پس جب یہ دنیا ایمان بالغیب ہے تو یہاں عین الیقین کا درجہ کیسے حاصل ہو سکتا ہے؟

غیب کسے کہتے ہیں

اللہ تعالیٰ نے علم حاصل کرنے کے لئے پانچ حواس دئے ہیں: وہ حواس یہ ہیں: آنکھ، کان ناک چکھنا اور پورے جسم میں ٹٹولنے کی طاقت ہے اس سے جو علم حاصل ہوتا ہے وہ محسوسات کہلاتا ہے اور وہ حقیقتیں جو ان حواس کے دائرے میں نہیں آتیں ان کو ڈائرکٹ عقل سے سمجھنا ہے یہی غیب ہے ہم اللہ پر جنت پر جہنم پر ایمان رکھتے ہیں لیکن ہم ان کو دیکھ نہیں سکتے یہ سب غیب ہیں پس جب یہ سب غیب ہیں تو ہم ان میں عین الیقین کا درجہ کیسے حاصل کر سکتے ہیں۔

دوسرا مضمون میں نے کل یہ بتایا تھا کہ کسی غیب کا اگر اگاڑا پچھاڑا تھوڑا سا علم حاصل ہو جائے تو اس کو غیب کا جاننا نہیں کہتے۔

دوسرا ٹکڑا ہے: ﴿وَيُنَزِّلُ الْغَيْثَ﴾: بارش اللہ ہی برساتے ہیں بیشک! اللہ کے علاوہ کون ہے جو بارش برسائے؟ اس میں تو کوئی اشکال نہیں، کوئی اگر کہے کہ اب تو محکمہ موسمیات والے پہلے سے بتا دیتے ہیں کہ بارش اتنے دنوں کے بعد آئے گی اور اتنی آئے گی یہاں آئے گی اور یہاں نہیں آئے گی۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ آیت میں یہ مسئلہ نہیں ہے، آیت میں تو یہ بات ہے کہ اللہ ہی بارش برساتے ہیں اور اس میں کوئی شک نہیں ہے پھر محکمہ

موسمیات والے کب بتاتے ہیں؟ جب سمندر سے مانسون اٹھتا ہے اس کے بعد ہی وہ پیشین گوئی کر سکتے ہیں اس سے پہلے وہ بھی نہیں بتا سکتے اور بعض دفعہ ان کی ساری پیشین گوئیاں دھری کی دھری رہ جاتی ہیں۔

پھر فرمایا: ﴿وَيَعْلَمُ مَا فِي الْأَرْحَامِ﴾: جانتے ہیں اللہ اس چیز کو جو بچہ دانیوں میں ہے، عربی میں دو لفظ ہیں: من اور ما، من ذوی العقول کے لئے ہے یعنی جو سمجھ کا اعلیٰ معیار رکھتے ہیں جیسے انسان، جنات اور فرشتے اس کے لئے من آتا ہے اور اردو میں ہم اس کا ترجمہ 'لوگ' کرتے ہیں ﴿وَلَهُ مَنْ فِي السَّمَاوَاتِ وَمَنْ فِي الْأَرْضِ﴾ اور اللہ کی ملک ہیں وہ لوگ جو آسمانوں میں ہیں اور وہ لوگ جو زمین میں ہیں۔ لوگ میں جنات اور فرشتے بھی آتے ہیں اگرچہ آدمی میں یہ دونوں نہیں آتے آدمی میں صرف مرد و عورت آتے ہیں۔ اور وہ چیزیں جن میں عقل و فہم کا اعلیٰ معیار نہیں وہ غیر ذوی العقول کہلاتے ہیں ان کے لئے ما استعمال ہوتا ہے اور اردو میں اس کا ترجمہ 'چیز' کرتے ہیں قرآن میں جگہ جگہ ہے ﴿لَهُ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ﴾ اللہ ہی کی ملک ہیں وہ چیزیں جو آسمانوں میں ہیں اور وہ چیزیں جو زمین میں ہیں بہر حال من اور ما میں یہ فرق ہے۔

اس کے بعد یہ سمجھو کہ من بھی عام ہے اور ما بھی عام ہے یعنی من بول کر ذوی العقول اور غیر ذوی العقول دونوں مراد لیتے ہیں اور ما بول کر بھی دونوں مراد لیتے ہیں مگر لفظ کے اصل معنی اصل رہتے ہیں اور دوسرے معنی اس کے تابع ہوتے ہیں، من دراصل ذوی العقول کے لئے ہے اور غیر ذوی العقول اس کے تابع ہونگے۔

اور جہاں ما بولیں گے وہاں غیر ذوی العقول اصل ہونگے اور ذوی العقول اس کے تابع ہونگے اس کے بعد جاننا چاہئے کہ جب تک عورت اور مرد کے مادے بچہ دانی میں نہیں پہنچتے تب تک کوئی حقیقت نہیں رکھتے اور جب وہ بچہ دانی میں پہنچ گئے اور علوق ہوگیا تو اب یہ ما ہے۔ اس کے بعد سب سے پہلا مرحلہ یہ ہے کہ یہ اندر ٹھہرے گا اور کچھ بنے گا یا گر جائے گا؟ اس کو اللہ ہی جانتے ہیں کوئی سائنس اس کو نہیں بتا سکتی، اور پھر اسقاط حمل کس مرحلہ میں ہوگا اس کو بھی اللہ کی علاوہ کوئی نہیں جانتا۔ یہ مادے چالیس دن میں علقہ بنتے ہیں یعنی کلیجی

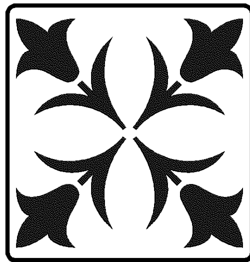
اور تلیّ کی طرح جما ہوا خون بنتے ہیں پھر علقہ گوشت کی بوٹی بنتا ہے۔ پھر گوشت میں سفید دھاگے بنتے ہیں اور یہی آگے چل کر ہڈی بنتے ہیں اور باقی گوشت ہڈیوں پر چڑھ جاتا ہے اب یہ مادہ ان مرحلوں تک پہنچے گا یا نہیں؟ اللہ ہی بہتر جانتے ہیں۔ اور یہ سب چیزیں ما میں داخل ہیں۔ پھر جب جسم تیار ہو گیا تو قرآن کریم کہتا ہے: ﴿ثُمَّ أَنْشَأْنَاهُ خَلْقًا آخَرَ﴾: پھر ہم اسے ایک نئی مخلوق بنا دیتے ہیں۔ فرشتہ کو حکم ہوتا ہے چنانچہ وہ عالم ارواح سے روح لا کر اس میں ڈالتا ہے اور وہ ڈھانچہ انسان بن جاتا ہے۔ بہر حال جب ڈھانچہ میں روح پڑتی ہے تو وہ وجود بنتا ہے اور من کے مرحلہ میں داخل ہوتا ہے اور آگے بھی بہت مراحل ہیں، اگلا مرحلہ یہ ہے کہ جب فرشتہ اللہ کے حکم سے روح لا کر ڈالتا ہے تو اللہ تعالی اس کو چار باتوں کا حکم دیتے ہیں اور وہ فرشتہ چار باتوں کو لکھتا ہے پہلی بات: ما أجله؟ اس کی زندگی کتنی ہوگی؟ ما رزقه: اس کی روزی کتنی ہے؟ ساری تفصیل لکھ دی جاتی ہے۔ ما عمله؟ مرنے تک وہ کیا عمل کرے گا؟ یہ ساری تفصیل بھی لکھ دی جاتی ہے۔ اور آخری چیز ہے کہ کیا وہ نیک بختوں میں سے ہے یا بدبختوں میں سے؟ یہ بھی لکھ دیا جاتا ہے اور یہ چاروں باتیں اللہ فرشتے کو بتاتے ہیں اور وہ لکھتا ہے۔ یہ سارے مرحلے ما کے ہیں۔ قرآن نے کہا: ﴿وَيَعْلَمُ مَا فِي الْأَرْحَامِ﴾: وہ چیز جو بچہ دانیوں میں ہے اسے اللہ ہی جانتے ہیں یعنی پیدائش کے یہ مراحل شروع سے لے کر آخر تک اللہ ہی جانتے ہیں پس اگر درمیان میں ایکسرے مشین نے لڑکا یا لڑکی ہونا بتا دیا، تندرست ہے یا بیمار ہے بتا دیا تو یہ ذرا سا حصہ معلوم ہوا اور یہ تو من کا مرحلہ ہے جب تک یہ من نہ بنے گا کوئی مشین کچھ نہیں بتا سکتی جب تک وہ ما کے مرحلہ میں ہے کوئی مشین اور کوئی ڈاکٹر کچھ نہیں بتا سکتا کہ وہ لڑکا ہو گا یا لڑکی تندرست ہو گا یا بیمار؟ اور من کے مرحلہ کے بعد جو چار مرحلے آتے ہیں جن کو اللہ کے حکم سے فرشتہ لکھتا ہے یہ چاروں بھی ما کے مرحلے ہیں اور ان کو بھی دنیا کی کوئی طاقت نہیں بتا سکتی بہر حال سمجھنے کی بات یہ ہے کہ شروع میں بھی ما کا مرحلہ ہے اور آخر میں بھی ما کا مرحلہ ہے بیچ میں ذرا سا من کا مرحلہ آیا ہے اس کو اگر ڈاکٹر نے جان لیا تو اس میں اشکال کی کیا بات ہے؟

اس کے بعد اگلا جملہ ہے: ﴿وَمَا تَدْرِيْ نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا﴾: کوئی نہیں جانتا

کہ آئندہ کل وہ کیا کرے گا حالانکہ ہم سب پروگرام بناتے ہیں اور ہم جو پروگرام بناتے ہیں ننانوے فیصد اس کے حساب سے کام بھی کرتے ہیں جبکہ اللہ فرماتے ہیں آئندہ کل آدمی کیا کام کرے گا اس کو کوئی نہیں جانتا اسی لئے میں نے بتایا تھا مکمل جاننا ہی جاننا ہے کچھ باتوں کا جان لینا جاننا نہیں، یوں تو قیامت کے بارے میں بھی ہم بہت سی باتیں جانتے ہیں مگر وہ قیامت کا جاننا نہیں، یہاں بھی جو آدمی پروگرام بناتا ہے اگر یہ پروگرام بالیقین پورا ہو، کبھی تخلف نہ ہو تو آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ انسان بھی اپنے آئندہ کل کا پروگرام جانتا ہے حالانکہ ہمارے بنائے ہوئے پروگرام بعض مرتبہ فیل ہو جاتے ہیں اور ہوتا وہی ہے جو اللہ کو منظور ہوتا ہے اور اس جملہ پر کوئی اعتراض بھی نہیں کرتا۔

آخری جملہ ہے: ﴿وَمَا تَدْرِیْ نَفْسٌ بِأَیِّ أَرْضٍ تَمُوْتُ﴾: کوئی نفس نہیں جانتا کہ وہ کس سرزمین میں مرے گا عام طور سے لوگ جہاں پیدا ہوتے ہیں وہیں مرتے ہیں لیکن یہ جاننا نہیں بالیقین سو فیصد آدمی جانے کہ وہ فلاں جگہ مرے گا اور یہ فلاں جگہ مرے گا تو اس کو جاننا کہا جا سکتا ہے لیکن انسان اس طور سے نہیں جانتا۔ یہ پانچوں باتیں اللہ ہی جانتے ہیں ﴿إِنَّ اللّٰهَ عَلِیْمٌ خَبِیْرٌ﴾ وہ خوب جاننے والے ہیں اور ہر معاملہ سے باخبر ہیں۔

وآخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمين





آگ والے اور باغ والے برابر نہیں

خطبہ مسنونہ کے بعد﴿لَايَسْتَوِىْ أَصْحَابُ النَّارِ وَأَصْحَابُ الْجَنَّةِ، أَصْحَابُ الْجَنَّةِ هُمُ الْفَائِزُوْنَ ۝ لَوْ أَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْآنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَأَيْتَهُ خَاشِعًا مُتَصَدِّعًا مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ، وَتِلْكَ الْأَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ﴾

بزرگو اور بھائیو! یہ دو آیتیں ہیں جن کی قاری صاحب نے تلاوت فرمائی ہے، ان آیتوں میں نہایت اہم مضمون ہے، آج مختصر طور پر اس کو سمجھ لیا جائے۔

دنیا میں اچھے برے رلے ملے ہیں

﴿لَايَسْتَوِىْ أَصْحَابُ النَّارِ وَأَصْحَابُ الْجَنَّةِ﴾: آگ والے اور باغ والے برابر نہیں، کچھ لوگ اس زندگی کے ختم پر باغ میں پہنچیں گے اور کچھ آگ میں، باغ میں پہنچنے والے اور آگ میں پہنچنے والے اس دنیا میں تو برابر ہیں، اس دنیا میں ان کے درمیان کوئی فرق نہیں، جو باغ والے ہیں وہ مالدار بھی ہیں اور نان شبینہ کے محتاج بھی، تندرست بھی ہیں اور بیماریوں کے شکار بھی، عزت والے بھی اور ذلت سے دوچار بھی، بالکل یہی حال آگ والوں کا ہے، لیکن آگے ایک زندگی آرہی ہے جہاں دانہ اور بھس الگ الگ کردیئے جائیں گے۔

کھیت میں جب گیہوں بوتے ہیں تو پہلے اس کا پودا نکلتا ہے پھر اس پر بالی آتی ہے پھر وہ پکتا ہے، پکنے تک گھاس، تنکا، بھوسا، دانہ سب ایک ساتھ ہوتے ہیں، بلکہ اگر غور کیا جائے تو سب کچھ نظر آتا ہے، نظر نہیں آتا تو دانہ نظر نہیں آتا، جو مقصود ہے، کاشتکار اسی دانہ کے لئے کھیت بوتا ہے، پھر ایک وقت آتا ہے کہ کھیت پک جاتا ہے، پھر کٹتا ہے، کھلیان میں جمع کیا جاتا ہے، گاہا جاتا ہے، برسایا جاتا ہے، برسانے کے بعد گیہوں نیچے گرتا ہے اور بھس دور جا پڑتا ہے، پھر دانہ اور بھس دونوں کو گھر لے جایا جاتا ہے، دانہ کوٹھی میں رکھا جاتا ہے، اور بھس

باڑے میں ڈالا جاتا ہے، اسی طرح اس دنیا میں آگ والے اور باغ والے الگ الگ نہیں ہیں، یہاں سب ایک جیسے دکھتے ہیں بلکہ بعض مرتبہ ایسا دکھتا ہے کہ دنیا انہی کافروں کے لئے ہے، اللہ تعالی نے قرآن کریم میں ان کے غلبے کی مثال دی ہے: جب بارش ہوتی ہے تو بستی اور جنگل کا پانی نالے میں چلتا ہے اور خس وخاشاک پانی پر ایسے چھائے رہتے ہیں کہ پانی نیچے ہوتا ہے اور کوڑا کرکٹ اوپر، لیکن تالاب میں پہنچنے کے بعد: ﴿أَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَاءً﴾: کوڑے کرکٹ کو ہوائیں کنارے پر پھینک دیتی ہیں اور صاف وشفاف پانی تالاب میں رہ جاتا ہے، اسی طرح اس دنیا کی زندگی میں ایسا نظر آتا ہے کہ باطل سر چڑھا ہوا ہے، لیکن ایک وقت آئے گا کہ دنیا کی کھیتی کٹ جائے گی، دانہ بھس الگ الگ کر دیا جائے گا، پھر خلاصۂ کائنات جنت میں جائے گا اور کوڑا جہنم میں جلنے کے لئے ڈال دیا جائے گا۔

اگلی زندگی کے نمونے

قرآن کریم اور احادیث شریفہ میں یہ مضمون بار بار سمجھایا گیا ہے کہ یہ دنیا ہمیشہ رہنے والی نہیں، دنیا کی کھیتی ایک دن کٹنے والی ہے اور اس کی مثال ہر شخص کی موت ہے، کوئی ہے ایسا جسے نہیں مرنا؟ ہم دیکھ رہے ہیں کہ لوگ مرتے چلے جا رہے ہیں، ہمیں خود اپنے بارے میں موت کا یقین ہے اور جیسے ایک شخص کی موت ہے ایسی ہی ساری دنیا کی موت، پوری دنیا کی موت کا نمونہ فرد کی موت ہے، جو حکم جزئی کا ہوتا ہے وہی کلی کا ہوتا ہے پس جب ہر فرد کو مرنا ہے تو تمام افراد یعنی دنیا کو بھی مرنا ہے، اور ہر فرد کی موت کا نمونہ ہے نیند، نیند موت کی بہن ہے حدیث شریف میں ہے: النوم أخو الموت: چوبیس گھنٹے میں انسان کم از کم ایک مرتبہ ضرور مرتا ہے، پھر بھی ہمیں موت کا یقین جیسا چاہئے نہیں ہے، ہم دوسروں کو مرتا دیکھتے ہیں پھر بھی ہمیں دنیا کے مرنے کا یقین جیسا چاہئے نہیں ہوتا۔

غرض اللہ نے ہر چیز کو سمجھنے کے لئے اس دنیا میں نمونے رکھے ہیں، اگلی زندگی میں پیش آنے والی باتوں میں کوئی بات ایسی نہیں جس کا نمونہ اس دنیا میں نہ ہو اور یہ نمونے اس لئے رکھے ہیں کہ انسان آگے آنے والی زندگی کو سمجھے۔

اسی طرح کسی مصلحت سے اللہ تعالی نے اس دنیا میں خیر وشر رلے ملے رکھے ہیں مگر

ایک وقت آئے گا کہ خیرا لگ ہو جائے گی اور شر الگ، جیسے کھیت میں گھاس دانہ تنکا بھوسا سب رلا ملا رہتا ہے پھر ایک وقت آتا ہے کہ دانہ الگ کرلیا جاتا ہے اور بھس الگ، اب دانہ عزت کی جگہ پر پہنچے گا اور بھس باڑے میں، دانہ کو انسان کھائیں گے اور بھس کو جانور، دانہ بڑی قیمت پر بکے گا اور بھس معمولی قیمت پر، ایسے ہی اگلی زندگی میں خیر وشر الگ کردئے جائیں گے، ایک عزت کی جگہ پر پہنچے گا اور ایک ذلت کی جگہ پر، ایک کی بڑی قیمت ہوگی اور دوسرا بے قیمت، اللہ فرماتے ہیں: ﴿وَسِيْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا إِلٰى جَهَنَّمَ زُمَرًا ﴾: جن لوگوں نے اللہ کے نازل کئے ہوئے دین کو قبول نہیں کیا ان کو گروہ گروہ بنا کر دوزخ کی طرف ہانکا جائے گا۔ ﴿وَسِيْقَ الَّذِيْن اتَّقَوْا رَبَّهُمْ إِلٰى الْجَنَّةِ زُمَرًا﴾: اور جو لوگ اپنے پروردگار سے ڈرتے ہیں ان کے حکم کے مطابق زندگی گزارتے ہیں ان کو بھی گروہ گروہ بنا کر باغ کی طرف لے جایا جائے گا، سورۂ یٰس میں ہے: ﴿وَامْتَازُوْا الْيَوْمَ أَيُّهَا الْمُجْرِمُوْنَ﴾: اے بدکارو! آج نیکوکاروں سے جدا ہو جاؤ، آج نیکوکار جنت میں جائیں گے اور بدکار جہنم میں، اب دونوں رلے ملے نہیں رہیں گے، ﴿لَايَسْتَوِىْ أَصْحَابُ النَّارِ وَأَصْحَابُ الْجَنَّةِ﴾: آگ والے اور باغ والے برابر نہیں ہو سکتے، دونوں میں کیا فرق ہے؟ ﴿أَصْحَابُ الْجَنَّةِ هُمُ الْفَائِزُوْنَ﴾: باغ والے ہی کامیاب ہونے والے ہیں، مقصد کو پانے والے ہیں، یہ آدھا مضمون ہے، باقی آدھا مخاطب کے فہم پر اعتماد کر کے چھوڑ دیا گیا ہے جب باغ والے ہی کامیاب ہیں تو آگ والے ہی ناکام ہیں۔

آخرت کی کامیابی کے لئے محنت

اس دنیا میں گنتی کے کچھ لوگ ہیں جو یہ خیال کرتے ہیں کہ دنیا کا کوئی مقصد نہیں، مگر اکثریت اس دنیا کو بامقصد جانتی ہے، عیسائی دوزخ اور جنت کو مانتے ہیں، وہ جتنی محنتیں کر سکتے ہیں جنت کو پانے کے لئے اور دوزخ سے بچنے کے لئے کرتے ہیں، یہودیوں، ہندوؤں اور بدھسٹوں کا بھی یہی حال ہے وہ سب جنت اور دوزخ کو مانتے ہیں اور جنت کو پانے کے لئے اور جہنم سے بچنے کے لئے ساری زندگی ہم سے زیادہ محنتیں کرتے ہیں، قرآن کریم اسی کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ دنیا میں ہر شخص جس کامیابی کا خواہش مند ہے وہ کامیابی

باغ والوں کے لئے ہے، ﴿أَصْحَابُ الْجَنَّةِ هُمُ الْفَائِزُوْنَ﴾: باغ والے ہی کامیاب ہونے والے ہیں، جو آگ میں جائیں گے وہ کامیاب نہیں ہونگے۔

خیر وشر کا سنگم

اللہ تعالی نے انسان کو ایسی سطح پر پیدا کیا ہے جو خیر وشر کا سنگم ہے، اس نقطے میں خیر وشر دونوں ملے ہوئے ہیں، پھر انسان کو یہ اختیار دیا ہے کہ اس سطح سے اوپر اٹھے اور اپنے آپ کو اتنا اونچا لے جائے کہ کرّوبی بھی پیچھے رہ جائیں، اور اپنے آپ کو اس سطح سے نیچے گرانے کا بھی اختیار دیا ہے، نیچے گر کر انسان اپنے آپ کو اسفل السافلین میں پہنچا دیتا ہے، اللہ فرماتے ہیں: ﴿وَنَفْسٍ وَّمَا سَوَّاهَا﴾: قسم ہے نفس کی اور اس کو درست بنانے کی، اللہ پاک ہماری روح کی قسم کھا رہے ہیں کہ ہم نے انسان کا نفس نہایت درست بنایا ہے: ﴿فَأَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوَاهَا﴾: اللہ نے نفس کو شاندار بنا کر اس کی بدکاریاں اور نیکوکاریاں اس کو الہام کیں، یہی وہ سطح ہے جس پر اللہ تعالی نے انسان کو پیدا کیا ہے، یہی وہ خیر وشر کا سنگم ہے: ﴿قَدْ أَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا﴾: بالیقین کامیاب ہوا وہ جس نے نفس کو ستھرا کیا: ﴿وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا﴾: اور بالیقین ٹوٹے میں رہا وہ جس نے اس کو میلا کر دیا، گندہ کر دیا، یہی نفس کو اٹھانا اور گرانا ہے، پھر اللہ نے نفس کو گرانے کی مثال دی ہے: ﴿كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ بِطَغْوَاهَا﴾: ثمود نے اپنی سرکشی کی وجہ سے حضرت صالح علیہ السلام کو جھٹلایا، قوم نے ایک چٹان کو نامزد کر کے کہا: اگر آپ اس چٹان میں سے اونٹنی نکال کر دکھائیں تو ہم آپ کی بات مان لیں، نہیں تو نہیں مانیں گے، ناچنا نہیں آنگن ٹیڑھا، ایمان لانا نہیں لیکن دہلا حضرت صالح کے سر رکھنا ہے کہ تم نے معجزہ نہیں دکھایا اس لئے ہم ایمان نہیں لائے، حضرت صالح علیہ السلام نے اللہ سے دعا کی، دعا کرتے ہی چٹان تڑخی اور اس کے دو حصے ہو گئے اور اندر سے ایسی اونٹنی نکلی جو دس مہینے کی گابھن تھی اور بیاہنے کو ہو رہی تھی، چنانچہ اس نے سب کے سامنے بچہ جنا، قوم نے ایک اونٹنی مانگی تھی اللہ نے دو نکال کر دکھائیں، اور ابھی نر اندر ہے، مگر قوم ایمان نہیں لائی، حضرت صالحؑ نے قوم سے کہا: جب تک تم اس اونٹنی کو نہیں ستاؤ گے دنیا میں پنپتے رہو گے اور جس دن تم نے اس کو بری نیت سے ہاتھ لگایا تمہاری خیر نہیں، اور حضرت صالحؑ نے یہ طے کیا کہ ایک دن تمہارے

جانور گاؤں کے کنویں پر پانی پئیں اور ایک دن یہ اونٹنی اکیلی پانی پیئے، پانی کی اس تقسیم کے ساتھ زمانہ چلتا رہا، ایک دن قوم نے میٹنگ کی کہ یہ اونٹنی تو ہمارے لئے دردسر بن گئی لہٰذا یہ کانٹا بیچ میں سے نکالنا چاہئے، ایک شخص تیار ہوا کہ اس اونٹنی کو میں قتل کروں گا، اس میٹنگ کی بھنک حضرت صالحؑ کو پڑ گئی، صالح علیہ السلام نے قوم کو سمجھایا اور ڈرایا کہ جس دن تم نے اس اونٹنی کو ہاتھ لگایا تمہاری خیر نہیں ہوگی، قرآن کہتا ہے: ﴿كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ بِطَغْوَاهَا إِذِ انْبَعَثَ أَشْقَاهَا﴾: یاد کرو اس وقت کو جب قوم کا سب سے بڑا بدبخت اٹھ کھڑا ہوا، ﴿فَقَالَ لَهُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ نَاقَةَ اللّٰهِ وَسُقْيَاهَا﴾ اللہ کے رسول نے قوم سے کہا: بچو تم اللہ کی اونٹنی سے اور اس کی پانی پینے کی باری سے، اس کی باری میں دخل مت دو ﴿فَكَذَّبُوْهُ فَعَقَرُوْهَا﴾: انھوں نے اللہ کے رسول کو جھٹلایا اور اس آدمی نے اونٹنی کی کونچیں کاٹ دیں، قتل کردیا، وہ اونٹنی پانی پینے جارہی تھی کہ اس نے پیچھے سے پیروں پر تلوار ماری جس سے اس کی کونچیں کٹ گئیں اور جب جانور کی کونچیں کٹ جاتی ہیں تو وہ چل نہیں سکتا وہ بیٹھ جاتا ہے اور بیٹھا بیٹھا مرجاتا ہے، جب انہوں نے اونٹنی کو زخمی کیا تو صالحؑ نے قوم سے کہا کہ تمہیں تین دن کی مہلت ہے، تین دن کے بعد عذاب آئے گا: ﴿فَدَمْدَمَ عَلَيْهِمْ رَبُّهُمْ بِذَنْبِهِمْ فَسَوّٰهَا﴾: پس اللہ نے ان پر ان کے گناہ کی وجہ سے عذاب ڈالا، پھر سب کو ملیامیٹ کردیا، ان میں سے ایک بھی نہیں بچا ﴿وَلَا يَخَافُ عُقْبَاهَا﴾: اور اللہ کو اس واقعہ کے انجام کا کوئی ڈر نہیں، اگر سارے ہلاک ہوجائیں تو ہوتے رہیں، اللہ کے یہاں کیا کمی آئے گی؟

قرآن پچھلی کتابوں کی اصلاح کرتا ہے

قرآن کریم پچھلی کتابوں میں جو گڑبڑ ہوئی ہے اس کی بھی اصلاح جگہ جگہ کرتا ہے، جیسے بائبل میں لکھا ہے: جب حضرت نوح علیہ السلام کے زمانہ میں طوفان آیا اور کشتی والوں کے علاوہ سب غرقاب ہوگئے تو اللہ تعالیٰ جائزہ لینے کے لئے زمین پر اترے کہ میں نے جو عذاب بھیجا تھا اس کا انجام کیا ہوا؟ گویا اللہ کو کچھ پتا ہی نہیں! ساری زمین پر گھوم کر جب اللہ نے دیکھا کہ ساری زمین تباہ ہوگئی ہے، کوئی چیز نہیں بچی تو اللہ تعالیٰ ایک ٹیلے پر بیٹھ کر بہت روئے اور یہ عہد کیا کہ آئندہ ایسا عذاب نہیں بھیجوں گا، العیاذ باللہ! اللہ تعالیٰ کی شان میں کیا

باتیں لکھ رکھی ہیں، قرآن کریم اس کو رد کرتے ہوئے کہتا ہے: ﴿وَلَا یَخَافُ عُقْبٰهَا﴾: اللہ کو ان کے ہلاک ہونے کا کچھ ڈر نہیں، یہ مثال ہے اس سطح سے نیچے اپنے آپ کو گرانے کی، ثمود نیچے گرتے گرتے اتنے نیچے گر گئے کہ انہوں نے کسی چیز کی پرواہ نہیں کی، اپنی تباہی کی بھی پرواہ نہیں کی، جب آدمی گرتا ہے تو اسے اپنا نفع نقصان یاد نہیں رہتا۔

اور جب انسان اس سطح سے اپنے آپ کو اوپر اٹھاتا ہے تو کہاں تک پہنچتا ہے؟

عیاں در دیدہ می گنجد نہاں در سینہ می گنجد ❁ مگر مرد آفاقی در دو عالم نمی گنجد

محسوسات (نظر آنے والی چیزیں) آنکھ کی پتلی میں سما جاتی ہیں، آپ پہاڑ کے سامنے کھڑے ہوں، دوسرا آدمی آپ کی آنکھ میں سارا پہاڑ دیکھ لے گا، اور معنویات (عقل سے سمجھی جانے والی چیزیں) آدمی کے دل و دماغ میں سما جاتی ہیں، مگر وہ شخص جس نے اپنے آپ کو اونچا اٹھایا ہے وہ اتنا پھیل جاتا ہے کہ اس کی سمائی کے لئے دنیا و آخرت کی پہنائی ناکافی ہو جاتی ہے، کرّوبی بھی اس سے پیچھے رہ جاتے ہیں۔

خاص فرشتوں سے خاص انسان اور عام فرشتوں عام انسان افضل ہیں

فرشتوں میں خاص فرشتے بھی ہیں اور عام بھی، خاص فرشتے جیسے حضرت جبرئیل، حضرت میکائیل، حضرت اسرافیل، حضرت عزرائیل علیہم السلام وغیرہ، بقیہ عام فرشتے ہیں، اسی طرح پر انسانوں میں خاص انسان بھی ہیں اور عام انسان بھی، جیسے انبیاء صحابہ اولیاء سب خاص انسان ہیں، بقیہ عام انسان ہیں، اور مسئلہ یہ ہے کہ خواص بشر خواص ملائکہ سے افضل ہیں، یعنی انبیاء افضل ہیں حضرت جبرئیل حضرت میکائیل علیہما السلام وغیرہ سے اور عام مؤمنین سے خواص ملائکہ افضل ہیں، حضرت جبرئیل حضرت میکائیل علیہما السلام وغیرہم عام انسانوں سے افضل ہیں اور عام فرشتوں سے عام مؤمنین افضل ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ انسان جب اپنے آپ کو اونچا اٹھاتا ہے تو اس کی سمائی کے لئے دونوں دنیا ناکافی ہو جاتی ہیں۔

جنت میں مؤمن عورتوں کا مقام

جیسے جنت میں دو قسم کی عورتیں ہونگی، ایک جنت کی مخصوص عورتیں جن کو ہم 'حور' کہتے ہیں اور ایک اس دنیا کی مؤمن عورتیں جو ایمان لاتی ہیں، زندگی بھر نیک اعمال کرتی ہیں، نفس

سے اور شیاطین سے مقابلہ کرتی ہیں، اور ایمان پر ان کا خاتمہ ہوتا ہے یہ جنتی عورتیں ہیں یہ جو دنیا کی مؤمن عورتیں جنت میں جائیں گی ان کا مقام و مرتبہ حوروں سے بڑھا ہوا ہوگا، ان عورتوں نے ایمان اور عمل صالح کے ذریعہ اپنے آپ کو اٹھایا تو حوریں پیچھے رہ گئیں ان کے سامنے ان کی کوئی حیثیت نہ رہی، تو اگر آدمی اس سطح سے اپنے آپ کو اونچا اٹھائے تو جنت المعلی تک پہنچ سکتا ہے اور نیچے گرائے تو اسفل السافلین میں پہنچ جائے گا، یہی مضمون اللہ نے اس آیت میں سمجھایا ہے کہ آگ والے اور باغ والے برابر نہیں، ایک ترقی کرتا ہوا جنت المعلی تک پہنچے گا، دوسرا گرتا ہوا اسفل السافلین تک پہنچ جائے گا، یہ ایک مضمون مکمل ہوا۔

اس کے بعد اللہ تعالی نے دوسرا مضمون بیان کیا ہے اور وہی اصل سمجھانا ہے، اگلی آیت میں اللہ تعالی نے قرآن مجید کا ذکر کیا ہے، پہلے مضمون کے بعد فوراً قرآن کریم کا ذکر کیوں کیا؟ اس لئے کیا کہ اگر کوئی شخص اپنے آپ کو اس سطح سے اٹھانا چاہے جس سطح پر اللہ تعالی نے اس کو پیدا کیا ہے، یا اگلی زندگی میں کامیاب ہونا چاہے تو اسے قرآن کریم کی رہنمائی کی ضرورت ہوگی، قرآن کریم کی رہنمائی کے بغیر وہ اپنے آپ کو اونچا نہیں اٹھا سکتا، ورنہ عیسائی بھی اپنے آپ کو اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں، یہودی، سادھو سنت وغیرہ بھی بہت محنت کرتے ہیں، مگر وہ جتنا اونچا اٹھنے کی کوشش کرتے ہیں وہ اتنا ہی نیچے گرتے ہیں، کیونکہ ان کے پاس قرآن کی رہنمائی نہیں اور قرآن کریم سے مراد اللہ کی طرف سے نازل کی ہوئی کتابیں ہیں، ہر کتاب اپنے زمانہ میں جب وہ صحیح حالت میں تھی اسی رہنمائی کے لئے آئی تھی، اب ان سب کتابوں کا دور گذر گیا اور وہ کتابیں اپنی اصل شکل میں باقی نہیں رہیں، آج صرف قرآن کریم اپنی اصلی حالت میں موجود ہے اس لئے اس کی رہنمائی ضروری ہے اس کے علاوہ کسی اور کتاب کی رہنمائی کافی نہیں، یہ مضمون اللہ پاک اگلی آیت میں بیان فرما رہے ہیں مگر قرآن کریم کا یہ انداز ہے کہ جب وہ کوئی مضمون بیان کرتا ہے تو اس کے جلو میں بہت سے مضامین چلتے ہیں، فرمایا: ﴿لَوْ أَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْآنَ عَلٰى جَبَلٍ﴾: اگر ہم اس قرآن کو کسی پہاڑ پر اتارتے آسمان اور زمین کے درمیان جو ٹھوس اور سخت سے سخت مخلوق نظر آتی ہے وہ یہی پتھر اور پہاڑ ہیں، تشبیہ دیتے ہیں تو پتھر سے دیتے ہیں، کہتے ہیں کہ دل پتھر ہو گیا! اللہ فرماتے ہیں: اگر ہم

اس قرآن کو ایسی سخت مخلوق پر نازل کرتے تو آپ دو باتیں دیکھتے: ﴿لَرَأَيْتَهُ خَاشِعًا﴾: آپ دیکھتے کہ پہاڑ سہم گیا ہے، جب کوئی خوفناک چیز سامنے آتی ہے تو آدمی ڈر جاتا ہے، سہم جاتا ہے، اس کیفیت کا نام خشوع ہے ﴿مُتَصَدِّعًا مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ﴾: اور آپ دیکھتے کہ پہاڑ اللہ کے ڈر سے پھٹ گئے ہیں، ﴿وَتِلْكَ الْأَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ﴾: اور ہم یہ عجیب مضامین بیان کرتے ہیں لوگوں کے فائدے کے لئے، اور اوپر جو مضمون بیان کیا گیا ہے یہ بھی عجیب مضمون ہے اور لوگوں کے فائدے کے لئے بیان کیا ہے ﴿لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ﴾: تاکہ لوگ سوچیں اور غور کریں کہ اللہ نے کیا بیان کیا؟ اللہ نے یہ بیان کیا کہ قرآن کریم جوا تنا پر تاثیر کلام ہے کہ اگر پہاڑ پر اتارا جاتا تو وہ سہم جاتا اور اللہ کے ڈر سے پھٹ جاتا لیکن اگر انسان اس سے فائدہ اٹھانا نہ چاہے تو قرآن بھی اس پر اثر انداز نہیں ہوسکتا، انسان کا دل جب سختی پر آتا ہے تو پتھر بھی اس کے سامنے جھک مارتا ہے، اور جب انسان کا دل متوجہ ہو، وہ اللہ کی نصیحتوں کو قبول کرنا چاہے تو قرآن کی نصیحتیں کارگر ہوں گی اس کے بغیر کارگر نہیں ہوں گی قرآن کریم میں ایک اور جگہ یہی مضمون بیان کیا گیا ہے: ﴿وَلَوْ أَنَّ قُرْآنًا سُيِّرَتْ بِهِ الْجِبَالُ﴾: اگر ہم ایسا قرآن نازل کرتے جس سے پہاڑ چلنے لگتے، آیت پڑھ کر پھونک ماری اور پہاڑ ایک ملک سے دوسرے ملک چلا گیا یا غائب ہوگیا ﴿أَوْ قُطِّعَتْ بِهِ الْأَرْضُ﴾: یا زمین طے ہونے لگے، آیت پڑھی اور امریکہ سے انڈیا دومنٹ میں پہنچ گیا ﴿أَوْ كُلِّمَ بِهِ الْمَوْتٰى﴾: یا قرآن کے ذریعے مردے بات کرنے لگیں، آیت پڑھ کر پھونک ماری مردہ زندہ ہوگیا، اگر ہم ایسا پرتاثیر قرآن نازل کرتے تو بھی یہ کفار نہ مانتے وہ قرآن کی تاثیر تسلیم کرنے کے بجائے کہہ دیتے کہ تم نے ہم پر جادو کردیا ہے، حضرت رکانہ ہجرت سے پہلے جنگل میں جانور چرا رہے تھے، ادھر سے حضور ﷺ کا گزر ہوا، حضور ﷺ نے ان کو جنگل میں دین کی دعوت دی، انہوں نے کہا محمد! تمہاری باتیں میری سمجھ میں نہیں آتیں، میں تو ایک بات جانوں، میں ہوں پہلوان، آپ میرے ساتھ کشتی لڑیں اگر آپ نے مجھے پچھاڑ دیا تو میں آپ کی بات مان لونگا، حضور ﷺ نے فرمایا: چلو یہ بھی کرلو، کشتی ہوئی اور حضورؐ نے آنکھ جھپکتے رکانہ کو چت کردیا، مٹی جھاڑتے ہوئے حضرت رکانہ کہنے لگے: یہ اتفاقا ہوگیا ایک مرتبہ اور موقعہ دو،

دوسری مرتبہ کشتی ہوئی حضورؐ نے پھر چت کردیا، حضرت رکانہ کھڑے ہوئے اور کہنے لگے: محمد! تم نے مجھ پر جادو کردیا، اور ایمان نہیں لائے، پھر ایک وقت آیا کہ اللہ تعالی نے سینہ کھولا، نور ہدایت دل میں اترا پھر وہ ہجرت کے بعد ایمان لائے اور مدینہ آئے، تو جس کو ماننا نہیں وہ ہزار بہانے تلاش کرلیتا ہے قرآن کریم جیسا کلام بھی اس پر اثر انداز نہیں ہوسکتا، لیکن اگر انسان کا دل متوجہ ہو اور وہ نصیحت قبول کرنا چاہے تو اب قرآن اس کے دل پر اثر ڈالے گا ورنہ اوپر سے بادل کی طرح گذر جائے گا، یہ مضمون اللہ تعالی نے پہلے والے مضمون کے بعد جو ذکر کیا ہے اس میں اس جانب اشارہ ہے کہ اگر تمہیں باغ والے بننا ہے، جنت والے بننا ہے آخرت میں کامیاب ہونا ہے تو اس دنیا میں تمہیں قرآن کریم کی رہنمائی کے مطابق زندگی گزارنی ہے، اگر اس کے مطابق زندگی گزاروگے تو کامیاب ہوؤگے اور اگر اس سے ہٹ کر زندگی گزاروگے تو آخرت میں باغ والے نہیں آگ والے بن جاؤگے۔

آج قرآن کریم کا سمجھنا بہت آسان ہوگیا ہے دنیا کی ہر زبان میں اس کا ترجمہ ہوچکا ہے، آپ ترقی یافتہ ملک کے پڑھے لکھے لوگ ہیں، اپنی زندگیوں میں سے ایک حصہ قرآن پڑھنے کے لئے نکالیں، قرآن کے الفاظ صحیح کریں، ناظرہ پڑھیں، تجوید سے پڑھیں، اس کے ترجمہ کو پڑھیں، اس کو سمجھیں، اس میں غور وفکر کریں مگر اپنی عقل کا گھوڑا نہ دوڑائیں، صحابہ کو قرآن سمجھنے کے لئے حضور ﷺ کی رہنمائی کی ضرورت تھی پس کیا ماوشما کو ضرورت نہیں؟ اگر عقل کا گھوڑا دوڑاؤگے تو یہ گھوڑا ٹھوکر کھائے گا اور ایسی ٹھوکر کھائے گا کہ منہ کی کھانی پڑے گی، صحابہ کے زمانہ سے جو تفسیریں چلی آرہی ہیں ان پر اعتماد کرو، ان کا مطالعہ کرو، ذہن بناؤ یہ دنیا کی زندگی آنکھ جھپکنے کے برابر ہے، آج ہے کل نہیں، چلتے چلتے موت آجاتی ہے، سمجھدار وہ ہے جو وقت پر اپنی زندگی سے فائدہ اٹھالے، وقت گزر جانے کے بعد، زندگی بیت جانے کے بعد کف افسوس ملنے سے کوئی فائدہ ہونے والا نہیں اللہ تعالی مجھے بھی اور آپ حضرات کو بھی توفیق عنایت فرمائیں کہ ہم اپنی زندگیوں کی قدر کریں، قرآن کی ہدایت کے مطابق زندگیاں گزاریں اور دنیا میں رہتے ہوئے ہمیں آخرت کا ہوش آجائے آمین یارب العالمین۔

وآخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمين.



نبوت سے انسان کو کیوں سرفراز کیا گیا؟

خطبہ مسنونہ کے بعد: ﴿وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ إِلَّا رِجَالاً نُوْحِیْ إِلَيْهِمْ فَاسْئَلُوْا أَهْلَ الذِّكْرِ إِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ﴾

بزرگو اور بھائیو! یہ قرآنِ کریم کی ایک آیت ہے جو سورۂ نحل میں آئی ہیں، اس آیت میں اللہ عزوجل نے مشرکین کے ایک اعتراض کا جواب دیا ہے۔ آنحضور ﷺ نے جب دعوئ نبوت کیا تو مشرکین نے کہا: آپؐ ہمارے جیسے ایک انسان ہیں، آپؐ میں کیا سُرخاب کا پر لگ رہا ہے جو اللہ نے آپؐ کو نبوت سے سرفراز کیا؟ اللہ کے یہاں فرشتوں کی کمی نہیں اگر اللہ کو رسول بھیجنا تھا تو کسی فرشتہ کو رسول بنا کر بھیجتے، آپ کو ہی رسول بنا کر کیوں بھیجا؟

یہ مشرکین کا ایک اعتراض تھا، قرآنِ کریم میں جگہ جگہ مختلف انداز سے اس اعتراض کا جواب دیا گیا ہے تا کہ انسان کو رسالت کے ساتھ سرفراز کرنے کی وجہ مشرکین کے سمجھ میں آئے، ان آیات میں بھی مشرکین کے اس اعتراض کا جواب دیا گیا ہے اور قرآنِ کریم کا یہ انداز ہے کہ اصل مسئلہ کے ساتھ ضمناً اور بھی مسائل بیان کرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ إِلَّا رِجَالاً نُوْحِیْ إِلَيْهِمْ﴾: اور نہیں بھیجا ہم نے آپ سے پہلے مگر مردوں کو جن کی طرف ہم وحی بھیجتے ہیں، یعنی جب سے نبوت ورسالت کا سلسلہ شروع ہوا ہے ہمیشہ انسان ہی رسول بن کر آئے ہیں، اور مرد ہی رسول بن کر آئے ہیں، نہ کبھی کوئی فرشتہ رسول بن کر آیا اور نہ کبھی کوئی عورت رسول بن کر آئی۔

عورتوں کو بھاری ذمہ داری سے سبکدوش رکھا گیا ہے

کبھی کوئی عورت رسول بن کر نہیں آئی یہ بات ضمناً آئی ہے۔ اور عورتوں کو رسالت سے

سرفراز اس لئے نہیں کیا گیا کہ ان میں نبوت کے ساتھ متصف ہونے کی صلاحیت نہیں، عورت صنف نازک ہے، ناتواں اور کمزور ہے اور نبوت و رسالت کی ذمہ داری بھاری ذمہ داری ہے، اس لئے اللہ نے ان پر کرم فرمایا اور ان کے ناتواں کندھوں پر یہ بھاری ذمہ داری نہیں رکھی، جیسے جہاد عورتوں پر فرض نہیں، کیونکہ جہاد پتہ مار کام ہے، جب میدانِ کارزار گرم ہوتا ہے تو بڑے بڑے سورماؤں کے پتّے پانی ہوتے ہیں، اور کلیجہ منہ کو آتا ہے، غرض جہاد بڑا صبر آزما اور مشکل کام ہے اس لئے اللہ تعالیٰ نے عورتوں پر جہاد فرض نہیں کیا۔

اسی طرح رسالت کا کام بھی بڑا سخت کام ہے، آپ آنحضور ﷺ کی مکی زندگی پڑھیں کن احوال سے آپؐ کو گذرنا پڑا ہے، مدنی دور کی آٹھ سالہ تاریخ فتح مکہ تک کی پڑھیں کوئی رات آپؐ نے چین اور سکون سے نہیں گذاری، اتنا بھاری اور سخت کام عورتوں کے بس کا نہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تاریخ پڑھیں، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تاریخ پڑھیں، حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تاریخ پڑھیں، حضرت نوح علیہ السلام کی تاریخ پڑھیں جو احوال ان حضرات پر گذرے ہیں کیا عورت ان کا تحمل کرسکتی ہے؟ اللہ نے ان پر بڑا اکرم فرمایا، ان کی کمزوری کو ملحوظ رکھ کر ان پر نہ جہاد فرض کیا نہ نبوت کی ذمہ داری ان کو اوڑھائی۔

اہل الذکر سے یہود و نصاریٰ اور مسلمان علماء مراد ہیں

بہرحال یہ مسئلہ ضمناً آیا ہے کہ عورتوں کو نبوت سے سرفراز نہیں کیا گیا، ہمیشہ مردوں ہی کو رسول بنایا گیا، کبھی کوئی فرشتہ رسول بن کر نہیں آیا، یہ مشرکین کے اعتراض کا جواب ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿فَاسْئَلُوْا أَهْلَ الذِّكْرِ إِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ﴾: اگر یہ بات کہ ہمیشہ مرد ہی رسول بن کر آئے ہیں تمہیں معلوم نہ ہو تو اہل الذکر یعنی یہود و نصاریٰ کے علماء سے پوچھو، جزیرۃ العرب میں یہودی بڑی تعداد میں آباد تھے، مدینہ منورہ پورا یہودیوں سے بھرا پڑا تھا، اور نصاریٰ بھی آباد تھے خود مکہ معظّمہ میں عیسائی تھے، ورقہ بن نوفل جن کے پاس حضرت خدیجہ الکبریٰ رضی اللہ عنہا آنحضور ﷺ کو لے گئی تھیں وہ عیسائی تھے، اور انجیل کا عربی میں ترجمہ کر کے لوگوں میں تقسیم کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: یہود و نصاریٰ اہل کتاب

ہیں، ان کے پاس توریت وانجیل کا علم ہے، وہ ان کو پڑھتے ہیں وہ اس حقیقت سے واقف ہیں اگر تم یہ بات کہ ہمیشہ مرد ہی رسول بن کر آئے ہیں نہیں جانتے تو اہل کتاب یہود ونصاری سے پوچھو وہ تمہیں بتائیں گے کہ ہمیشہ مرد ہی رسول بن کر آئے ہیں، کبھی کوئی فرشتہ رسول بن کر نہیں آیا۔

اس آیتِ پاک میں اللہ عز وجل نے یہود ونصاری کو 'اہل کتاب' نہیں کہا، 'اہل الذکر' کہا قرآنِ کریم کے ایک ایک لفظ میں بڑے بڑے مسائل ہوتے ہیں، اگر اللہ تعالیٰ 'اہل الکتاب' فرماتے تو آیت یہود ونصاری کے ساتھ خاص ہو جاتی۔ اللہ تعالیٰ نے اہل الذکر عام لفظ استعمال کیا ہے، پس توریت والے بھی، انجیل والے بھی، زبور والے بھی، حضرت ابراہیم علیہ السلام کے صحیفوں والے بھی، حضرت نوح علیہ السلام کے صحیفوں والے بھی، حتیٰ کہ قرآنِ کریم کے جاننے والے بھی سب اس آیت کا مصداق ہیں، کیونکہ قرآنِ کریم بھی 'الذکر' ہے اور اللہ کی تمام کتابیں جو آسمان سے نازل ہوئی ہیں 'الذکر' ہیں، اس لئے سب آسمانی کتابوں کے جاننے والے آیتِ کریمہ کا مصداق ہیں۔

قرآن وحدیث اور ان سے مستنبط ہونے والے مسائل کی حفاظت کی ذمہ داری بھی اللہ تعالیٰ نے لی ہے

اور سورۂ حجر میں اللہ پاک کا ارشاد ہے: ﴿إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ﴾: ہم نے الذکر یعنی قرآن اتارا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے القرآن کے بجائے الذکر فرمایا جو عام ہے، اگر اللہ تعالیٰ إنا نحن نزلنا القرآن: فرماتے تو آیت خاص ہو جاتی، مگر اللہ نے عام لفظ استعمال کیا ہے، چنانچہ علماء فرماتے ہیں کہ قرآنِ کریم کی حفاظت کی ذمہ داری بھی اللہ نے لی ہے۔ احادیث شریفہ کی حفاظت کی ذمہ داری بھی اللہ نے لی ہے، اور قرآن وحدیث سے جو دین مستنبط ہوتا ہے اس کی حفاظت کی ذمہ داری بھی اللہ نے لی ہے، بلکہ قرآن وحدیث اور فقہ پر عمل کرنے والی جماعت کی حفاظت کی ذمہ داری بھی اللہ نے لی ہے، یہ سب الذکر میں درجہ بدرجہ داخل ہیں۔

ایک جماعت جو ہمیشہ حق پر قائم رہے گی

پہلا درجہ قرآنِ کریم کا ہے، اس کے حرف حرف کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے لی ہے، پھر احادیث شریفہ کا درجہ ہے، لوگوں نے صحیح حدیثوں کے ساتھ غلط حدیثیں ملائیں تو اللہ تعالیٰ نے ایسے رجال کار اور علماء ومحدثین پیدا کئے جنھوں نے چھان پھٹک کر گیہوں الگ کر دیئے اور کنکر الگ کر دیئے، صحیح حدیثوں کو الگ کر دیا اور گھڑی ہوئی حدیثوں کو الگ کر دیا۔ یوں اللہ تعالیٰ نے حدیثوں کی حفاظت فرمائی، اسی طرح قرآن وحدیث سے مستنبط ہونے والے فقہی مسائل کو بھی علماء نے نکھارا، اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: **لاتزال طائفة من أمتی ظاهرين على الحق لايضرهم من خذلهم:** میری امت کا ایک گروہ قیامت تک صحیح دین پر قائم رہے گا، اللہ اس کی حفاظت فرمائیں گے۔ قیامت تک کوئی وقت ایسا نہیں آئے گا کہ اہل حق ختم ہو جائیں، تمام مسلمان گمراہ ہو جائیں، کوئی بھی حق پر باقی نہ رہے، ایسا وقت قیامت تک نہیں آئے گا، اللہ تعالیٰ اہل حق کی حفاظت فرمائیں گے، اور صحیح دین پر عمل کرنے والے ہمیشہ موجود رہیں گے، خواہ وہ مٹھی بھر کیوں نہ ہوں، کسی کی مخالفت ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکے گی، وہ حق پر ثابت قدم رہیں گے۔

بہر حال اللہ تعالیٰ نے الذکر کی حفاظت کی ذمہ داری لی ہے۔ اور الذکر: القرآن سے عام ہے، اس میں قرآن، حدیث، فقہ اور ان پر عمل کرنے والی امت سب داخل ہیں، لہٰذا قرآن کے محافظ بھی اللہ ہیں، حدیثوں کے محافظ بھی اللہ ہیں، فقہ کے محافظ بھی اللہ ہیں، اور ان پر عمل کرنے والی جماعت کے محافظ بھی اللہ ہیں، اور یہ سب آیتِ کریمہ کا درجہ بدرجہ مصداق ہیں، اور آیتِ کریمہ کا یہ مطلب نہیں ہے کہ دنیا میں سبھی مسلمان ہمیشہ حق پر رہیں گے، کوئی گمراہ نہیں ہوگا، بلکہ اہل حق بھی رہیں گے اور اہل باطل بھی، اور اہل حق دلائل سے غالب رہیں گے، ان کو کوئی زیر نہیں کر سکے گا۔

دینی مسائل جاننا اور نہ جانتے ہوں تو پوچھنا فرض ہے

اور اس آیتِ کریمہ سے یہ مسئلہ بھی نکلا کہ اگر کوئی دین کی کوئی بات نہیں جانتا تو علماء کرام

سے پوچھنا فرض ہے، بعض لوگ مسئلہ جانتے نہیں اور کسی عالم سے پوچھتے بھی نہیں، اس لئے عمل بھی نہیں کرتے، وہ اس خام خیالی میں مبتلا ہیں کہ قیامت میں اللہ سے کہہ دیں گے کہ پروردگار! ہمیں پتا نہیں تھا، اس لئے ہم نے عمل نہیں کیا، یہ عذر چلنے والا نہیں، دنیوی ضرورت کی چیزیں سب جانتے ہیں اور جاننے کے لئے محنتیں کرتے ہیں، پھر علماء سے پوچھ کر دین پر عمل کیوں نہیں کرتے؟ اس لئے یہ عذر چلنے والا نہیں۔ ہر شخص پر فرض ہے کہ وہ دین کا علم رکھنے والے علماء سے ضروری باتیں دریافت کرے، لوگ ان سے مسائل سیکھیں، پھر ان پر عمل کریں۔

دین سکھانا علماء پر فرض ہے

اور علماء کا بھی فریضہ ہے کہ محنت کریں، لوگوں کو دین پہنچائیں۔ انہیں مسائل بتلائیں۔ نبی پاک ﷺ کا ارشاد ہے: بلّغوا عنی ولو آیۃ: اس حدیث میں علماء پر یہ ذمہ داری ڈالی گئی ہے کہ اگر انہیں ایک بھی حکم شرعی معلوم ہے تو اسے دوسروں تک پہنچائیں، پس ذمہ داری دوطرفہ ہے، ایسا نہیں کہ علماء پر کوئی ذمہ داری نہیں، ساری ذمہ داری لوگوں کی ہے کہ پوچھیں، بلکہ علماء کی بھی ذمہ داری ہے کہ لوگوں کو دین پہنچائیں، انہیں اللہ ورسول کی مرضیات سے واقف کریں اور لوگوں کی ذمہ داری ہے کہ اپنی ضرورت کی باتیں علماء سے پوچھیں، ظاہر ہے میں تقریر میں وہی باتیں بیان کروں گا جو میرے خیال میں آپ لوگوں کے لئے ضروری ہیں، اور ہوسکتا ہے کہ بعض لوگوں کی ایسی ضروریات ہوں جو میرے ذہن میں نہ آئیں اور میں ان کو بیان نہ کروں، تو ان کو اپنی ضرورتیں کیسے معلوم ہونگی؟ اس کا صرف ایک راستہ ہے کہ پوچھیں، جب دونوں اپنی اپنی ذمہ داریاں ادا کریں گے تو ہر شخص کو دین سے واقفیت ہوگی اور دین پھیلے گا۔

سوال پانچ مقاصد سے کیا جاتا ہے

میرے بھائیو! لوگ پوچھتے ہیں اور خوب پوچھتے ہیں، مگر پانچ مقاصد سے پوچھتے ہیں، ان میں سے چار مقاصد غلط ہیں اور ایک مقصد صحیح ہے، وہ ایک مقصد جو صحیح ہے اگر اس مقصد

سے پوچھا جائے تو سوال کرنا بھی مفید ہے اور جواب دینا بھی مفید ہے، باقی چار مقاصد سے پوچھا جائے تو پوچھنا بھی بیکار ہے اور میرا بیان کرنا بھی لاحاصل ہے۔

۱-مبلغ علم جاننے کے لئے سوال کرنا

بعض لوگ مبلغ علم جاننے کے لئے سوال کرتے ہیں، وہ جاننا چاہتے ہیں کہ مولانا صاحب کتنے پانی میں ہیں، ان لوگوں کے پاس دو چار سوال ہوتے ہیں جو بھی نیا مولوی آتا ہے اس سے وہی سوال کرتے ہیں، ان کا مقصد دین جاننا نہیں، وہ اس کو پہلے سے جانتے ہیں بلکہ عالم صاحب کا امتحان کرنا مقصود ہے۔ ہندوستان میں دیہاتوں میں بعض بوڑھے بالکل ان پڑھ ہوتے ہیں، لیکن بزرگوں کے صحبت یافتہ ہوتے ہیں، انہیں مسائل کی جانکاری ہوتی ہے، اس لئے گاؤں میں جو بھی مولوی آتا ہے، اس سے وہی مسائل پوچھتے ہیں اس مقصد سے سوال وجواب بیکار اور لاحاصل ہیں۔

۲-ذہنی عیاشی کے لئے سوال کرنا

سوال کرنے کا دوسرا مقصد ذہنی عیاشی ہے یعنی ایسا سوال کرنا جس کا کوئی فائدہ نہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کنویں پر بلانے کے لئے جو لڑکی آئی تھی، وہ چھوٹی تھی یا بڑی؟ یہ بیکار سوال ہے، چھوٹی تھی تو کیا؟ بڑی تھی تو کیا؟ اصحابِ کہف جو کتا ساتھ لے گئے تھے وہ کالا تھا یا بھورا؟ حضرت سلیمان علیہ السلام نے جس چیونٹی سے بات کی تھی وہ مذکر تھی یا مؤنث؟ یہ بیکار سوالات ہیں، بعض لوگ ایسے ہی سوال کرتے ہیں، ان کا مقصد محض ذہنی عیاشی ہوتا ہے۔ ایسے فضول سوالات نہیں کرنے چاہئیں۔

۳-گنجائش تلاش کرنے کے لئے سوال کرنا

اور بعض لوگوں کا مقصد سوال سے گنجائش تلاش کرنا ہوتا ہے، مسئلہ پوچھتے ہیں، خواہش کے مطابق جواب ملا تو ٹھیک ہے، ورنہ دوسرے مفتی سے پوچھیں گے، شاید کوئی گنجائش والی بات بتادے۔ میرے بھائیو! یہ دین پر عمل نہیں، خواہش پر عمل ہے۔

بات سمجھ میں نہ آئے تو دوبارہ پوچھے

ایک صاحب نے مجھ سے فون پر پوچھا کہ ایک شخص ایک مسئلہ کسی عالم سے یا مفتی سے پوچھ چکا ہے، اب وہ اس مسئلہ کو دوسرے مفتی یا عالم سے پوچھ سکتا ہے؟ میں نے کہا: دوسرے مفتی سے کیوں پوچھنا چاہتا ہے؟ اس نے کوئی جواب نہیں دیا، میں نے کہا: اس کی دو صورتیں ہیں: ایک: پہلے مفتی نے یا عالم نے جو مسئلہ بتایا ہے اس میں کچھ تردد ہے، کیونکہ اس نے اس کے خلاف پڑھا ہے یا سنا ہے تو اس کو مفتی صاحب کی بات پر فوراً عمل نہیں کرنا چاہئے، بلکہ مزید تحقیق کرنی چاہئے۔ اور بہتر یہ ہے کہ پہلے ہی مفتی سے دوبارہ مسئلہ پوچھے اور جو اشکال ہو ان کے سامنے رکھے کہ میں نے فلاں کتاب میں یا فلاں حدیث میں اس طرح پڑھا ہے۔ اور اگر مفتی صاحب مسافر تھے اور چلے گئے تو دوسرے مفتی سے پوچھے اور اس کے سامنے دونوں باتیں رکھے کہ فلاں صاحب سے میں نے یہ مسئلہ پوچھا تھا انھوں نے یہ جواب دیا مگر میں نے فلاں کتاب میں یہ پڑھا ہے، پھر مفتی صاحب تحقیق کے بعد جو مسئلہ بتائیں اس پر عمل کرے۔

مسائل کی تحقیق کرنا اللہ کے نیک بندوں کی صفت ہے

سورۃ الفرقان میں اللہ پاک کا ارشاد ہے: ﴿وَالَّذِيْنَ إِذَا ذُكِّرُوْا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَعُمْيَانًا﴾: اللہ کے پیارے بندوں کی ایک صفت یہ ہے جب ان کو اللہ کی آیتوں کے ذریعہ نصیحت کی جاتی ہے تو وہ ان پر اندھے بہرے ہو کر نہیں گرتے، بلکہ جو دینی مسائل ان کو بتائے جاتے ہیں ان کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں، سمجھنے کے بعد مطمئن ہو کر ان پر عمل کرتے ہیں، پس اگر پوچھے ہوئے مسئلہ میں کوئی الجھن یا شک ہو تو اسے ضرور دوبارہ پوچھنا چاہئے۔

اور کبھی گنجائش تلاش کرنے کے لئے دوسرے مفتی سے مسئلہ پوچھتا ہے، پہلے مفتی نے ناجائز کہا ہے اس لئے دوسرے سے پوچھتا ہے کہ شاید وہ جائز کہہ دے اور کام بن جائے، اس نیت سے دوسرے سے پوچھنے کی اجازت نہیں۔

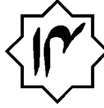
جب میں نے یہ بات کہی تو انھوں نے فون رکھ دیا، میں یہ واقعہ سنا کر آپ کو یہ سمجھانا چاہتا ہوں کہ اگر آپ نے ایک مرتبہ مسئلہ پوچھ لیا ہے پھر کسی وجہ سے مفتی صاحب کے بتائے ہوئے مسئلہ میں آپ کو کچھ تردد ہے تو ایک مرتبہ نہیں دس مرتبہ تحقیق کرو، آپ کو شریعت مطہرہ نے یہ حق دیا ہے، بلکہ اللہ کے محبوب بندوں کی یہ ایک خوبی ہے مگر چور دروازہ تلاش کرنا، گنجائش کی راہیں ڈھونڈھنا مؤمن کامل کا مزاج نہیں ہونا چاہئے، اللہ کے نیک بندوں کا مزاج تو یہ ہونا چاہے کہ وہ اللہ کا جو بھی حکم ہو اس پر عمل کرے، اور نفسانی خواہشات کے پیچھے نہ پڑے۔

۴- دوسروں کی خاطر مسئلہ پوچھنا

اور بعض لوگ اس لئے مسئلہ پوچھتے ہیں کہ دوسروں کو مسئلہ معلوم ہو جائے یعنی انہیں مسئلہ نہیں جاننا، وہ تو پہلے سے جانتے ہیں۔ میرے بھائیو! اس مقصد سے پوچھنا برا نہیں، مگر اچھا بھی نہیں، تم نے دوسروں کی ذمہ داری کیوں لی؟ ہر شخص کو اپنے فائدہ کے لئے پوچھنا چاہئے، دوسروں کے فائدے کے لئے پوچھنا کوئی اچھا مقصد نہیں، صحابہ کرام آنحضور ﷺ سے سوال کرتے تھے تو ہر صحابی اپنی ذات کو پیش نظر رکھ کر سوال کرتا تھا، پھر حضور اکرم ﷺ جو جواب دیتے تھے اس کا فائدہ سب کو پہنچتا تھا، لیکن پوچھنے والے کے پیش نظر یہ نہیں ہوتا تھا کہ حضور ﷺ جواب دیں اس کا فائدہ دوسروں کو پہنچے، اس مقصد کے لئے کبھی کسی صحابی نے سوال نہیں کیا، لیکن اگر کوئی کرے تو میں اس کو برا نہیں کہتا، اس لئے میں نے کہا کہ اس مقصد سے سوال کرنا نہ اچھا ہے نہ برا۔ غرض ان چار مقاصد سے سوال کرنا ٹھیک نہیں۔

۵- دین سیکھنے کے لئے سوال کرنا

اور ایک پانچواں مقصد ہے جو اس آیتِ کریمہ میں ہے: ﴿فَاسْئَلُوْا أَهْلَ الذِّكْرِ إِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ﴾: علم رکھنے والوں سے پوچھو، اگر تمہیں معلوم نہ ہو، پوچھ کر دین سیکھو اس پر عمل کرو، دین جاننے کی نیت سے اور عمل کی نیت سے پوچھنا بہترین مقصد ہے، اس آیتِ کریمہ میں اسی کا تذکرہ ہے (اس کے بعد سوالات کے پرچوں کے جوابات دیئے ہیں جو دوسری جگہ لئے جائیں گے)



کامیابی ہدایت کی پیروی میں مضمر ہے

خطبہ مسنونہ کے بعد ﴿مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِنْ ذَكَرٍ أَوْ أُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهُ حَيَاةً طَيِّبَةً، وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ أَجْرَهُمْ بِأَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ﴾

معزز خواتین! اللہ جل شانہ نے قرآنِ پاک کی اس آیت میں جو میں نے خطبہ میں پڑھی ہے، ایک ایسا مضمون بیان فرمایا ہے جو ہم سب کے لئے مردوں کے لئے بھی اور عورتوں کے لئے بھی بڑا قیمتی اور ضروری ہے، اس لئے خوب دھیان سے اس مضمون کو سمجھنا چاہئے، اور اللہ پاک نے جو ہدایت دی ہے اس کے مطابق اپنی زندگی بنانی چاہئے، اسی میں ہماری پریشانی کا حل ہے۔

آج دنیا میں ہر شخص پریشان ہے، الجھنوں اور افکار میں گھرا ہوا ہے، ایسے بندے بہت کم ہیں جو سکون و اطمینان کا سانس لے رہے ہوں، جو مطمئن ہوں، خوش ہوں، شاداں و فرحاں ہوں ایسے بندے بہت کم ہیں، زیادہ تر لوگ پریشان ہیں اور سکون و راحت کے متلاشی ہیں، اس آیتِ کریمہ میں پریشانی کا حل بیان کیا گیا ہے، انسان کو ستھری، پاکیزہ اور امن و اطمینان والی زندگی کس طرح میسر آسکتی ہے؟ کیا طریقۂ زندگی اختیار کیا جائے جس سے سکون والی زندگی نصیب ہو؟ اس لئے اس مضمون کو اچھی طرح سمجھ لینا ضروری ہے۔

رنج و راحت ساتھ ساتھ

اللہ جل شانہ نے اس دنیا میں رنج و راحت ساتھ ساتھ پیدا کئے ہیں۔ اور آگے مرنے کے بعد جو زندگی آرہی ہے، آخرت کی زندگی، وہاں دونوں الگ الگ کردیئے جائیں گے، امن و اطمینان کی جگہ جنت ہے اور رنج و غم، تکلیفوں اور مصیبتوں کی جگہ جہنم ہے، جنت میں

کوئی پریشانی نہیں، اور جہنم میں کوئی آرام نہیں، آخرت میں یہ دونوں چیزیں الگ الگ کردی جائیں گی مگر اس دنیا میں یہ دونوں چیزیں ساتھ ساتھ ہیں۔

اس کو ایک مثال سے سمجھیں: جب کھیت میں اناج بوتے ہیں تو شروع سے آخر تک غلہ اور گھاس رلے ملے رہتے ہیں، مثلاً گیہوں بویا تو شروع میں جو پودے نکلتے ہیں وہ محض گھاس ہوتے ہیں، وہ انسان کے کھانے کی چیز نہیں، پھر ایک خاص مقدار تک بڑھ جانے کے بعد ان پودوں پر بالیاں نکلتی ہیں، یہ بھی گھاس ہے، یہ بالیاں بھی انسان کے کھانے کی چیز نہیں، پھر ان بالیوں میں دانے پیدا ہوتے ہیں، یہ انسان کے کام کی چیز ہے، مگر ابھی وہ چارے کے ساتھ رلے ملے ہیں، پھر ایک وقت کے بعد گیہوں پک جاتا ہے پھر اس کو کاٹ لیا جاتا ہے، پھر کچھ دن یونہی چھوڑ دیا جاتا ہے، گیہوں سوکھتے ہیں، پھر اسے گاہا جاتا ہے، پھر برسایا جاتا ہے تو دانہ ایک طرف ہو جاتا ہے اور بھوس الگ ہو جاتا ہے، اسی طرح اس دنیا میں اچھی بندیاں اور کافر عورتیں رلی ملی ہیں، مگر مقصود کائنات مؤمن عورتیں ہیں، قیامت کے دن ان کو الگ کر لیا جائے اور بھوس کو جدا کر لیا جائے گا ﴿امْتَازُوْا الْيَوْمَ أَيُّهَا الْمُجْرِمُوْنَ﴾: اے بدکارو! آج مؤمنین سے الگ ہو جاؤ، پھر مؤمن عورتیں جنت میں جائیں گی اور دوسری عورتیں جہنم رسید ہونگی۔

غرض: اس دنیا میں خیر وشر، رنج وراحت ایمان وکفر اچھے برے اعمال رلے ملے ہیں، پھر مرنے کے بعد سیدھا آخرت میں نہیں جانا درمیان میں عالم برزخ اور عالم قبر ہے، پہلے انسان وہاں جاتا ہے، اور وہاں انسان کو اس قابل بنایا جاتا ہے کہ آخرت میں منتقل کیا جاسکے، اور وہاں کے رنج وراحت اور خوشی وغمی کو سہار سکے، پھر جب آدمی آخرت میں منتقل ہوگا تو کفر الگ کر دیا جائے گا اور ایمان الگ، مؤمنین کو الگ کر دیا جائے گا اور مشرکین کو الگ، اور میدانِ محشر میں اعلان ہوگا: ﴿وَامْتَازُوْا الْيَوْمَ أَيُّهَا الْمُجْرِمُوْنَ﴾: اے برے لوگو! ایک طرف ہو جاؤ، صالحین سے علاحدہ ہو جاؤ، قیامت کے دن سب چیزیں ایک دوسرے سے جدا ہو جاتی ہیں، اور راحتوں کی جگہ جنت ہے اور رنج کی جگہ جہنم، مگر اس دنیا میں دونوں چیزیں ساتھ ساتھ ہیں، یہ دنیا راحتوں کی جگہ بھی ہے اور رنج کی جگہ بھی۔ جب دونوں چیزیں

ساتھ ساتھ ہیں تو راحت کی زندگی حاصل کرنے کے لئے وہ طریقہ اختیار کرنا پڑے گا جو اللہ نے مقرر کیا ہے، اگر اللہ کا مقرر کیا ہوا طریقہ نہیں اپنائے گا تو مشقت کی زندگی گذارنی ہوگی، رنج وغم، الجھنیں اور پریشانیاں اس کے حصہ میں آئیں گی۔

جو ہدایت کی اتباع کرے گا وہ گمراہ اور پریشان نہیں ہوگا

قرآنِ کریم میں سولہویں پارے کے آخر سے دوسرے رکوع میں حضرت آدم علیہ السلام کا واقعہ بیان کیا گیا ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت حواء رضی اللہ عنہا کو اسی زمین پر پیدا کیا گیا، پھر دونوں کو جنت میں بسایا گیا، اور دونوں سے کہا گیا: جہاں چاہو جنت میں رہو، جو چاہو کھاؤ، اور مزے کرو، یہاں کوئی پریشانی نہیں، نہ بھوک ہے نہ پیاس، نہ سردی ہے نہ گرمی، نہ الجھن ہے نہ فکر، نہ غم ہے نہ رنج، راحتیں ہی راحتیں ہیں۔ البتہ یہ ایک درخت ہے اس کے قریب مت جانا، ورنہ جنت میں نہیں رہ سکو گے، جنت سے نکلنا پڑے گا، دنیا میں جانا پڑے گا اور وہاں کی پریشانیوں سے دوچار ہونا پڑے گا۔ پھر ایک وقت کے بعد دونوں نے شیطان کے بہکانے سے وہ شجرِ ممنوع کھالیا۔

بعض لوگ پوچھتے ہیں: وہ درخت کونسا تھا، جس کے کھانے کی ممانعت تھی؟ جواب یہ ہے کہ ہمیں معلوم نہیں کہ وہ کونسا درخت تھا، اس لئے کہ قرآن میں اس کی کوئی صراحت نہیں کہ وہ کونسا درخت تھا۔ احادیث میں بھی وضاحت نہیں، اور قرآن وحدیث ہی سے ہم کوئی یقینی بات کہہ سکتے ہیں ان کے علاوہ یقینی بات جاننے کی کوئی صورت نہیں، اس لئے کہ یہ اس دنیا کی بات نہیں ہے، آخرت کی بات ہے، اور دوسری دنیا کی تفصیلات انسان اپنی عقل سے نہیں جان سکتا، قرآن وحدیث میں جتنی باتیں بیان کی گئی ہیں بس اتنی ہی باتیں ہم جان سکتے ہیں۔

اور لوگوں میں جو مشہور ہے کہ وہ گیہوں کا درخت تھا اس کی کوئی اصل نہیں، بلکہ قرآنِ کریم میں جو لفظ آیا ہے اس سے یہ بات غلط معلوم ہوتی ہے، قرآن میں لفظ شجرۃ آیا ہے، اور شجرۃ کے معنی ہیں: درخت۔ اور گیہوں کا پودا ہوتا ہے درخت نہیں ہوتا، اس لئے گیہوں والی بات بے پر کی کسی نے اڑائی ہے، اور بعض روایتوں میں ہے کہ وہ زیتون کا درخت تھا،

جس کے کھانے سے اللہ نے روکا تھا۔ واللہ اعلم

جب وہ درخت حضرت آدم وحواء نے کھالیا تو اللہ کا حکم پہنچا کہ زمین پر اترو، وہاں جا کر بسو، اب جنت میں نہیں رہ سکتے، اور قیامت تک تمہاری نسل وہیں رہے گی، اور میں پیچھے سے اپنی ہدایت بھیجوں گا، جو میری ہدایت کی پیروی کرے گا وہ نہ گمراہ ہوگا نہ مشقت میں پڑے گا ﴿فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُمْ مِنِّىْ هُدًى فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَاىَ فَلاَ يَضِلُّ وَلاَ يَشْقَى﴾ گمراہ: اردو کا لفظ ہے اور یہ دو لفظ ہیں: گم اور راہ، راہ کے معنی ہیں: راستہ، پس گمراہ کے معنی ہیں: راستہ گم کرنے والا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: جو میری ہدایت کی پیروی کرے گا وہ گمراہ نہیں ہوگا، راستہ نہیں بھولے گا یعنی جنت تمہارا اصلی وطن ہے، دوبارہ تمہیں اور تمہاری ذریت کو یہیں آنا ہے، مگر اب ایک خاص راستہ پر چل کر یہاں آنا ہے، وہ ہدایت میں بھیجوں گا، میرے بتائے ہوئے راستہ پر جو چلے گا وہ اپنے اصل وطن میں آئے گا، گمراہ نہیں ہوگا راستہ نہیں بھولے گا، سیدھا جنت میں آئے گا، اور جتنے دن دنیا میں رہے گا، راحت وآرام سے رہے گا، مشقت وتکلیف سے دوچار نہیں ہوگا۔

پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَمَنْ أَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِىْ فَإِنَّ لَهُ مَعِيْشَةً ضَنْكًا﴾: اور جو میری ہدایت سے روگردانی کرے گا، میری ہدایت کی اتباع نہیں کرے گا اس کے لئے تنگ گذران ہوگا، یعنی وہ دنیا میں پریشان پریشان رہے گا ﴿وَنَحْشُرُهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ أَعْمٰى﴾ اور ہم قیامت کے دن اس کو اندھا اٹھائیں گے، ظاہر ہے جب اندھا ہوگا تو جنت کی راہ کہاں سے پائے گا، ہدایت سے اعراض کرنے والے کو نہ جنت ملے گی اور نہ دنیا میں راحت وسکون کی زندگی حاصل ہوگی۔

ایمان کے ساتھ ہدایت کی پیروی ضروری ہے

میری بہنو! یہ جو میں نے مضمون بیان کیا ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ اللہ کے بھیجے ہوئے دین کا اتباع ضروری ہے، صرف مان لینا کافی نہیں، جیسے ہم ڈاکٹر کے یہاں سے دوا لائیں اور مان لیں کہ یہ بخار کی بہترین دواء ہے، اور اس پر دلائل بھی قائم کردیں مگر دواء الماری میں

رکھ دیں تو چاہے وہ کتنی ہی مفید دواء ہو اس سے بخار نہیں اترے گا۔ بخار اس دوا کو پینے سے جائے گا، دوا پینے کے بعد ہی راحت ملے گی، اسی طرح محض ہدایت کو مان لینے سے فائدہ نہیں ہوگا، پورا فائدہ اس ہدایت کی اتباع اور پیروی سے ہوگا۔

بعض عورتیں اور کچھ مرد ایسا سوچتے ہیں کہ ہم مسلمان ہیں پھر پریشان کیوں ہیں؟ ایسا مرد زیادہ سوچتے ہیں، عورتیں کم سوچتی ہیں، کیونکہ عورتوں کے مزاج میں اللہ نے سادگی رکھی ہے، نبی پاک ﷺ کا ارشاد ہے: **علیکم بدین العجائز**: بوڑھی عورتوں کا دین مضبوط پکڑو، بوڑھی عورت زیادہ گہرائی میں نہیں اترتی، وہ موٹی موٹی باتیں جانتی ہے اور ان پر عمل کرتی ہے، وہ دین پر مضبوط جمی رہتی ہے، زیادہ کھود کرید نہیں کرتی۔ اِدھر اُدھر ذہن کو نہیں دوڑاتی، ہر بات میں سوال کرنا کہ ایسا کیوں ہے؟ یہ کوئی اچھی بات نہیں۔ یہ پریشان کرنے والا مزاج ہے، اور یہ بات مردوں کو زیادہ پیش آتی ہے، عورتیں اس میں زیادہ دلچسپی نہیں لیتیں، یہ اللہ کا عورتوں پر خاص فضل ہے، مگر بہر حال کچھ عورتیں اور بہت سے مرد ایسا سوچتے ہیں کہ ہم مسلمان ہیں پھر پریشان کیوں ہیں؟

ہدایت اپنا کر ہی راحت ملے گی

میں اسی کا جواب دے رہا ہوں کہ بیشک ہم مسلمان ہیں اور مسلمان ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ہمیں یقین ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اور اس کے پاک حبیب ﷺ نے قرآن وحدیث میں زندگی گذارنے کا جو طریقہ بتایا ہے وہ نہایت شاندار طریقۂ زندگی ہے یہ ہمارا یقین اور عقیدہ ہے، لیکن میری بہنو! یہ طریقہ تو قرآن میں ہے اور قرآن ہماری الماری میں ہے، ہماری زندگیوں میں قرآن نہیں ہے، جب تک وہ قرآن ہماری زندگیوں میں نہ آئے ہمیں راحت وآرام نہیں مل سکتا ہم یہ مانتے تو ہیں کہ قرآنِ کریم میں جینے کا جو طریقہ بتایا گیا ہے وہ سب سے زیادہ پرسکون اور اطمینان والا طریقہ ہے، مگر اس کے مطابق ہم نے اپنی زندگی ڈھالی نہیں، اس لئے خوب اچھی طرح یہ بات سمجھ لینی چاہئے کہ اللہ نے جو زندگی گذارنے کا طریقہ بتایا ہے اگر انسان اس طریقہ کے مطابق زندگی گذارے گا تو ہی پریشانیوں

سے نجات ملے گی، ہر حال میں انسان خوش رہے گا، بیماری میں بھی خوش رہے گا، تندرستی میں بھی خوش رہے گا، مالداری میں بھی خوش رہے گا، غریبی میں بھی خوش رہے گا، اور یہ خوش حال زندگی اس وقت میسر آئے گی جب ہماری زندگی اسلام کے مطابق ہوگی۔

اللہ جل شانہ نے اس آیت پاک میں یہی مضمون بیان فرمایا ہے: ﴿مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِنْ ذَكَرٍ أَوْ أُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ﴾: جو بھی نیک کام کرے، نیک کام کرنے والا خواہ مرد ہو یا عورت، درانحالیکہ وہ ایمان والا ہو، ایمان کے ساتھ اس نے نیک کام کیا ہو، تو ہم ضرور اسے پاکیزہ زندگی عطا فرمائیں گے اور دنیا کی زندگی میں انھوں نے جو بہترین کام کیئے ہیں ہم آخرت میں ان کا بہترین بدلہ دیں گے، کوتاہیاں نیک صالح بندوں سے بھی ہو جاتی ہیں، مردوں سے بھی اور عورتوں سے بھی ان کوتاہیوں سے اللہ درگذر فرمائیں گے، ان کو معاف فرمادیں گے اور نیک کاموں کا بہترین بدلہ عطا فرمائیں گے۔

اس آیت پاک میں اللہ تعالیٰ نے دنیا کا بھی حال بیان کیا ہے اور آخرت کا بھی، ایمان والوں کو جو نیک کام کریں گے دنیا میں پاکیزہ زندگی ملے گی، صاف ستھری زندگی ملے گی، امن واطمینان والی زندگی ملے گی، مردوں کو بھی اور عورتوں کو بھی، اور آخرت میں نیک کاموں کا بہترین بدلہ ملے گا، خلاصہ یہ ہے کہ دنیا میں اطمینان والی زندگی ان مردوں اور عورتوں کے لئے ہے جن کے پاس ایمان کی دولت ہے اور جو ایمان کے ساتھ نیک کام کرتے ہیں۔

ایمان کیا ہے؟

ایمان مفصل یہ ہے: آمنتُ باللہ، وملائکته، وکتبه، ورسله، والیوم الآخر، والبعث بعد الموت، والقدر خیره وشره من اللہ تعالیٰ: ان سات باتوں کو دل سے ماننے کا نام ایمان ہے، ہر ایک کی تفصیل درج ذیل ہے:

۱- اللہ کو ماننا، یعنی یہ ماننا کہ اس جہاں کو پیدا کرنے والا ایک خدا ہے، تنہا اسی ایک ذات نے کائنات کا یہ پورا نظام پیدا کیا ہے، یہ دنیا خود بخود پیدا نہیں ہوئی، دنیا میں بہت سے لوگ ہیں اور آپ کے امریکہ میں ان کی تعداد بہت زیادہ ہے وہ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ دنیا خود بخود پیدا

ہوگئی ہے، اور خود بخود چل رہی ہے، نہ اس کا پیدا کرنے والا کوئی ہے اور نہ چلانے والا۔ ڈارون جو برطانیہ کا ایک فلسفی ہے کہتا ہے کہ انسان پہلے بندر تھا، پھر انسان بن گیا، کافروں نے واہ واہ کی کہ کتنی شاندار بات کہی، حالانکہ اس نے مہمل اور بے عقلی کی بات کہی، کیونکہ بندر تو آج بھی دنیا میں ہیں، وہ انسان کیوں نہیں بن رہے؟ دراصل یہ بات اس لئے کہنی پڑی ہے کہ اللہ کو جو خالق و مالک اور سب کا پالنہار ہے اس کو نہ ماننا پڑے، اس نے سوچا نہیں کہ انسان بندر سے بنا تو بندر کہاں سے بنا؟ بات مٹی تک جائے گی تو اب سوال ہوگا کہ مٹی کس نے بنائی؟ پھر بات خالق و مالک پر جاکر رکے گی، پس پہلے ہی کیوں نہ مان لیا جائے کہ یہ کائنات اللہ نے پیدا کی ہے۔

غرض ہمیں یہ یقین رکھنا چاہئے کہ اس کائنات کو اللہ نے بنایا ہے، یہ خود بخود نہیں بن گئی، اور ہمیں بھی اللہ نے پیدا کیا ہے، پھر پیدا کرنے کے بعد ہماری زندگی کا سامان کیا ہے، ہمیں جینے کا سلیقہ سکھلایا ہے، ہماری ضرورتیں پوری کی ہیں، پس ہم ہی پر نہیں تمام مخلوقات پر لازم ہے کہ صرف ایک اللہ کی پوجا کریں، اسی کی بندگی کریں، اللہ کے علاوہ کسی کی بھی عبادت نہ کریں، اللہ کے علاوہ کی عبادت کرنا اس کو پکارنا ہے اس سے مدد مانگنا ہے، اور اللہ کے ساتھ شریک ٹھہرانا ہے، اللہ وحدہ لاشریک لہ ہیں نہ ان کا کوئی شریک ہے، نہ ان کی کوئی ماں ہے نہ باپ، انہیں کسی نے نہیں جنا اور نہ انھوں نے کسی کو جنا ہے، وہ بے نیاز ہیں، ان کے برابر کوئی نہیں، وہ اکیلی ہستی ہیں، اس طرح اللہ کو ماننا ضروری ہے اور یہ سات چیزوں میں سے ایک چیز ہے، جن پر ایمان لانا ضروری ہے۔

میری بہنو! غور کرو دنیا میں کچھ لوگ تو سرے سے اللہ کو نہیں مانتے اور کچھ لوگ اللہ کو مانتے ہیں مگر اس کے ساتھ اور بھی خدا مانتے ہیں، جیسے آپ کے اس ملک میں عیسائی اللہ کو مانتے ہیں مگر اللہ کے ساتھ دو اور خدا بھی مانتے ہیں وہ کہتے ہیں: تینوں مل کر ایک خدا ہیں، ہندوستان کے ہندو بھی اللہ کو مانتے ہیں، وہ اللہ کو پرمیشور، ایشور اور بھگوان کے نام سے پکارتے ہیں مگر ساتھ میں ہزاروں خدا اور بھی مانتے ہیں، اور مجوسی بھی دو خدا مانتے ہیں۔

میری بہنو! کسی کے ساتھ خدائی والا برتاؤ کرنا بھی اس کو خدا ماننا ہے، اور اس کو اللہ کا

شریک ٹھہرانا ہے، جیسے عیسائی اللہ کو مانتے ہیں مگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کی ماں حضرت مریم رضی اللہ عنہا کے ساتھ بھی خدا والا معاملہ کرتے ہیں، ان سے اپنی ضرورتیں مانگتے ہیں، ان کی عبادت کرتے ہیں، یہ ان کو اللہ کے ساتھ شریک ٹھہرانا ہے، بعض مسلمان قبروں کا طواف کرتے ہیں، بزرگوں کی نذر و نیاز مانتے ہیں، قبروں پر چڑھاوا چڑھاتے ہیں، ان سے اپنی ضرورتیں مانگتے ہیں، یہ سب شرک ہے، اللہ کی مخلوق میں سے کسی کے ساتھ بھی خدائی والا برتاؤ کرنا اس کو اللہ کا شریک ٹھہرانا ہے جو گناہ عظیم ہے۔

اللہ کے علاوہ کو سجدہ کرنا حرام ہے

ایک صحابی ہیں ان کا نام قیس بن سعد ہے وہ شام گئے، وہاں انھوں نے دیکھا کہ لوگ اپنے مرزبان کو سجدہ کرتے ہیں، حضرت قیسؓ نے سوچا: اس مرزبان کی تو کوئی حیثیت نہیں، ہمارے حضور تو اللہ کے حبیب ہیں، خلاصۂ کائنات ہیں، سجدہ کے حقیقت میں وہی مستحق ہیں، جب یہ لوگ اپنے مرزبان کو سجدہ کرتے ہیں، اپنے بادشاہ کو سجدہ کرتے ہیں تو ہمیں بھی سید الاولین والآخرین کو سجدہ کرنا چاہئے، سب سے بڑے بادشاہ تو وہ ہیں۔ چنانچہ جب وہ مدینہ منورہ واپس آئے تو آنحضور ﷺ سے عرض کیا: یارسول اللہ! میں نے شام میں دیکھا وہ لوگ اپنے بادشاہ کو اور مرزبان کو سجدہ کرتے ہیں، حالانکہ ان کی کچھ حقیقت نہیں، وہ معمولی انسان ہیں، اور آپؐ اللہ کے عظیم پیغمبر اور محبوب رب العالمین ہیں، حقیقت میں سجدہ کے مستحق آپؐ ہیں، آپؐ ہمیں حکم دیں کہ ہم آپؐ کو سجدہ کیا کریں۔ آنحضور ﷺ نے فرمایا: بتاؤ جب میں دنیا میں نہیں رہونگا اور تم میری قبر سے گذروگے تو کیا میری قبر کو سجدہ کروگے؟ حضرت قیسؓ نے عرض کیا: یارسول اللہ! قبر کو ہم سجدہ نہیں کریں گے۔ صحابہ یہ بات جانتے تھے کہ قبر کو سجدہ کرنا قبر کی پوجا کرنا ہے اور اللہ کے علاوہ کسی کی پوجا جائز نہیں، اس لئے حضرت قیسؓ نے کہا: یارسول اللہ! ہم آپ کی قبر کو سجدہ نہیں کریں گے، آنحضور ﷺ قبر اطہر میں زندہ ہیں، اگر آپؐ کی حیات میں آپؐ کو سجدہ جائز ہوتا تو قبر پر بھی آپؐ کو سجدہ جائز ہوتا، کیونکہ آپؐ قبر میں حیات ہیں، پھر جب آپؐ کی قبر پر سجدہ جائز نہیں تو دنیا میں بھی سجدہ جائز نہیں، اس لئے کہ دونوں زندگیاں آپ کے لئے یکساں ہیں، آپؐ دنیا میں بھی زندہ تھے اور قبر میں

بھی زندہ ہیں۔

تعظیم کی نیت سے بھی سجدہ کرنا جائز نہیں

پھر حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: اگر اللہ کے علاوہ کسی کے لئے سجدہ جائز ہوتا تو میں عورتوں کو حکم دیتا کہ وہ اپنے شوہروں کو سجدہ کیا کریں، یعنی عورتوں پر شوہروں کا جو حق ہے وہ حق اتنا بڑا ہے کہ عورت اس کو ادا نہیں کرسکتی، وہ اپنے شوہر کی جتنی بھی تعظیم کرے کم ہے، اور عورتوں پر لازم ہے کہ وہ شرعی حدود میں رہ کر جتنی زیادہ سے زیادہ شوہر کی تعظیم کرسکتی ہوں کریں۔ اگر اللہ کے علاوہ کسی کو سجدہ جائز ہوتا تو عورت کو حکم ہوتا کہ وہ اپنے شوہروں کو سجدہ کرے، ظاہر ہے عورت جو اپنے شوہر کو سجدہ کرتی تو وہ عبادت کا سجدہ نہیں کرتی، بلکہ تعظیم کے لئے سجدہ کرتی، مگر نبی ﷺ نے اس کو بھی حرام کیا، معلوم ہوا کہ کسی کو تعظیمی سجدہ کرنا بھی جائز نہیں، یہ بھی اللہ کے ساتھ شریک ٹھہرانا ہے، اور گناہ کبیرہ ہے۔ اس لئے اللہ پر پختہ یقین رکھنا ہے، مزاروں، قبروں اور تعویذوں کے گورکھ دھندوں میں نہیں پڑنا، یہ کمزور ایمان کی علامت ہے، اپنے ایمان کو مضبوط کرنا ہے، تنہا ایک اللہ کو خالق و مالک اور پالنہار ماننا ہے، اسی کے سامنے رونا ہے، اسی سے مرادیں مانگنا ہے اور اسی کی عبادت کرنی ہے۔ اس کے علاوہ نہ کسی کی عبادت کرنی ہے، اور نہ کسی سے اپنی ضرورت مانگنی ہے، یہ ایمان کے لئے پہلی ضروری چیز ہے۔

۲-فرشتے نورانی مخلوق ہیں

فرشتوں کو بھی ماننا ضروری ہے، وہ اللہ کی ایک نورانی مخلوق ہیں، وہ نہ مرد ہیں نہ عورت، نہ کھاتے ہیں، نہ پیتے ہیں، اور نہ سوتے ہیں، ہمیشہ اللہ کا حکم بجالانے میں مصروف رہتے ہیں، کبھی اللہ کے حکم کی نافرمانی نہیں کرتے، فرشتوں کو ماننا بھی ایمان کے لئے ضروری ہے۔

۳-تمام آسمانی کتابوں پر ایمان لانا ضروری ہے

اور تیسری چیز جس پر ایمان لانا ضروری ہے وہ یہ ہے کہ اللہ نے لوگوں کی ہدایت اور راہنمائی کے لئے انبیاء کرام پر جو کتابیں نازل فرمائی ہیں ان سب پر ایمان لایا جائے، اگرچہ

عمل صرف قرآنِ کریم پر کرنا ہے، دوسری آسمانی کتابوں پر اب عمل جائز نہیں، کیونکہ قرآنِ مجید کے آجانے کے بعد وہ تمام کتابیں اور شریعتیں منسوخ ہوگئی ہیں، اس لئے اب صرف قرآنِ کریم پر عمل کرنا ضروری ہے، جیسے دنیا میں بہت حکومتیں ہیں اور سب کے اپنے قانون اور ضابطے ہیں، ہم ان کو مانتے ہیں مگر عمل اپنے ملک کے قانون پر کرتے ہیں۔ یہاں امریکہ کا جو قانون ہے اس پر آپ عمل کرتی ہیں، اور میں ہندوستان میں ہندوستان کے قانون پر عمل کرتا ہوں مگر ہم مانتے سب حکومتوں کو ہیں، اسی طرح اللہ کے یہاں سے جتنی کتابیں نازل ہوئی ہیں سب کو ماننا ہے مگر عمل قرآن پر کرنا ہے، اس لئے کہ اب حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کا زمانہ چل رہا ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں توریت پر عمل کرنا ضروری تھا، اس زمانہ کا وہی قانون تھا، پھر جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا زمانہ آیا تو اب تورات پر عمل نہیں ہوگا، اب انجیل پر عمل ہوگا کیونکہ وہی اس زمانہ کا قانون ہے، پھر جب قرآن نازل ہوا تو اب انجیل پر بھی عمل نہیں ہوگا۔ اب قرآن پر عمل کرنا ضروری ہے کیونکہ اسی کا زمانہ چل رہا ہے مگر سب آسمانی کتابوں پر ایمان لانا ضروری ہے، ایمان کے لئے یہ بھی شرط ہے۔

۴- تمام انبیاء پر ایمان لانا ضروری ہے

اسی طرح حضرت آدم علیہ السلام سے ہمارے نبی حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ تک جتنے انبیاء آئے ہیں ان سب پر ایمان لانا ضروری ہے۔ اللہ جل شانہ نے لوگوں کی ہدایت کے لئے بے شمار انبیاء بھیجے ہیں، بعض روایتوں میں ان کی تعداد ایک لاکھ چوبیس ہزار آئی ہے۔ اور تین سو تیرہ رسول آئے ہیں اور ایک سو چار کتابیں نازل ہوئی ہیں۔ ان تمام انبیاء پر، رسولوں پر، اور کتابوں پر ایمان لانا ضروری ہے۔ کسی بھی ایک نبی، یا رسول یا کتاب کا انکار کفر ہے، مگر عمل اسی نبی کی شریعت پر ہوگا جس کا زمانہ چل رہا ہے، اور یہ سید الاولین والآخرین کا زمانہ ہے پس قرآن پر عمل ہوگا، دیگر آسمانی کتابوں پر عمل نہیں ہوگا، مگر ان پر ایمان لانا ضروری ہے۔

فرشتوں پر، گذشتہ کتابوں پر اور انبیاء پر ایمان لانا کیوں ضروری ہے؟

یہ چاروں چیزیں یعنی اللہ پر ایمان لانا، فرشتوں پر ایمان لانا، اللہ کی کتابوں پر ایمان لانا

اور انبیاء پر ایمان لانا ایک ہی سلسلہ کی کڑیاں ہیں۔ چاروں میں چولی دامن کا ساتھ ہے، کیونکہ ہمارا عقیدہ ہے کہ اللہ نے جو ہمارے خالق ومالک ہیں یہ کائنات ہمارے فائدے کے لئے بنائی ہے، پھر اللہ نے ہمارے لئے فرشتوں کے ذریعہ ہدایت بھیجی ہے، اللہ کے یہاں سے جو کتابیں آئی ہیں وہ فرشتوں کے ذریعہ آئی ہیں۔ اگر ہم فرشتوں کا وجود تسلیم نہیں کریں گے تو وحی، نبی اور کتابوں کو کس طرح مانیں گے؟ وحی، آسمانی کتابیں اور انبیاء کو ماننے کے لئے ضروری ہے کہ ہم بیچ کی کڑی یعنی فرشتوں کو مانیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ اس دنیا میں کسی بندے سے براہ راست گفتگو نہیں کرتے، یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی خصوصیت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے طور پر ان سے براہ راست بات کی تھی، اسی طرح حضور اقدس ﷺ کی بھی خصوصیت ہے کہ معراج میں اللہ عزوجل نے ان سے براہ راست بات کی ہے۔ مگر عام طور پر اللہ تعالیٰ دنیا میں براہ راست کسی سے بات نہیں کرتے، فرشتے ہی اللہ کی وحی لے کر نبیوں کے پاس آتے ہیں اور فرشتے جو وحی لاتے ہیں انبیاء وہ وحی لوگوں کو پہنچاتے ہیں، اسی وحی کا نام آسمانی کتابیں ہیں۔

غرض: یہ چاروں ایک سلسلہ کی کڑی ہیں، ان چاروں میں سے اگر ایک کو بھی نہیں مانیں گے تو ایمان باقی نہیں رہے گا۔

۵- دنیا کا ایک آخری دن ہے

پانچویں چیز یہ عقیدہ رکھنا ہے کہ یہ دنیا ہمیشہ چلتی نہیں رہے گی بلکہ اس دنیا کا ایک آخری دن آئے گا، جس پر پہنچ کر یہ دنیا ختم ہو جائے گی، پھر قیامت کے بعد دوسری دنیا میں منتقل ہونا ہوگا، یہ عقیدہ تو کافروں کا ہے کہ بس یہی دنیا سب کچھ ہے ﴿وَقَالُوْا اِنْ هِیَ اِلَّا حَیَاتُنَا الدُّنْیَا نَمُوْتُ وَنَحْیَا وَمَا یُهْلِكُنَا اِلَّا الدَّهْرُ﴾: کافر کہتے ہیں: بس دنیا کی یہ زندگی ہی زندگی ہے، آگے کوئی دوسری زندگی نہیں، ہم کھاتے ہیں، پیتے ہیں، پلتے بڑھتے ہیں اور بوڑھے ہو کر مر جاتے ہیں، آگے قصہ ختم۔ اب دوسری کوئی زندگی نہیں، اور یہ دنیا یونہی چلتی رہے گی، اس کا آخر نہیں ہے، لوگ یونہی آتے جاتے رہیں گے، اور دنیا چلتی رہے گی، ان کا یہ عقیدہ باطل

ہے، جس طرح ہم پیدا ہوئے ہیں اور ایک دن ہمیں ختم ہو جانا ہے، اسی طرح یہ دنیا بھی نو پید ہے، ہمیشہ سے نہیں ہے، اور اس کو بھی ایک دن ختم ہو جانا ہے، اس آخری دن کو جس میں اس دنیا کی بساط الٹ دی جائے گی الیوم الآخر کہتے ہیں، اس پر ایمان لانا ضروری ہے۔

٦- مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونے پر ایمان لانا ضروری ہے

اور چھٹا عقیدہ جس پر ایمان لانا ضروری ہے یہ ہے کہ مرنے کے بعد ایک دن ہمیں پھر زندہ ہونا ہے، اور اپنے اعمال کا حساب دینا ہے، اور جزاؤ سزا پانا ہے۔ کافر کا عقیدہ یہ ہے کہ دوبارہ زندہ نہیں ہونا، مر کر مٹی میں گل سڑ کر جانا ہے، یا جل کر راکھ ہو جانا ہے، مگر ان کا یہ عقیدہ باطل ہے، اس دنیا میں ہر شخص امتحان کے لئے پیدا کیا گیا ہے، یہ دنیا اس لئے بنائی گئی ہے کہ انسانوں کی جانچ ہو، کون اچھے عمل کرتا ہے اور کون برے عمل کرتا ہے۔ ظاہر ہے ایک دن اس کا رزلٹ آئے گا، وہ فیصلہ الیوم الآخر میں ہوگا، جب اس دنیا کا آخری دن آئے گا تو اول سے آخر تک ہر مخلوق کو زندہ کیا جائے گا، اور انسان کے اچھے برے اعمال کا حساب ہوگا، پھر ان کو جنت وجہنم میں جو آخری ٹھکانہ ہے پہنچا دیا جائے گا اور اس دنیا کا معاملہ ختم کر دیا جائے گا۔

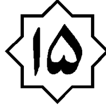
۷- تقدیر پر ایمان لانا ضروری ہے

اور آخری چیز جس پر ایمان لانا ضروری ہے، وہ اچھی بری تقدیر ہے، اللہ نے اس کائنات کو بنانے سے پہلے ایک پلاننگ کی ہے، اس پلاننگ کے مطابق یہ دنیا وجود میں آئی ہے، اور اس کا نظام چل رہا ہے، اس پلاننگ کو ماننا بھی ضروری ہے، اور یہی بھلی بری تقدیر پر ایمان لانا ہے، تقدیر کی بہت تفصیل ہے اور وہ میں نے بار بار سمجھائی ہے، وقت بہت ہو چکا ہے، اس لئے میں اس کو دوہرا نہیں رہا، یہیں اپنی بات ختم کرتا ہوں۔

ملحوظہ: تقدیر کیا ہے؟ اور بھلی بری تقدیر کا مطلب کیا ہے؟ یہ مضمون علمی خطبات حصہ اول (ص:۲۱۸) میں آچکا ہے، وہاں ملاحظہ فرمائیں۔

و آخر دعوانا أن الحمدللہ رب العالمین



انسانوں کے اعمال مختلف ہیں اس لئے جزاء بھی مختلف ہے

خطبہ مسنونہ کے بعد: ﴿وَاللَّيْلِ إِذَا يَغْشٰى ۝ وَالنَّهَارِ إِذَا تَجَلّٰى ۝ وَمَا خَلَقَ الذَّكَرَ وَالْأُنْثٰى ۝ إِنَّ سَعْيَكُمْ لَشَتّٰى ۝ فَأَمَّا مَنْ أَعْطٰى وَاتَّقٰى ۝ وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰى ۝ فَسَنُيَسِّرُهُ لِلْيُسْرٰى ۝ وَأَمَّا مَنْ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰى ۝ وَكَذَّبَ بِالْحُسْنٰى ۝ فَسَنُيَسِّرُهُ لِلْعُسْرٰى﴾

بزرگو اور بھائیو! زمانہ ربڑ کی مثال ہے کھینچو تو لمبا ہو جاتا ہے چھوڑ دو تو سمٹ جاتا ہے وقت بھی ایسا ہی ہے کھینچو تو ہزار سال یا پچاس ہزار سال، چھوڑ دو تو ایک دن، اور وقت ماضی میں تو سکڑا ہوا ہے اور مستقبل میں کھینچا ہوا ہے جیسے ہم میں سے جو نوجوان ہیں وہ ذرا سوچیں کہ ان کا بچپن کتنے دن میں بیت گیا اور جو ادھیڑ ہیں ان سے پوچھو: تمہارا بچپن اور جوانی کتنے دنوں میں گذری ہے؟ اسی نوے سال کے چچا سے پوچھو تو وہ بھی یہی کہے گا کہ بیٹا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کل ہم گلی ڈنڈا کھیلتے تھے، اس کے برخلاف آدمی جب بچہ ہوتا ہے تو سوچتا ہے: ابھی تو ہم جوان ہونگے، ادھیڑ ہونگے، بوڑھے ہونگے، ٹانگیں گھسیٹیں گے تب مریں گے، جوان بھی آگے آنے والے وقت کو ایسا ہی سمجھتا ہے، بہر حال مستقبل میں ہمیں اپنی عمر بہت لمبی نظر آتی ہے اور ماضی میں سکڑی ہوئی، ایسا اس لئے ہے کہ وہ ربڑ (وقت) آگے (مستقبل میں) کھینچا ہوا ہے اور جوں جوں وقت آگے بڑھتا ہے ربڑ پیچھے سے سمٹتا چلا جاتا ہے۔

وقت کو اللہ تعالیٰ نے دو حصوں میں تقسیم کیا ہے، وہ دو حصے ہیں: دن اور رات، دن رات کوئی الگ الگ نہیں ہیں بلکہ وقت کے دو حصے ہیں اور جب وقت کے دو حصے کئے گئے تو دن وجود میں آیا دن وجود میں آیا تو مہینہ وجود میں آیا، مہینہ وجود میں آیا تو سال وجود میں آیا، اور وقت کی دو حصوں میں یہ تقسیم ہماری دنیا میں ہے، دوسری دنیا میں دن رات نہیں، کیونکہ وہاں چاند سورج نہیں، اسی لئے وہاں وقت کھینچا نہیں جائے گا اور یہاں وقت کو کھینچنے کے

لئے اللہ تعالی نے اس کے دو حصے کردئے، چنانچہ فرمایا: ﴿وَاللَّيْلِ إِذَا يَغْشٰى﴾: قسم ہے رات کی جب وہ چھاجاتی ہے، جب رات چھا جاتی ہے تو عشا کا وقت شروع ہوتا ہے اور رات آئی مگر چھائی نہیں تو مغرب کا وقت ہے، اور جب رات کے آخر میں دن کی روشنی رات کے ساتھ ملی تو رات ختم، صبح صادق شروع ہوگئی، تو اللہ نے رات کی قسم کھائی ہے جب وہ چھاجائے ﴿وَالنَّهَارِ إِذَا تَجَلّٰى﴾: اور قسم ہے دن کی جب وہ خوب روشن ہوجائے، صبح صادق پر سورج کی روشنی زمین پر آجاتی ہے لیکن اس وقت تک وہ واضح روشنی نہیں ہوتی، سورج نکل آیا اب بھی اس کی روشنی واضح نہیں، گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ گذرا اور سورج اوپر چڑھ گیا اب دن خوب روشن ہوگیا، اللہ تعالیٰ اسی کی قسم کھارہے ہیں۔

دوسری مثال لو، انسان ایک نفس ہے اور یہ مضمون قرآن میں کئی جگہ آیا ہے، وہ آیت پاک جو نکاح کے خطبہ میں پڑھی جاتی ہے اس میں بھی یہ مضمون ہے: ﴿يٰأَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ﴾: اے لوگو! اس پروردگار سے ڈرو جس نے تمہیں ایک نفس سے پیدا کیا ہے، اس نفس کو بھی اللہ تعالی نے دو حصوں میں تقسیم کیا ہے: مرد اور عورت، اللہ نے تیسری قسم کھائی: ﴿وَمَا خَلَقَ الذَّكَرَ وَالْأُنْثٰى﴾: اور اللہ نے جو نر اور مادہ پیدا کئے ہیں ان کی قسم، اب میرے بھائیو! تھوڑی دیر غور کرو! اللہ نے ایک نفس کو مرد وعورت میں تقسیم کر کے دو حصے بنائے اور دونوں میں کتنے ہی فرق رکھ دیئے، جو کام مردوں کا ہے وہ عورت نہیں کرسکتی اور جو عورت کا ہے وہ مرد نہیں کرسکتا حالانکہ ایک ہی نفس سے دونوں پیدا ہوئے ہیں، ایسے ہی وقت کے دو حصے دن رات بنائے، دن کا کام دن کرے گا، رات کا کام رات کرے گی۔ دن رات کا کام کیا ہے؟ ﴿وَمِنْ رَّحْمَتِهٖ جَعَلَ لَكُمُ اللَّيْلَ لِتَسْكُنُوْا فِيْهِ﴾: اللہ نے اپنی رحمت سے رات بنائی تا کہ تم اس میں آرام کرو، ﴿وَجَعَلَ النَّهَارَ مُبْصِرَةً﴾: اور اللہ نے دن کو دکھلانے والا بنایا، دن میں کاروبار کرو اور روزی کماؤ، کمانا دن کا کام ہے اور آرام کرنا رات کا کام ہے، جو آرام رات میں ملتا ہے دن میں کتنا ہی سولو وہ آرام نہیں مل سکتا اور جو کمائی آدمی دن میں نشاط کے ساتھ کرتا ہے وہ رات میں نہیں کرسکتا حالانکہ دونوں ہی وقت کے حصے ہیں ﴿إِنَّ سَعْيَكُمْ لَشَتّٰى﴾: تمہارے یعنی انسانوں کے اعمال مختلف ہیں جیسے

وقت کے دو حصے ایک دوسرے سے الگ ہیں، جیسے نفس کے دو حصے ایک دوسرے سے الگ ہیں ایسے ہی تمہارے اعمال بھی مختلف ہیں۔

آگے فرمایا کہ تین کام یہ ہیں اور تین کام ان کے مقابل ہیں دیکھو ان کے درمیان کتنے فرق ہیں؟ ﴿فَأَمَّا مَنْ أَعْطٰى وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰى﴾: کچھ بندے وہ ہیں جو اللہ کے لئے دیتے ہیں۔أَعْطٰى: یعنی دوسروں کو دیتے ہیں، کسی سے مانگتے نہیں، مانگنے والا ہاتھ برا ہے اور دینے والا ہاتھ بہتر ہے اور جو حقیقی دینے والا ہے آدمی اسی سے تو مانگے نا ایرے غیرے کے سامنے ہاتھ پھیلائے اس سے برا اور کیا ہوسکتا ہے، بہر حال یہ لوگ مانگتے نہیں، بلکہ اللہ نے ان کو جو دیا ہے اس میں سے دوسروں کو دیتے ہیں۔اور اگر ان کے پاس کچھ نہ ہو تو اگر چہ اوروں کو نہیں دیں گے مگر مانگیں گے بھی نہیں، حدیث شریف میں ہے حضور پاک ﷺ نے ارشاد فرمایا: **ما تعُدُّون الفقر فيكم**: تم اپنے درمیان غریب اور محتاج کس کو سمجھتے ہو؟ لوگوں نے کہا: یا رسول اللہ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ جس کے پاس کچھ نہ ہو وہ غریب ہے، حضور ﷺ نے فرمایا: یہ غریب نہیں، یہ لوگوں سے مانگے گا تو لوگ اسے دیں گے اور یہ اس سے صبح شام دو روٹی پیٹ بھر کے کھالے گا یہ غریب کہاں ہوا؟ آخر مالدار بھی تو دو ہی روٹی کھاتا ہے، باقی مال گھر میں یا بینک میں پڑا رہتا ہے، حضور ﷺ نے فرمایا کہ غریب حقیقت میں وہ ہے جو کسی سے مانگتا نہیں اور اس کے پاس کچھ ہے بھی نہیں۔مگر اس نے اپنی حالت ایسی بنا رکھی ہے کہ کوئی اس کو غریب نہیں سمجھتا اس لئے کوئی کچھ اس کو دیتا بھی نہیں، یہ ہے غریب، بہر حال اگر ان کے پاس کچھ نہ ہو تو مانگتے نہیں، اور کچھ ہو تو دوسروں کو دیتے ہیں، پس ان کا پہلا کام ہے: أعطى دوسرں کو دینا۔اور دوسرا کام ہے: إتقى: یعنی اللہ سے ڈرتے ہوئے زندگی کے دن گذارتا ہے، اللہ کے کسی حکم کی خلاف ورزی نہیں کرتا۔اور تیسرا کام ہے: ﴿وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰى﴾: اور بہترین بات یعنی لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی تصدیق کرتا ہے۔

ایک بندے کے تو یہ اعمال ہیں، ایماندار ہے لا الہ الا اللہ پر صرف زبانی جمع خرچ نہیں کرتا بلکہ دل کی گہرائی سے اس پر ایمان رکھتا ہے اور جب اس پر ایمان ہے تو اللہ سے ڈرتے ہوئے پرہیز گاری کی زندگی گذارتا ہے اور اللہ نے جو مال اسے دیا ہے اس میں سے دوسروں

کو دیتا ہے۔

دوسرے بندے کے اعمال: ﴿وَأَمَّا مَنْ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰى وَكَذَّبَ بِالْحُسْنٰى﴾: دوسرا بندہ وہ ہے جو بخیلی کرتا ہے، اللہ کے دیئے ہوئے مال کو روکتا ہے، اللہ جو دیتے ہیں ہمیشہ ہمارے ہی نصیب کا نہیں دیتے دوسرے بندوں کو بھی ہمارے ساتھ جوڑتے ہیں اور ان کے نصیب کا بھی ہمیں دیتے ہیں، پس ہمیں چاہئے کہ ہم انہیں ان کا حق دیں، جس کا جی چاہے اپنے اوپر یا دوسروں پر تجربہ کر کے دیکھ لے، جب تک میاں بیوی دو ہونگے آمدنی کم ہوگی اور جب بچے آنے شروع ہونگے آمدنی بڑھتی چلی جائے گی جتنے بچے ہونگے آمدنی بڑھتی چلی جائے گی کیونکہ یہ جو بچے دنیا میں آرہے ہیں یہ خالی تختی لے کر نہیں آرہے اپنی قسمت میں کچھ لکھوا کر آرہے ہیں اور یہی رزق باپ کے راستہ سے ان کو ملتا ہے، جب بچوں کی شادی ہوگی اور اپنا الگ گھر بسائیں گے تو ان کی قسمت کا رزق ان کو براہ راست ملے گا لیکن جب تک وہ باپ کے ماتحت ہیں تب تک اپنی قسمت میں لکھوا کر جو لائے ہیں وہ باپ کے واسطہ سے ان کو ملتا رہتا ہے۔ اسی طرح جو سخی داتا ہوتے ہیں جو غریبوں پر خرچ کرتے ہیں اللہ انہیں بے حساب دیتے ہیں، کیونکہ غریبوں تک ان کی قسمت کا رزق اس سخی داتا کے واسطہ سے پہنچتا ہے، قرآن کریم میں ہے: ﴿وَمَا أَنْفَقْتُمْ مِنْ شَيْءٍ فَهُوَ يُخْلِفُهُ﴾: تم جو بھی اللہ کے راستہ میں خرچ کرتے ہو اللہ اس کا عوض دیدیتے ہیں، پس جب ایسی بات ہے تو بخیلی کرنے کا مطلب کیا ہے؟ یہی کہ اللہ نے ہمیں غریبوں کو دینے کے لئے دیا اور ہم نے اسے روک لیا، یہ تو دوسروں کی قسمت پر ہم نے ڈاکہ ڈالا، تو ایک عمل تو اِس بندے کا یہ ہے کہ دوسروں تک ان کا حق نہیں پہنچاتا۔

دوسرا عمل ہے: واستغنی: اللہ سے بے نیاز بنتا ہے، اس کو اللہ کی کچھ نہیں پڑی، یعنی اگر کوئی کام اللہ کی مرضی کے مطابق ہوگیا تو ہوگیا، باقی وہ اللہ کو راضی کرنے کی نیت سے کوئی کام نہیں کرتا، ایسے بندے کے اعمال میں اور اس بندے کے اعمال میں جو اپنے آپ کو اللہ کا محتاج سمجھتا ہے آسمان وزمین کا فرق ہوتا ہے، ایک بیوی جو شوہر کو شوہر سمجھتی ہے اس کی زندگی میں اور اس بیوی کی زندگی میں جو شوہر کو کچھ نہیں سمجھتی زمین وآسمان کا فرق ہوتا ہے، اسی طرح

اپنے آپ کو اللہ کا محتاج سمجھنے والے بندے کے اعمال کے درمیان اور بے نیاز بننے والے بندے کے اعمال کے درمیان آسمان وزمین کا فرق ہوتا ہے۔

اور تیسرا کام اس بندے کا ہے: ﴿وَكَذَّبَ بِالْحُسْنٰى﴾: کلمہ طیبہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کو نہیں مانتا۔ بعض لوگ دونوں اجزاء جھٹلاتے ہیں جیسے ہندو، وہ لا الہ الا اللہ بھی نہیں مانتے، وہ مندروں میں جن کی پوجا کرتے ہیں وہ سب اللہ کے علاوہ معبود ہیں، اور بعض لوگ لا الہ الا اللہ کو مانتے ہیں محمد رسول اللہ کو نہیں مانتے جیسے یہود ونصاری لا الہ الا اللہ کو مانتے ہیں، سکھ بھی لا الہ الا اللہ کو مانتے ہیں وہ کسی کی پوجا نہیں کرتے، مگر محمد رسول اللہ کو نہیں مانتے، محمد رسول اللہ کو ماننے کا مطلب یہ ہے کہ جس نبی کا زمانہ چل رہا ہے اس پر اور اس سے پہلے والے انبیاء پر ایمان لانا ضروری ہے۔ بہر حال کلمہ حسنی کو جو مانتا ہے اس کی زندگی اور کلمہ حسنی کو جو نہیں مانتا اس کی زندگی ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہوتی ہے اور اگر زندگیاں مختلف نہ ہوں تو پھر اس کلمہ کو ماننے کا کوئی فائدہ نہیں۔

الغرض میں یہ عرض کررہا تھا کہ یہ تین کام پہلے والے ہیں یعنی اللہ کے لئے دینا، اللہ سے ڈرتے رہنا اور کلمہ حسنی کی تصدیق کرنا، یہ تین کام انسان ہی کرتے ہیں فرشتے نہیں کرتے، اور دوسرے تین کام ہیں: بخل کرنا، اللہ کی کوئی پرواہ نہ کرنا اور کلمہ حسنی کو جھٹلانا یہ بھی اللہ کے بندے ہی کرتے ہیں۔ اللہ تعالی نے انسانوں کے اعمال میں فرق رکھا ہے، اور جب اعمال میں فرق ہے تو نتیجہ میں بھی فرق ہوگا، جب دو طالب علموں نے دو پرچے مختلف لکھے ہیں تو نمبر بھی لامحالہ الگ الگ آئیں گے، ایک اوپر جائے گا تو دوسرا نیچے آئے گا اور جب نتیجہ الگ ہے تو انجام بھی الگ ہے ایک کا انجام جنت ہے، اور ایک کا انجام جہنم، دونوں کا انجام ایک کیسے ہوسکتا ہے؟

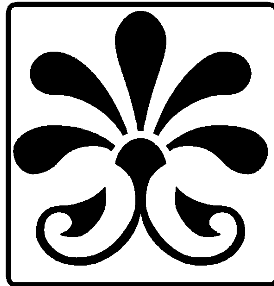
پوری کائنات کے خالق ومالک اللہ تعالی ہیں، ہر چیز وہی پیدا کررہے ہیں یہ جو تین اچھے کام کررہا ہے یہ بھی اللہ پیدا کررہے ہیں اور یہ جو تین برے کام کررہا ہے یہ بھی اللہ پیدا کررہے ہیں لیکن اُس کے کام اللہ کو پسند ہیں اور اِس کے کام اللہ کو پسند نہیں اور جنت اور جہنم کے فیصلے اللہ کی پسند اور ناپسند پر ہونگے باقی دونوں کے اعمال اللہ ہی پیدا کررہے ہیں۔

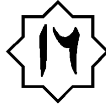
عام فہم بات ہے کہ یہ پوری کائنات اللہ کی ہے، اور اللہ کی کائنات میں اللہ کے علاوہ کوئی اور پیدا کرنے والا نہیں ہوسکتا، اگر ہوسکتا ہے تو پھر یہ اللہ کی کائنات کہاں رہی؟ اس لئے جو کچھ بھی پیدا ہو رہا ہے چاہے وہ اچھا ہو یا برا اللہ ہی پیدا کر رہے ہیں مگر کچھ کام اللہ کو پسند ہیں اور کچھ کام ناپسند۔ اللہ کو کیا پسند ہے اور کیا پسند نہیں؟ یہ خود اللہ تعالیٰ نے بتلایا ہے۔ ﴿إِنْ تَكْفُرُوْا فَإِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنْكُمْ وَلَا يَرْضٰى لِعِبَادِهِ الْكُفْرَ﴾: اگر تم اللہ کا انکار کرو تو اللہ کو تمہاری کچھ نہیں پڑی اور اللہ اپنے بندوں کے لئے ناشکری کو پسند نہیں کرتے۔ ﴿وَإِنْ تَشْكُرُوْا يَرْضَهُ لَكُمْ﴾: اور اگر تم اللہ کے شکر گذار بندے بنو تو اللہ اس کو تمہارے لئے پسند فرماتے ہیں، اور پسند اور ناپسند پر جزا و سزا کے فیصلے ہونگے کیونکہ خلق (پیدا کرنا) خالق کی طرف سے ایک عمل ہوتا ہے، مخلوق کا اس میں کوئی دخل نہیں ہوتا، ہم معدوم تھے اللہ نے جب چاہا ہمیں پیدا کر دیا ہمارا اس میں کیا دخل ہے؟ خلق میں ابتداء خالق کی طرف سے ہوتی ہے مخلوق کی طرف سے کوئی دخل نہیں ہوتا اور اللہ کی پسند ناپسند میں ابتداء اللہ کی طرف سے نہیں ہوتی مخلوق کی طرف سے ہوتی ہے، مخلوق نے یہ کام کیا تو اللہ نے پسند کیا، مخلوق نے دوسری طرح کا کام کیا تو اللہ نے ناپسند کیا، اسی کا نام جزوی اختیار ہے اور اسی جزوی اختیار کی بنیاد پر آخرت میں جزا و سزا کے فیصلے ہونگے، جب کوئی بندہ اپنے جزوی اختیار سے برائی کرے گا تو پیدا اس کو اللہ تعالیٰ کریں گے، ایسے ہی جب کوئی بندہ اپنے جزوی اختیار سے نیک کام کرے گا تو پیدا اس کو بھی اللہ تعالیٰ کریں گے البتہ برائی کرنے پر سزا ملے گی اگرچہ پیدا اس برائی کو اللہ نے کیا ہے، اور نیکی کرنے پر جزائے خیر ملے گی اگرچہ پیدا اس کو بھی اللہ نے کیا ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿فَأَمَّا مَنْ أَعْطٰى وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰى فَنُيَسِّرُهُ لِلْيُسْرٰى﴾: جس شخص نے اپنے مال میں سے دوسروں کو دیا اور اللہ سے ڈرتے ڈرتے زندگی گذاری اور کلمہ حسنی کی تصدیق کی تو آسان کر دیتے ہیں ہم اس کے لئے ان آسان کاموں کو، یہ جو نیکی والے کام ہیں، نہایت آسان ہیں، ان کو اللہ تعالیٰ عمل کرنے والوں کے لئے اور آسان کر دیتے ہیں۔ اور وہ جو دوسرے تین برے کام ہیں ان کے بارے میں فرمایا: ﴿وَأَمَّا مَنْ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰى وَكَذَّبَ بِالْحُسْنٰى فَسَنُيَسِّرُهُ لِلْعُسْرٰى﴾: جس نے بخیلی کی اور اللہ سے

بے نیاز بنا اور کلمہ حسنی کو جھٹلاتا رہا تو یہ تینوں کام اگر چہ نہایت مشکل کام ہیں لیکن اللہ تعالی ان کو بھی آسان کر دیتے ہیں، ﴿زَيَّنَّا لَهُمْ أَعْمَالَهُمْ﴾ اللہ فرماتے ہیں: ہم نے لوگوں کے لئے ان کے اعمال مزین کرر کھے ہیں، ان کو برائی کا احساس نہیں ہوتا، بہر حال بندہ جس لائن پر چلنا چاہے گا اللہ دستگیری کریں گے اور وہ جو کام کرنا چاہے گا اللہ اسے پیدا فرمادیں گے۔

میرے بھائیو! بات کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ بڑا قیمتی وقت گذر رہا ہے اور ہم پونے بارہ بجے یہاں بیٹھے ہیں اور یہ ہماری بہنیں بیٹھی ہیں تو یہاں کیا لڈو بٹ رہے ہیں جو بیٹھے ہیں، اللہ کے دین کی باتیں سمجھنے کے لئے اور ان پر عمل کرنے کے لئے جمع ہوئے ہیں، اللہ نے اپنے فضل و کرم سے ہمیں ان بندوں میں شامل کیا ہے جو اللہ سے ڈرتے ہوئے زندگی گذارتے ہیں، اللہ سے بے نیاز نہیں بنتے، ایسے بندے شراب خانوں اور کلبوں میں ہونگے۔ یہاں اللہ کے محتاج بندے اور بندیاں بیٹھی ہیں، یہ ماہ مبارک ہے، اعمال حسنہ کا بہترین سیزن ہے، میرے بھائیو اور میری بہنو! ہر نیک کام کرنے کی کوشش کرو، گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں، ماہ مبارک پورا ہو رہا ہے اس لئے جو بھی نیک کام کر سکتے ہو کرو، اس مہینہ میں نفل فرض کے برابر ہو جاتا ہے، اعمال حسنہ سے اس مہینہ کو بھر دو۔ اللہ تعالی مجھے بھی اور آپ حضرات کو بھی زیادہ سے زیادہ اعمال صالحہ کی توفیق عطا فرمائیں۔ آمین یارب العالمین۔

و آخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمین





آخرت کی کامیابی دس کاموں سے ہے

خطبۂ مسنونہ کے بعد: ﴿إِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمَاتِ وَالْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ وَالْقَانِتِيْنَ وَالْقَانِتَاتِ وَالصَّادِقِيْنَ وَالصَّادِقَاتِ وَالصَّابِرِيْنَ وَالصَّابِرَاتِ وَالْخَاشِعِيْنَ وَالْخَاشِعَاتِ وَالْمُتَصَدِّقِيْنَ وَالْمُتَصَدِّقَاتِ وَالصَّائِمِيْنَ وَالصَّائِمَاتِ وَالْحَافِظِيْنَ فُرُوْجَهُمْ وَالْحَافِظَاتِ وِالذَّاكِرِيْنَ اللّٰهَ كَثِيْرًا وَالذَّاكِرَاتِ أَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ مَغْفِرَةً وَأَجْرًا عَظِيْمًا﴾

معزز خواتین اور اسلامی بہنیں! اللہ جل شانہ نے ہم انسانوں کو پیدا کیا اور پیدا کر کے ہماری تمام ضرورتیں مہیا فرمائیں، اور ہماری ہی نہیں بلکہ اللہ نے جو بھی مخلوق پیدا کی ہے پیدا کر کے اس کی سب ضرورتیں مہیا فرمائی ہیں، قرآنِ کریم میں ہے: ﴿الَّذِی أَعْطٰى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهُ ثُمَّ هَدٰى﴾ اللہ وہ ہیں جنہوں نے ہر چیز کو بنایا پھر اسے راستہ دکھایا، اس ضابطہ کے مطابق اللہ نے ہم انسانوں کو بھی پیدا کیا اور پیدا کرنے کے بعد ہماری سب ضرورتیں مہیا فرمائیں۔

انسان کی دو ضرورتیں

انسان نام ہے دو چیزوں کا، ایک جسم کا اور ایک روح کا، کچھ ضرورتیں انسان کی روح کی ہیں اور کچھ انسان کے جسم کی، جیسے کھانا پینا سونا جاگنا گرمی سردی سے بچنا جسم کی ضرورتیں ہیں، روح کو نہ سردی لگتی ہے نہ گرمی، نہ بھوک لگتی ہے نہ پیاس، یہ ساری ضرورتیں جسم کی ہیں اور روح کی صرف ایک ضرورت ہے اور وہ یہ ہے کہ روح اپنے خالق و مالک کو پہچانے اگر روح اللہ کو نہیں پہچانتی تو اس روح میں اور جانوروں کی روح میں کوئی فرق نہیں بلکہ بعض

اعتبار سے جانوروں کی روحیں اچھی ہیں اُس انسان کی روح سے جو اللہ کو نہیں پہچانتا ﴿أُولٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ﴾ کافر جانوروں جیسے ہیں بلکہ ان سے بھی برے ہیں، کافر دیکھنے میں تو شاندار انسان ہیں پھر جانوروں جیسے کس بات میں ہو گئے؟ اور جانوروں سے بھی برے کس بات میں ہو گئے؟ اس کا جواب اللہ نے اسی آیت میں دیا ہے کہ ان کافروں کی روحیں اللہ کو نہیں پہچانتی اور جب ان کی روحیں اللہ کو نہیں پہچانتی تو اس روح میں اور جانور کی روح میں کیا فرق ہے؟

غرض روح کی ضرورت صرف ایک ہے اور وہ ہے اللہ کو پہچاننا، پھر جب روح نے اللہ کو پہچان لیا تو پہچاننے کے بعد اس کے کچھ تقاضے ہیں، یہ تقاضے بھی روح کی ضرورتیں ہیں، جب ہم نے یہ جان لیا کہ اللہ ہمارے خالق و مالک ہیں تو اب عبادت بھی ان ہی کی کرنی ہوگی، یہ عبادت روح کی ضرورت ہے، اسی طرح جب ہم نے جان لیا کہ اللہ ہمارے مالک ہمارے پالنہار ہیں تو اب ان کا ہر حکم ماننا ضروری ہے، یہ اطاعت و فرماں برداری بھی روح کی ضرورت ہے، اسی لئے یہ مسئلہ کتابوں میں لکھا ہے کہ جب تک کوئی انسان اسلام قبول نہ کرے فروع کا مکلّف نہیں، نماز، روزہ، زکوۃ کا حکم اسے نہیں دیا جاتا، کیونکہ ان کا نمبر بعد میں ہے پہلے اللہ کو پہچانو پہچاننے کے بعد اس کے تقاضے شروع ہونگے، فی الحال تو اس پر یہ لازم ہے کہ وہ اللہ کو پہچانے، اور ان پر ایمان لائے، کیونکہ انسان کو پیدا کرنے سے پہلے اللہ کی پہچان کرادی گئی ہے، اللہ کی پہچان کرانے کے بعد انسان کو پیدا کیا گیا ہے۔

کائنات انسان کی جسم کی ضرورت کے لئے ہے

غرض انسان کی دو ضرورتیں ہیں، ایک جسم کی اور ایک روح کی، جسم کی ضرورت پوری کرنے کے لئے اللہ تعالی نے یہ کائنات پیدا کی ہے، آسمان، زمین چاند، سورج، سمندر، ہوا، درندے، پرندے، چوپائے وغیرہ جو بھی مخلوقات ہیں یہ سب انسان کے جسم کی ضرورتیں پوری کرنے کے لئے ہیں، حدیث شریف میں فرمایا گیا ہے: **الدُّنيا خلقت لكم وإنكم خلقتم للآخرة**: دنیا تمہارے لئے پیدا کی گئی ہے اور تم آخرت کے لئے پیدا کئے گئے ہو، اس حدیث

سے معلوم ہوا کا دنیا کا ذرہ ذرہ انسان کے جسم کی ضرورت پورا کرنے کے لئے ہے۔

انبیاء کی بعثت روح کی ضرورت پوری کرنے کے لئے ہے

اور روح کی ضرورت پوری کرنے کے لئے اللہ تعالی نے ہر زمانہ میں انبیاء بھیجے اور ان پر آسمان سے وحیاں نازل کیں، کتابیں نازل کیں، ان کتابوں میں اللہ تعالی نے انسان کو اپنی پہچان کروائی، اور اللہ کی طرف سے احکامات دیئے گئے کہ انسان کو ان چیزوں پر عمل کرنا ہے اور ان چیزوں سے بچنا ہے، یہ جو اللہ کی جانب سے وحیاں نازل ہوئیں، کتابیں نازل ہوئیں یہ سب انسان کی روح کی ضرورت پوری کرنے کے لئے ہیں۔

اسلام اللہ کی نعمت ہے

آدم علیہ السلام کے زمانہ سے ہمارے نبی ﷺ کے زمانہ تک ایک لاکھ سے زیادہ نبی اور رسول آئے اور سو سے زیادہ اللہ کی کتابیں نازل ہوئیں اور مختلف وقتوں میں ان کتابوں نے انسان کی روح کی غذا مہیا کی، انسان کی روح کو سنوارنے کا کام کیا، یہ سلسلہ چلتا رہا یہاں تک کہ تمام رسولوں کے سردار حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کو اللہ نے بھیجا اور آپؐ پر اپنی سب سے اہم کتاب قرآن کریم نازل فرمائی جو قیامت تک دنیا میں موجود رہے گی اور تمام انسانوں کی رہنمائی کرتی رہے گی، اس قرآن کی جب تکمیل ہونے کو آئی تو یہ آیت کریمہ نازل ہوئی: ﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا﴾: آج میں نے تمہارے لئے تمہارا دین مکمل کر دیا اور میں نے اپنی نعمت تمہارے لئے پوری کر دی اور میں نے تمہارے لئے اسلام کو دین ہونے کے اعتبار سے پسند کر لیا، یعنی اللہ کی نعمت پوری کی پوری انسان کو پہنچ چکی اور یہ نعمت ہے: اسلام، اور یہ بہت بڑی نعمت ہے یہ عظیم الشان نعمت اللہ نے مکمل اپنے بندوں کو دیدی، مگر آج دنیا میں اکثریت ان لوگوں کی ہے جو اس نعمت سے محروم ہیں، جو اس نعمت کی قدر نہیں جانتے، انہیں معلوم نہیں کہ دنیا میں ایک نعمت اسلام بھی ہے جو اللہ کا دین ہے، اس کے ماننے میں دنیا وآخرت کی بھلائیاں ہیں

مگران کی آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی ہے، ان کے کانوں میں ڈاٹ لگی ہوئی ہے ان کی عقلوں پر پردے پڑے ہوئے ہیں وہ اللہ کی اس روشنی کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں اور اللہ نے ہم بندوں اور بندیوں کو ان لوگوں میں شامل فرمایا ہے جنہوں نے اللہ کے بھیجے ہوئے دین کو قبول کیا ہے۔

آدمی پکا مسلمان ہو تو پریشان نہیں ہوتا

ہم نے اللہ کے فضل سے ایمان واسلام کو قبول کرلیا ہے مگر قبول کرنے کے بعد بہت سی باتوں میں ہم اسلام کے احکام پر نہیں چلتے شیطان کے نقش قدم پر چلتے ہیں، اُن غلط راہوں پر چلتے ہیں جن کی اسلام میں کوئی گنجائش نہیں، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم مسلمان ہیں اور پریشان ہیں، حالانکہ مسلمان کبھی پریشان نہیں ہوتا، اگر وہ سچا پکا مسلمان ہے تو کبھی پریشان نہیں ہوگا، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ مسلمان بیمار نہیں ہوگا، بیمار تو ہوگا، لیکن بیمار ہونا اور ہے اور بیماری میں پریشان ہونا اور ہے، مسلمان کبھی بیمار ہو کر پریشان نہیں ہوتا، اگر بیمار ہو کر پریشان ہو گیا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کا ایمان کمزور ہے، اس کا اسلام کمزور ہے، ورنہ بیمار تو اللہ کے نبی بھی ہوتے تھے، اللہ کے نبیوں میں ایک نبی: حضرت ایوب علیہ السلام بہت بڑے پیغمبر ہیں، وہ سخت بیمار ہوئے تھے اور ایک لمبے عرصے تک بیمار رہے تھے مگر انہوں نے ایسا صبر کیا کہ ان کا صبر آج ضرب المثل ہے۔ غرض حضرت ایوب سخت بیمار ضرور ہوئے تھے مگر پریشان نہیں ہوئے تھے۔

میں نے جو کہا کہ مسلمان پریشان نہیں ہوتا اس کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ مسلمان غریب نہیں ہوتا بلکہ وہ چاہے جتنا بھی غریب ہو پریشان نہیں ہوتا، غریبی میں پریشان وہی ہوگا جس کا ایمان واسلام کمزور ہوگا، ہمارے آقا حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی زندگی کے احوال حدیثوں میں آئے ہیں ان احوال کو اگر ہم پڑھیں یا سنیں تو آج شاید دنیا میں کوئی مسلمان ایسا ہوگا جو ان حالات سے دوچار ہو، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: حضور ﷺ کے گھر میں دو دو مہینے ایسے گذر جاتے تھے کہ چولھا نہیں جلتا تھا، لوگوں نے پوچھا!

جب دو دو مہینے چولھا نہیں جلتا تھا تو آپ لوگ کھاتے کیا تھے؟ حضرت عائشہؓ نے فرمایا: کھجوریں اور دودھ! کھجوریں کھالیں اور پانی پی لیا، یا بکریوں کا دودھ آ گیا تو وہ پی لیا، یہی دو چیزیں خوراک ہوتی تھیں اور دو دو مہینے اس طرح گزر جاتے تھے کہ گھر میں پکانے کے لئے نہ گوشت ہوتا تھا نہ سبزی نہ آٹا، حضور ﷺ اس حال میں رہے مگر اس حال میں بھی آپ کو کبھی پریشانی نہیں ہوئی۔

غزوۂ خندق میں جب خندق کھودی جا رہی تھی تو صحابہ کا بھوک سے یہ حال تھا کہ انہوں نے پیٹ پر پتھر باندھ رکھے تھے، جب بھوک بڑھ جاتی ہے تو پیٹ میں گڑھا پڑ جاتا ہے اور مشقت کا کام کرنا ہو تو عرب میں ایک خاص قسم کا پتھر ہوتا تھا جس کو پیٹ پر رکھ کر کپڑا کس کر باندھ دیتے تھے جس سے وہ گڑھا ابھر جاتا تھا اور مشقت کا کام کرنے میں دشواری نہیں ہوتی تھی صحابہ سے جب بھوک برداشت نہ ہوئی تو وہ حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا: یا رسول اللہ ﷺ! بھوک سے ہمارا برا حال ہے، اور سب نے کپڑے اٹھا کر اپنے پیٹ دکھائے، سب کے پیٹ پر پتھر بندھے ہوئے تھے، حضور ﷺ کے پاس کونسا کھانا تھا جو آپ سب کو کھلا کر پیٹ بھر دیتے؟ حضورؐ نے بھی کپڑا اٹھایا اور اپنا پیٹ دکھایا، لوگوں نے دیکھا کہ حضورؐ کے پیٹ پر دو پتھر بندھے ہوئے ہیں، یعنی صحابہ جتنے بھوکے تھے حضورؐ ان سے زیادہ بھوکے تھے، جب صحابہ نے یہ منظر دیکھا تو ڈھارس بندھ گئی اور ہمت آ گئی کہ حضورؐ جو ہم سے زیادہ بھوکے ہیں وہ پھاوڑا اور کدال لے کر مٹی کھود رہے ہیں اور مٹی ڈھو کر خندق سے باہر لے جا رہے ہیں پھر ہم بھوک میں کام کیوں نہیں کر سکتے، جا کر سارے کام میں لگ گئے۔

یہ سارا منظر حضرت جابر بن عبداللہؓ نے دیکھا تو ان سے برداشت نہ ہوا، وہ رخصت لے کر گھر گئے اور جا کر بیوی سے پوچھا کہ گھر میں کھانے کے لئے کچھ ہے؟ بیوی نے کہا: تین کلو جو ہیں! حضرت جابرؓ نے کہا: جلدی سے چکی پر بیٹھ جاؤ اور ان کو پیسو! گھر میں بکری کا ایک بچہ تھا، حضرت جابرؓ نے اس کو ذبح کیا اور صاف کر کے گھر والوں کو دیا اور کہا کہ کھانا تیار کرو، میں حضور ﷺ کو بلا کر لاتا ہوں۔

جب حضرت جابرؓ چلے تو بیوی نے کہا دیکھو حضورؐ کو دعوت دینے جا رہے ہو مجھے رسوا

مت کرنا، یعنی اتنے مہمان نہ بلا لانا کہ کھانا کم پڑ جائے، حضرت جابرؓ نے کہا: ٹھیک ہے اور انہوں نے جا کر حضورؐ کے کان میں کہا یا رسول اللہ! میں نے بکری کا ایک بچہ ذبح کیا ہے اور تین کلو جو ہیں ان کو پیسوا کر آیا ہوں لہٰذا آپ اور دس آدمی آپ کے ساتھ جن کو آپ پسند کریں تشریف لے چلیں، یہ بات سنتے ہی حضور ﷺ نے اعلان کر دیا کہ لوگو! جابر کے یہاں دعوت ہے، سب جابر کے گھر پہنچو! پھر حضورؐ نے حضرت جابرؓ سے کہا کہ تم جلدی گھر پہنچو، ہم پیچھے آ رہے ہیں اور گھر جا کر ایک ہدایت تو یہ دو کہ جو گوشت کی ہانڈی پک رہی ہے وہ ہانڈی جب تک میں نہ آؤں چولھے پر سے نہ اتاری جائے اور دوسری ہدایت یہ دی کہ جب آٹا تیار ہو جائے تو روٹی پکانا شروع نہ کریں، خیر حضرت جابرؓ گھبرائے ہوئے جلدی جلدی گھر پہنچے اور بیوی سے کہا کہ حضورؐ نے تو ساری خندق میں اعلان کر دیا ہے اور سات سو آدمی کھانے کے لئے آ رہے ہیں، حضرت جابرؓ کی بیوی کا ایمان دیکھو، پہلے تو انہوں نے کہا تھا کہ اتنے مہمان نہ بلا لانا کہ گھر بدنام ہو جائے اور میں رسوا ہو جاؤں مگر اب کہا کہ کیا آپ نے حضور پاک کو بتا دیا تھا کہ کھانا کتنا ہے؟ حضرت جابرؓ نے کہا: ہاں بتا دیا تھا! اہلیہ کہنے لگیں: اب کوئی پریشانی کی بات نہیں، اب حضورؐ نے دعوت دی ہے تو وہ جانیں اور اللہ جانیں!

تھوڑی دیر میں سات سو آدمی گھر پہنچ گئے، کوئی ایک دن کا بھوکا تھا کوئی دو دن کا کوئی تین دن کا، حضور ﷺ جب تشریف لائے تو آپ نے اپنا لعاب ہانڈی میں ڈالا اور اس کو ڈھانک دیا، اور جو آٹا گوندھ کر تیار کیا گیا تھا اس میں بھی آپ نے لعاب ڈالا اور آٹے کو کپڑے سے ڈھک دیا اور فرمایا: محلّہ میں سے دس عورتوں کو روٹی پکانے کے لئے بلاؤ اور اس کپڑے کے نیچے ہاتھ ڈالو اور آٹا نکالو کپڑا مت ہٹانا، ہانڈی میں سے ذرا سا ڈھکنا ہٹاؤ اور سالن نکالو، پورا ڈھکنا مت کھولنا، چنانچہ دس عورتیں دس چولھوں پر روٹی پکانے کے لئے بیٹھ گئیں، روٹیاں پکتی رہیں اور سالن نکلتا رہا اور سات سو آدمی پیٹ بھر کر کھا کر چلے گئے، جب تمام لوگ کھا کر چلے گئے تو حضرت جابرؓ فرماتے ہیں: ہم نے کپڑا اٹھایا تو میں یہ نہیں بتا سکتا کہ پہلے آٹا زیادہ تھا یا اب، ہانڈی کھولی تو میں یہ نہیں بتا سکتا کہ پہلے سالن زیادہ تھا یا اب، اس واقعہ میں دیکھئے کہ حضور اور صحابہ پیٹ پر پتھر باندھے ہوئے خندق میں کام کر رہے ہیں

مگر انہیں غریبی اور بھوک سے کوئی پریشانی نہیں پس غریبی الگ مسئلہ ہے اور اس میں پریشان ہو جانا الگ مسئلہ ہے۔

مسلمان پریشان نہیں ہوتا اس کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ مسلمان مقروض نہیں ہوتا، ہوتا ہے! مگر اسے قرضے میں کوئی پریشانی نہیں ہوتی، حضور ﷺ جب دنیا سے تشریف لے گئے ہیں تو آپ پر ایک یہودی کا قرضہ تھا، اس سے حضور پاک ﷺ نے گھر کے خرچہ کے لئے جو خریدے تھے اور مقروض ہونے کی حالت میں حضور دنیا سے تشریف لے گئے، پھر حضور کے گھر والوں نے دکان کا قرضہ ادا کر کے آپ کی ذرہ چھڑائی، اس طرح صحابہ بھی بڑے بڑے قرضے چھوڑ کر گئے ہیں مگر انہیں قرضے میں کوئی پریشانی نہیں تھی، آج ہمارے ذمہ ہزار دس ہزار قرضہ آجائے تو اتنے پریشان ہو جاتے ہیں کہ کوئی حد نہیں، لیکن صحابہ پریشان نہیں ہوتے تھے، ایک صحابی ہیں: زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ، جب ان کا انتقال ہونے لگا تو انہوں نے اپنے بیٹے کو وصیت کی کہ بیٹا مجھ پر بہت قرضے ہیں، اور میں جانتا ہوں کہ تو وہ قرضے ادا نہیں کر سکتا لیکن میرے مرنے کے بعد تین سال تک اعلان کرنا اور کوئی بھی قرضہ مانگنے آئے اس سے تفصیل نہ پوچھنا ادا کر دینا، اور اگر کوئی بڑا قرضہ مانگنے کے لئے آئے جسے تو چکا نہ سکے تو دو رکعت نماز پڑھنا پھر دعا کرنا کہ اے زبیر کے رب! یہ قرضہ مانگنے والا آیا ہے، میرے بس میں قرضہ ادا کرنا نہیں آپ انتظام فرمادیں۔

اس طرح لاکھوں کا قرضہ چھوڑ کر جا رہے ہیں، پیچھے نہ کوئی کاروبار ہے نہ کوئی جائداد بس اللہ پر اعتماد ہے کہ میرا پروردگار میرا قرضہ ادا کر دے گا اور اللہ پاک نے ان کا قرضہ ادا بھی کر دیا، میں اس تفصیل میں نہیں جاتا کہ وہ کس طرح ادا ہوا۔

ان تمام مثالوں سے آپ سمجھ گئی ہونگی کہ مسلمان بیمار بھی ہوتا ہے، مقروض بھی ہوتا ہے، غریب بھی ہوتا ہے، مسلمان پر یہ سارے احوال آتے ہیں، یہ بات نہیں ہوتی کہ مسلمان ہونے کے بعد اس پر حالات نہیں آتے، سب حالات آئیں گے مگر کسی حال میں مسلمان پریشان نہیں ہوگا، آج مسلمانوں کی حالت یہ ہے کہ ہم ذرا ذرا سی بات پر بے حد پریشان ہو جاتے ہیں، یہ صورت حال اس وجہ سے ہے کہ ہم نے اسلام کی قدر

نہیں کی ، ہم مسلمان تو ہیں لیکن اسلام کی ،قرآن کی ،حدیث کی تعلیمات پر سو فیصد عمل کرنے والے نہیں۔

ہم ایسے دائرے میں ہیں جس کے چاروں طرف آگ ہے

سوال ہوتا ہے کہ ہم سو فیصد دین پر عمل کرنے والے کیوں نہیں رہے؟ ہمارے کچھ احوال ہی ایسے ہیں۔ہم ایسے ماحول میں رہ رہے ہیں جس کے چاروں طرف بے حیائیاں اور گناہ کے سامان ہیں، ایک آدمی جس کے چاروں طرف آگ لگی ہوئی ہو اور بیچ میں ایک گول دائرہ ہو جس میں آگ نہ ہو اور وہ آدمی اس دائرہ میں ہو اور کہتا ہو کہ میرے دائرہ میں آگ نہیں اس لئے مجھے کوئی فکر نہیں ،ٹھیک ہے تیرے دائرہ میں آگ نہیں لیکن تیرے چاروں طرف تو آگ لگی ہوئی ہے،اس دائرہ میں بیٹھ کر تو آگ کی مضرتوں سے بچ نہیں سکتا، اس آگ کا دھواں تجھے پہنچے گا،اس کی لپٹ تجھے پہنچے گی،اس کے شرارے تجھے پہنچیں گے، آگ کی ساری مصیبتیں تجھ کو پہنچیں گی ، میری بہنو اور بھائیو! ہمارے چاروں طرف آگ لگ رہی ہے جس نے ہمیں شریعت پر پورا عمل کرنے والا باقی نہیں رکھا،سب سے بڑی آگ ٹی وی ہے جس پر سینکڑوں چینل چلتے ہیں، یہ ہماری نگاہوں کے سامنے آگ کا وہ لاوا ہے جس کو ماں بیٹی ساتھ مل کر دیکھتے ہیں ، بھائی بہن ساتھ بیٹھ کر دیکھتے ہیں ،باپ بیٹی ساتھ بیٹھ کر دیکھتے ہیں،ماں بیٹا ساتھ بیٹھ کر دیکھتے ہیں، یہ سارے فحش مناظر ہمارے گھر کے سب افراد یکھتے ہیں پھر ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہماری زندگیوں میں پریشانیاں نہ آئیں، یہ کیسے ممکن ہے؟ پریشانیوں کا سامان تو ہم نے خود کر رکھا ہے۔

ہمارے گھروں میں روزا خبار آتا ہے اور کوئی بھی اخبار اٹھالو، چھوٹا یا بڑا گندی تصاویر اس میں ضرور ہونگی، ان گندی تصاویر کو گھر میں ہر ایک دیکھ رہا ہے پس گھر کے ماحول میں شرم وحیا کہاں رہے گی؟ بے حیائی اور بے شرمی پیدا ہونی ہی ہے، گھر سے باہر نکلے تو جگہ جگہ عورتوں کی ننگی تصویریں لگی ہیں اور عورتیں اس پر فخر کرتی ہیں کہ دیکھو ہماری تصویر کتنی شاندار ہے، جب چوبیس گھنٹے مردوں اور عورتوں کے سامنے یہ ننگی تصویریں آئیں گی تو وہ ان کے دماغوں میں بھر

جائیں گی، اب وہ نماز پڑھیں گے تو نماز کے اندر بھی دماغوں میں یہ تصویریں ہونگی، سوئیں گے تو بھی یہ دماغوں میں بھری ہوئی ہونگی، یہ سب مثالیں میں اس بات کی دے رہا ہوں کہ آدمی اپنے دائرہ کے اندر ہے جہاں آگ نہیں ہے، مگر چاروں طرف آگ لگی ہوئی ہے، یہ دائرہ مذہب اسلام کا ہے، اسلام حفاظت کا ایک دائرہ ہے مگر اس دائرہ کے چاروں طرف جو آگ لگی ہوئی ہے وہ ہماری پریشانیوں کا سبب ہے، ہماری ذاتی زندگی ہو یا اجتماعی، ہر لائن میں سب پریشان ہیں حالانکہ مسلمان تو امن واطمینان میں ہوتا ہے مگر ہمیں امن واطمینان نصیب نہیں کیونکہ ہم مسلمان تو ہیں یعنی ایک خاص دائرہ میں ہیں مگر اس دائرہ کے چاروں طرف فواحش ہیں، غداریاں ہیں، غیبتیں ہیں، حرص ہے، خودغرضیاں ہیں، بدنظریاں ہیں، ہمارے چاروں طرف پھیلی ہوئی ان مضرتوں نے ہمارے امن واطمینان کو غارت کر دیا ہے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کا علاج کیا ہے؟ ہم اپنی زندگیوں میں امن واطمینان کیسے لائیں؟

جواب: ہمیں باہر کی مضرتوں سے بچنے کے لئے دو کام کرنے ہونگے:

ایک: چاروں طرف جو بے حیائیاں ہیں ان کو دور ہٹائیں، جب تک ہم یہ بے حیائیاں دور نہیں ہٹائیں گے ہماری زندگیوں میں سکون اور چین نہیں آئے گا، ہمیں اسلام کی برکات نہیں ملیں گی۔

دوسرے: اللہ کے احکام کی تعمیل کریں، ہم اسلام کے جس دائرہ میں ہیں اس دائرہ میں اللہ کے کچھ احکام ہیں جو اللہ نے ہمیں دے رکھے ہیں، ان احکام کی تعمیل کی جائے، اگر ہم تعمیل نہیں کریں گے تو ہماری زندگیوں میں سکون واطمینان نہیں ہوگا، یہ اللہ کے احکام کی تعمیل نہ کرنے کا نتیجہ ہے کہ آج صورت حال یہ ہوگئی ہے کہ بیٹا باپ کو باپ نہیں سمجھتا، اور بیوی میاں کو میاں نہیں سمجھتی، مسلمانوں میں وہ گھرانے جہاں اسلامی قدریں ہیں وہ تو پھر بھی غنیمت ہیں لیکن جو گھر ماڈرن ہو گئے ہیں ان گھروں میں شوہر بیوی کو بیوی نہیں سمجھتا اور بیوی شوہر کو شوہر نہیں سمجھتی، نتیجہ یہ ہوا کہ بیٹے کے دل میں ماں باپ کا احترام نہیں رہا وہ ماں باپ کو ماں باپ نہیں سمجھتا۔

اللہ کی دو نعمتیں

میاں بیوی کے درمیان اللہ نے دو نعمتیں رکھی ہیں، ہمارے گھر ان دو نعمتوں سے محروم ہیں، وہ دو نعمتیں کیا ہیں؟ ﴿وَمِنْ آيَاتِهِ أَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِنْ أَنفُسِكُمْ أَزْوَاجًا لِتَسْكُنُوْا إِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَوَدَّةً وَرَحْمَةً﴾ ان دو نعمتوں میں سے ایک ہے: محبت، یعنی بیوی کو شوہر سے محبت ہو اور شوہر کو بیوی سے، اور دوسری نعمت ہے رحمت، یعنی بیوی شوہر پر مہربان ہو، اور شوہر بیوی پر، جیسے ماں اپنے بچوں پر مہربان ہوتی ہے، اللہ اپنے بندوں پر مہربان ہوتے ہیں، اسی طرح اللہ نے میاں بیوی کے درمیان بھی مہربانی رکھی ہے، ان دو نعمتوں کا نتیجہ یہ ہے کہ جب مرد دنیا کے کاروبار سے تھک کر پریشان ہو کر گھر پہنچتا ہے تو بیوی کو دیکھتے ہی اس کی ساری پریشانی دور ہو جاتی ہے، اللہ نے فرمایا: ﴿لِتَسْكُنُوْا إِلَيْهَا﴾: ہم نے تمہارے جوڑے اس لئے بنائے ہیں کہ تمہیں اپنے جوڑے کے پاس جا کر سکون ملے، عورت کو مرد سے اور مرد کو عورت سے سکون ملتا ہے، الحمد للہ آج بھی بہت سے گھر ہیں جن میں یہ نعمتیں ہیں مگر بہت سے گھر ایسے بھی ہیں جن میں یہ نعمتیں نہیں، وہ گھر زبردستی چل رہے ہیں، کہیں مرد بیوی کو دیکھ کر پریشان ہوتا ہے اور کہیں بیوی مرد کو دیکھ کر، یہ صورت حال ان نعمتوں کے ہمارے گھروں سے رخصت ہو جانے کی وجہ سے ہے اس لئے ہماری زندگیاں جنت کا نمونہ نہیں رہیں، جہنم کی بھٹی بن کر رہ گئی ہیں۔

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہمارے گھروں میں یہ نعمتیں کیوں نہیں رہیں؟ ان کے ختم ہونے کے کیا اسباب ہیں؟

جواب: ختم ہونے کے بہت سے اسباب ہیں، ان میں سے ایک سبب میاں بیوی کے دلوں میں ایک دوسرے کے احترام کا باقی نہ رہنا ہے، نہ بیوی کے دل میں شوہر کا احترام ہے نہ شوہر کے دل میں بیوی کی محبت ہے، ایک دوسرے کو بلائیں گے تو انگریزوں کے طریقے پر بلائیں گے، بیوی شوہر کو اس کا نام لے کر بلائے گی اور شوہر بیوی کو اس کا نام لے کر، یہ جو ایک دوسرے کو نام سے بلانا ہے یہ دلوں سے احترام ختم کرتا ہے اور پھر بلائیں گے بھی تو بے ادبی کے ساتھ، ایسی صورت میں احترام کہاں باقی رہے گا، اگر تھوڑا بہت ہوگا تو وہ بھی رخصت ہو

جائے گا۔

ایک دوسرے کو بلانے کا اسلامی طریقہ

حضور ﷺ کی بیویاں کبھی حضور کو نام لے کر نہیں بلاتی تھیں، یَامُحَمَّدُ کہہ کر نہیں بلاتی تھیں بلکہ یارسول اللہ کہہ کر بلاتی تھیں، صحابہ کرام میں بھی کنیتیں تھیں، جیسے ہندوستان میں آج بھی کنیتیں چلتی ہیں، لڑکا یا لڑکی کا نام لے کر پکارتے ہیں: فلاں کے ابا! فلاں کی امی! نام لے کر نہیں پکارتے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا حضور ﷺ کو یارسول اللہ کہتی تھیں مگر حضورؐ حضرت عائشہؓ کو کیا کہیں؟ ان کے تو کوئی بچہ نہیں تھا، چنانچہ حضورؐ نے فرمایا کہ تمہاری بڑی بہن کا جولڑکا ہے عبداللہ اس کے ذریعہ تم کنیت رکھ لو، چنانچہ حضرت عائشہؓ کی کنیت "عبداللہ کی ماں" تھی، میری بہنو! اگر زندگیوں کو خوش گوار بنانا چاہتی ہو تو یہ طریقہ آج سے شروع کردو، میاں بیوی کو نام لے کر نہ پکارے بلکہ بیوی کے لئے کوئی احترام والا لفظ استعمال کرے اور عورت شوہر کے لئے تعظیم والا لفظ استعمال کرے جب ایک دوسرے کے لئے احترام والا لفظ استعمال کریں گے تو دلوں میں محبت پیدا ہوگی۔

بے پردگی سے اسلام کی برکت ختم ہوتی ہے

محبت ختم کرنے والے اسباب میں سے ایک سبب بے پردگی ہے، یہ پردگی بھی ہماری زندگیوں کو برباد کرنے والی ہے، ہمارے معاشرہ کو خراب کرنے والی ہے، بے پردگی کے ساتھ آپ اسلام کی برکتیں حاصل نہیں کر سکتے، یہ تو کافروں کے معاشرہ کی چیز ہے، ہم اگر اپنی زندگیوں میں کافروں والی باتیں اپنائیں گے تو ہماری زندگیوں میں اسلام کی برکتیں کہاں سے آئیں گی؟ اسلام کی برکتیں اگر چاہتے ہو تو اللہ تعالی فرماتے ہیں: ﴿اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ﴾: اللہ کے ذکر سے دل مطمئن ہوتے ہیں یعنی قرآن کریم کی تعلیمات پر عمل کر کے دلوں کو امن وسکون اور اطمینان نصیب ہوتا ہے، لیکن اگر ہم خود ہی اپنی زندگیوں کو عذاب بنانا چاہیں، ہم ہی اپنی زندگیوں میں تلخیاں گھولنا چاہیں تو اس کا کوئی علاج اسلام کے پاس نہیں۔

خطبہ میں جو آیت پاک میں نے پڑھی تھی اب اس کا خلاصہ پیش کرتا ہوں، کوئی موقع آئے گا تو انشاء اللہ اس کی تفصیل بھی کروں گا، اس آیت میں اللہ پاک نے یہ ارشاد فرمایا ہے کہ جو مرد اور جو عورتیں دس کام کریں گے مرنے کے بعد آخرت میں اللہ تعالی نے ان کے لئے دو چیزیں تیار کر رکھی ہیں ایک بخشش، یعنی اللہ تعالی ان کے تمام گناہوں پر معافی کا قلم پھیر دیں گے، دوسرے: اجر، یعنی دنیا میں جو نیک کام انہوں نے کئے ہیں اس کا بہت بڑا بدلہ اللہ تعالی عنایت فرمائیں گے۔ وہ دس کام کیا ہیں؟

۱- ﴿إِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمَاتِ﴾: اسلام کے کام کرنے والے مرد اور اسلام کے کام کرنے والی عورتیں، پہلی چیز ہے اعمال اسلام کرنا، اعمال اسلام پانچ ہیں، پہلا عمل ہے: زبان سے کلمہ طیبہ پڑھنا، دوسرا: پانچ وقت کی نمازیں پابندی سے پڑھنا، تیسرا: اللہ نے جو مال دیا ہے اس کا حساب کر کے پوری زکوۃ دینا، چوتھے: رمضان کے روزے رکھنا، پانچویں: اللہ نے اگر پیسہ دیا ہے اور حج کر سکتی ہے تو حج کرنا، یہ پانچ کام اسلامی اعمال ہیں، ہر مسلمان کے لئے یہ کام ضروری ہیں۔

۲- ﴿وَالْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ﴾: ایمان لانے والے مرد اور ایمان لانے والی عورتیں ایمان نام ہے عقیدوں کا جن کے ماننے سے آدمی مؤمن قرار دیا جاتا ہے، اگر اس کے عقیدے صحیح ہیں تو وہ پکا سچا مسلمان ہے اور اگر عقیدے گڑبڑ ہیں تو اس کا ایمان گڑبڑ ہے۔

۳- ﴿وَالْقَانِتِيْنَ وَالْقَانِتَاتِ﴾: فرماں بردار مرد اور فرماں بردار عورتیں، فرماں بردار کے معنی ہیں اللہ کے احکام کی تعمیل کرنے والا۔

۴- ﴿وَالصَّادِقِيْنَ وَالصَّادِقَاتِ﴾: سچے مرد اور سچی عورتیں، یعنی جو کبھی جھوٹ نہیں بولتے، نہ صرف جھوٹ نہیں بولتے بلکہ معاشرہ میں جس کو جھوٹ نہیں سمجھا جاتا وہ بھی نہیں بولتے، جیسے مٹھی میں کچھ نہیں اور بچہ کو جھوٹ موٹ ٹوفی کے بہانے بلا رہی ہے ایسا بھی یہ لوگ نہیں کرتے۔

۵- ﴿وَالصَّابِرِيْنَ وَالصَّابِرَاتِ﴾: صبر کرنے والے مرد اور صبر کرنے والی عورتیں، جب بھی کوئی پریشانی یا مصیبت پیش آتی ہے تو بے قابو نہیں ہوتے، اللہ پر اعتماد اور بھروسہ

رکھتے ہیں کہ جس اللہ نے اس پریشانی کو بھیجا ہے وہ اس کو دور بھی کرسکتا ہے۔

۶-﴿وَالْخَاشِعِيْنَ وَالْخَاشِعَاتِ﴾: اللہ سے ڈرنے والے مرد اور اللہ سے ڈرنے والی عورتیں، اللہ سے ڈرنے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی نافرمانی سے ڈرتے ہیں۔

۷-﴿وَالْمُتَصَدِّقِيْنَ وَالْمُتَصَدِّقَاتِ﴾: اللہ کے راستہ میں خیرات کرنے والے مرد اور خیرات کرنے والی عورتیں، زکوۃ دینا بھی خیرات ہے، صدقۂ فطر دینا بھی خیرات ہے، نفلی خیرات بھی خیرات ہے، سب اس آیت کریمہ کے تحت ہیں۔

۸-﴿وَالصَّائِمِيْنَ وَالصَّائِمَاتِ﴾: روزہ رکھنے والے مرد اور روزہ رکھنے والی عورتیں، فرض روزے اور نفل روزے سب اس میں شامل ہیں، مگر عورتوں کے لئے مسئلہ یہ ہے کہ اگر شوہر گھر پر موجود ہو، سفر میں گیا ہوا نہ تو عورت نفل روزہ شوہر کی اجازت سے رکھے، چاہے صراحۃً اجازت ہو یا دلالۃً۔

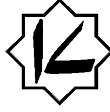
۹-﴿وَالْحَافِظِيْنَ فُرُوْجَهُمْ وَالْحَافِظَاتِ﴾: اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والے مرد اور حفاظت کرنے والی عورتیں۔ یہی وہ چیز ہے جس سے مرد اور عورت کا دل بے غبار رہتا ہے۔

۱۰-﴿وَالذَّاكِرِيْنَ اللّٰهَ كَثِيْرًا وَالذَّاكِرَاتِ﴾: بہت زیادہ اللہ کو یاد کرنے والے مرد اور بہت زیادہ اللہ کو یاد کرنے والی عورتیں،

یہ دس باتیں جن میں پائی جاتی ہیں ان کے لئے اللہ نے آخرت میں دو چیزیں تیار کر رکھی ہیں: ایک: بخشش اور معافی، دوسرے: دنیا میں جو نیک کام کئے ہیں اس کا بہت بڑا بدلہ اور اجر: ﴿أَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ مَغْفِرَةً وَأَجْرًا عَظِيْمًا﴾

میری بہنو! یہ دس کام جو اس آیت میں بیان کئے گئے ہیں ان کو ذہن میں رکھ کر ان پر عمل کرنے کی کوشش کرو، انشاء اللہ دنیا میں چین وسکون ملے گا اور آخرت میں سدا بہار نعمتیں ملیں گی، اللہ تعالی ہم سب کو اعمال اسلام پر مضبوط فرمائیں، ہماری زندگیوں کو راحت وسکون والی زندگیاں بنائیں، آمین یارب العالمین۔

وآخر دعوانا أن الحمد للہ رب العالمین



مودودی جماعت کی پانچ گمراہیاں

خطبہ مسنونہ کے بعد: ﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝ صِرَاطَ الَّذِيْنَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۝ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّيْنَ ۝﴾

بزرگو اور بھائیو! آج میں چاہتا ہوں کہ آپ کو جناب سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب اور ان کی جماعت: جماعت اسلامی کی حقیقت سمجھاؤں، لوگ عام طور پر اس سے واقف نہیں، اور ہر ایک کے بس میں اسے سمجھانا بھی نہیں، اس لئے آج کی آخری مجلس میں [1] اس موضوع پر مختصر کلام کرنا چاہتا ہوں، لیکن جو باتیں بیان کروں گا وہ بنیادیں باتیں ہونگی اس لئے آپ ان کو بغور سنیں، جس کی سمجھ میں آئے وہ قبول کرے، نہ سمجھ میں آئے تو اس دنیا میں کسی کو مجبور نہیں کیا جاسکتا۔

مودودی جماعت کی بنیادی گمراہیاں پانچ ہیں:

۱- صحابہ معیارِ حق نہیں

سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب ہماری جماعت کے ایک فرد تھے شروع میں ہمارے سارے آدمی ان کے ساتھ تھے۔ پھر ہمارا اور ان کا اختلاف کہاں سے شروع ہوا اس کو سمجھنا ہے۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب باقاعدہ دین پڑھے ہوئے نہیں تھے، انگریزی بھی انھوں

(۱) نیویارک کی ایک بڑی مسجد میں حضرت والا کا دس دن کا پروگرام تھا، روزانہ عشاء کے بعد بیان ہوتا تھا، بیان کے بعد سوال وجواب کا سلسلہ چلتا تھا، لوگ بار بار جماعت اسلامی کے بارے میں دریافت کرتے تھے، حضرت جواب دیتے تھے کہ یہ تفصیلی موضوع ہے، کسی وقت سمجھاؤں گا، چنانچہ آخری دن اسی موضوع پر تقریر فرمائی ہے ۱۲

نے باقاعدہ نہیں پڑھی تھی، لیکن غضب کے ذہین تھے، انھوں نے اپنی محنت سے انگریزی بھی سیکھی، عربی بھی سیکھی، اور شروع میں جمعیۃ علماء ہند کے اخبار الجمعیۃ کے ایڈیٹر رہے، اس زمانہ میں جمعیۃ کے صدر مفتی کفایت اللہ صاحب ؒ تھے، کہتے ہیں: انھوں نے مفتی صاحب سے بھی استفادہ کیا ہے، ایڈیٹری کے زمانہ میں انھوں نے الجہاد فی الاسلام لکھی، اور سب لوگوں نے اسے بہت پسند کیا، پھر وہ الجمعیۃ کی ایڈیٹری چھوڑ کر حیدرآباد چلے گئے اور وہاں جا کر انھوں نے ترجمان القرآن کے نام سے ماہانہ رسالہ نکالا اور اس میں مضامین لکھنے شروع کئے۔ یہ زمانہ وہ تھا جب ہندوستان میں آزادی کی تحریک زوروں پر چل رہی تھی، چنانچہ مودودی صاحب نے بھی آزادی کے موضوع پر زوردار تحریریں لکھیں اور دوسرے بڑے علماء جیسے مولانا علی میاں ندوی، مولانا منظور نعمانی، مولانا امین احسن اصلاحی اور مولانا بختیاری مدارسی وغیرہ حضرات بھی ان کے رسالہ میں تحریریں لکھ رہے تھے، پھر ایک وقت آیا کہ انھوں نے طے کیا کہ مجھے اپنی ایک علاحدہ جماعت بنانی ہے، اور اس سلسلے میں پہلا اجلاس انھوں نے دہلی میں بلایا، اس اجتماع میں ہمارے علماء مولانا منظور نعمانی، مولانا علی میاں ندوی، مولانا بختیاری اور مولانا امین احسن اصلاحی وغیرہ شریک ہوئے، اس اجلاس میں مودودی صاحب نے اپنی جماعت کی تشکیل کی اور اس کا دستور اساسی پیش کیا۔ جس کی پہلی دفعہ تھی: اس جماعت کا نام 'جماعت اسلامی' ہوگا، سب سے پہلے اس پر مناقشہ ہوا کہ جماعتِ اسلامی کا کیا مطلب؟ اس جماعت میں جو نہیں ہے کیا وہ مسلمان نہیں ہے؟ مولانا مودودی صاحب نے اس کی وضاحت کی کہ نہیں یہ مطلب نہیں، یہ تو بس ایک رمزی نام ہے۔ بہرحال اس پہلی دفعہ پر اختلاف ہوا مگر کوئی زیادہ اختلاف نہیں ہوا۔ دوسری دفعہ آئی: اس میں یہ تھا کہ جو بھی اس جماعت میں شامل ہوگا وہ اللہ اور اس کے رسول کے علاوہ کسی کی ذہنی غلامی نہیں کرے گا۔ یہ لفظ ذہنی غلامی مہمل تھا، اللہ اور اس کے رسول کے احکام کی اطاعت کے لئے لفظ ذہنی غلامی استعمال نہیں کرنا چاہئے تھا، لیکن چلو، جب یہ دوسری دفعہ پیش ہوئی تو اس پر سخت اختلاف ہوا، لوگوں نے پوچھا: صحابہ کے بارے میں کیا کہتے ہو؟ کیا صحابہ کا اجماع حجت ہے یا نہیں؟ یہ مسئلہ سب سے پہلے کھڑا ہوا اور لمبی بحثیں ہوئیں، ان بحثوں کے بعد یہ سب

اکابر ان سے الگ ہوگئے اور سب سے پہلے دارالعلوم دیوبند کے اس وقت کے شیخ الحدیث حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی رحمہ اللہ نے اس جماعت کی گرفت کی کہ صحابہ کے بارے میں اپنی پوزیشن واضح کرو، ان کا اجماع حجت ہے یا نہیں؟ یہ دفعہ آج تک ان کے دستور میں چلی آرہی ہے مگر آج تک انھوں نے صحابہ کے بارے میں اپنی پوزیشن واضح نہیں کی۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم صحابہ پر کہاں تنقید کرتے ہیں؟ اکابر نے کہا کہ تم کیچڑ اچھالتے ہو یا نہیں، تنقید کرتے ہو یا نہیں، یہ تو بعد کی بات ہے پہلے یہ بتاؤ کہ صحابہ کا اجماع حجت ہے یا نہیں؟ آج تک انھوں نے نہ ہاں کی نہ نا! یہی وہ معرکۃ الآراء بحث ہے کہ صحابہ معیار حق ہیں یا نہیں؟ اگر وہ صحابہ کو حجت مانتے ہیں تو ان کو دستور میں ایک جملہ بڑھا دینے میں کیا پریشانی تھی، مگر انھوں نے آج تک نہیں بڑھایا۔ اس دن سے ہمارا اور ان کا اختلاف شروع ہوا اور وہ اہل السنۃ والجماعۃ سے نکل گئے کیونکہ وہ جماعۃ یعنی صحابہ کے اجماع کو حجت نہیں مانتے، لہٰذا ان کا اور ہمارا اختلاف ﴿صِرَاطَ الَّذِيْنَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ﴾ سے شروع ہوا، ہمارا راستہ ان لوگوں کا راستہ ہے جن پر اللہ نے انعام فرمایا ہے، اور اس کے سب سے پہلے مصداق صحابہ کرام ہیں، انہی کا راستہ ہم نے اختیار کیا ہے، جماعتِ اسلامی والوں نے ان کا راستہ اختیار نہیں کیا۔ ایک اختلاف تو ہمارا اور ان کا یہ ہوا کہ وہ صحابہ کے اجماع کو حجت نہیں مانتے اور ہم مانتے ہیں، اس لئے وہ الجماعۃ میں نہیں رہے۔ یہ ایک بات ہی ان کی گمراہی کے لئے کافی ہے۔

۲- دین کا 'کیلا' حکومت الٰہیہ قائم کرنا ہے

اسلام کی تعلیمات بہت پھیلی ہوئی ہے، سارا قرآن بھرا پڑا ہے، ساری حدیثیں بھری پڑی ہیں، ان دونوں کی تفصیلات سے ساری فقہ بھری پڑی ہے، مگر قطب الرحی بتاؤ کیا ہے؟ قطب الرحی: چکی کا کیلا جس پر چکی کا اوپر کا پاٹ گھومتا ہے۔ اسلام کا قطب الرحی کیا ہے؟ نبی پاک ﷺ کے زمانہ سے آج تک پوری امت نے یہ سمجھتی آئی ہے کہ وہ قطب الرحی: رضوان من اللہ: ہے یعنی اللہ کی خوشنودی حاصل کرنا۔ قرآنِ کریم میں ہے ﴿وَعَدَ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ

وَالْمُؤْمِنَاتِ جَنَّاتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِیْنَ فِیْهَا وَمَسَاکِنَ طَیِّبَةً فِیْ جَنّٰتِ عَدْنٍ، وَرِضْوَانٌ مِنَ اللّٰهِ أَکْبَرُ، ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ﴾(التوبہ:۷۲): اللہ نے مؤمن مردوں اور مؤمن عورتوں سے وعدہ کیا ہے ایسے باغات کا جن کے نیچے نہریں بہ رہی ہیں، وہ ان باغات میں ہمیشہ رہیں گے، اور اللہ نے ان سے ہمیشہ رہنے کے باغوں میں ستھرے گھروں کا وعدہ کیا ہے، اور اللہ کی خوشنودی ان سب نعمتوں سے بڑی نعمت ہے ﴿وَرِضْوَانٌ مِنَ اللّٰهِ أَکْبَرُ﴾: سب نعمتوں سے بڑھ کر اللہ کی خوشنودی ہے۔ سورۂ یونس میں ہے: ﴿لِلَّذِیْنَ أَحْسَنُوْا الْحُسْنٰی وَزِیَادَةٌ﴾(آیت:۲۶) جن لوگوں نے اچھے کام کئے ہیں، ان کے لئے اچھا گھر ہے اور کچھ مزید بھی ہے۔ جنت اور اس کی ساری نعمتیں تو مل گئیں، مزید کیا ہے؟ حدیث شریف میں اس کی وضاحت آئی ہے کہ جب سب جنتی جنت میں پہنچ جائیں گے تو اللہ تعالیٰ جنتیوں سے خطاب فرمائیں گے کہ میرے بندو! تمہیں جو نعمتیں میں نے عطا کی ہیں کیا تم ان پر خوش ہو؟ سب جنتی کہیں گے کہ پروردگار عالم! ہم خوش ہیں، اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ میں نے تمہارے لئے ایک نعمت چھپا رکھی ہے، ابھی میں نے تمہیں وہ نعمت نہیں دی، جنتی سوچیں گے کہ ساری نعمتیں تو ہمیں میسر ہیں پھر وہ کونسی نعمت باقی ہے جو اللہ نے ابھی تک نہیں دی، تو جنتی عرض کریں گے کہ پروردگار عالم! وہ نعمت کونسی ہے؟ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ وہ نعمت یہ ہے کہ میں آج اعلان کرتا ہوں کہ تمام جنتیوں سے میں خوش ہو گیا ایسا خوش ہونا کہ اب میں کبھی تم سے ناراض نہیں ہونگا، حدیث شریف میں ہے جب یہ اعلان ہوگا تو مؤمنین کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہے گا، اللہ کی خوشنودی کے سامنے جنت کی تمام نعمتوں کو وہ ہیچ تصور کریں گے۔ معلوم ہوا کہ سب سے بڑی نعمت اللہ کی رضامندی ہے، آپ نے نماز پڑھی اور اللہ راضی ہوئے تو آپ کی نماز کا فائدہ ہے اور اگر آپ نے نماز پڑھی اور اس میں دکھلاوا کیا، اور دنیا نے دیکھ لیا، سن لیا، مگر اللہ راضی نہیں ہوئے تو وہ نماز نمازی کے منہ پر ماردی جائے گی، یہی حال زکوٰۃ کا ہے، یہی حال روزہ کا ہے، یہی حال حج کا ہے، یہی حال تمام بندگیوں کا ہے کہ اگر ہماری بندگیوں سے اللہ تعالیٰ راضی ہو گئے تو ہم کامیاب ہیں اور اگر اللہ کو خوش نہیں کر سکے تو ہمارے لئے کامیابی نہیں۔ بہرحال پوری امت حضور ﷺ

کے زمانہ سے آج تک یہ سمجھتی آرہی ہے کہ اسلام کی چکی کا کیلا جس پر تمام احکام گھوم رہے ہیں ﴿رِضْوَانٌ مِنَ اللّٰهِ﴾ ہے یعنی اللہ کی خوشنودی حاصل کرنا ہے۔ اب مودودی صاحب آئے، انھوں نے وہ کیلا نکال دیا اور ایک نیا کیلا فٹ کیا۔ وہ نیا کیلا کیا ہے؟ اقامتِ دین۔ یہ تو ان کی خوبصورت تعبیر ہے، مگر اقامتِ دین کا مطلب اپنے اندر دین قائم کرنا یا دین پر عمل کرنے کا جذبہ پیدا کرنا نہیں ہے، اقامت دین کا مطلب ہے دنیا میں خلافت الٰہیہ قائم کرنا یہ انھوں نے نیا کیلا چڑھایا اور سارے احکام اس پر گھما دیئے، چنانچہ انھوں نے کہا یہ جو جماعت کی نماز ہے وہ فوجی پریڈ ہے۔ اللہ کی خوشنودی والی بات گئی، نماز فوجی پریڈ بن گئی۔ زکوٰۃ قومی فنڈ ہے، اسی لئے وہ زکوٰۃ کو ہر کام میں استعمال کرتے ہیں کیونکہ فنڈ تو ہر چیز میں استعمال ہوتا ہے جیسے گورنمنٹ کا فنڈ ہر چیز میں استعمال ہوتا ہے۔ روزہ فوج کی بھوکے رہنے کی ریہرسل ہے اور حج انٹرنیشنل کانفرنس ہے۔ یہ سب تعبیریں انھیں کی چھوٹی بڑی کتابوں میں موجود ہیں۔ ہر چیز میں سے انھوں نے اللہ کو خوش کرنے کی بات نکال دی اور حکومت الٰہیہ قائم کرنے کی بات شامل کردی۔

کیا حکومت الٰہیہ قائم کرنا فرض نہیں؟

ایک سوال: کیا حکومتِ الٰہیہ قائم کرنے کا اللہ نے حکم نہیں دیا؟ بیشک دیا ہے، حکومت الٰہیہ قائم کرنا فرض ہے مگر وہ اسلام کی جڑ نہیں بلکہ وہ اسلام کے درخت کی ایک شاخ ہے، جیسے نماز احکام اسلام کی ایک شاخ ہے، زکوٰۃ، روزہ، حج، تلاوت قرآن وغیرہ بے شمار شاخیں ہیں۔ حدیث شریف میں ہے: الإيمان بضع وسبعون شعبة: ایمان کی ستر سے زیادہ شاخیں ہیں، ان شاخوں میں سے ایک شاخ حکومت الٰہیہ قائم کرنا بھی ہے، جہاں حالات سازگار ہوں، حکومت الٰہیہ قائم کی جاسکتی ہو، وہاں مسلمانوں پر فرض ہے کہ حکومت الٰہیہ قائم کریں، لیکن وہ دین کی بنیاد نہیں۔ مگر مودودی صاحب نے اس شاخ کو کاٹ کر اسلام کے درخت کی جڑ اور تنا بنا دیا اور سارے احکام اسلامی اس تنے پر گھما دیئے، انھوں نے کسی کتاب میں یہ جملہ لکھا ہے کہ وہ انبیاء جو پوری زندگی دین کی محنتیں کرتے رہے اور دنیا میں حکومت

الٰہیہ قائم نہ کر سکے وہ دنیا سے اپنے مشن میں نا کام گئے۔ توبہ! کم وبیش ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء آئے ہیں ان میں سے کتنوں نے حکومت الٰہیہ قائم کی ہے؟ پانچ دس کی مثال آپ دے سکتے ہیں، باقی تو دین کی محنتیں کرتے کرتے چلے گئے، ان کے لئے حالات ساز گار نہیں ہوئے، حکومتِ الٰہیہ قائم کرنے کے مواقع میسر نہیں آئے تو کیا وہ انبیاء دنیا سے نا کام گئے؟ بات دراصل یہ ہے کہ جب کیلا انھوں نے حکومتِ الٰہیہ قائم کرنا کر دیا تو اب جو زندگی بھر محنتیں کر کے بھی حکومت الٰہیہ قائم نہ کر سکا وہ تو نا کام ہی نظر آئے گا! اور لطف کی بات یہ ہے کہ خود مودودی صاحب بھی نا کام گئے، وہ بھی اپنی زندگی میں حکومتِ الٰہیہ قائم نہ کر سکے حتی کہ زندگی بھر عورت کی امارت کی تردید کرتے رہے اور آخر میں فاطمہ جناح کی تائید کی مگر اس کو جتوا نہ سکے اور خود بھی حکومت الٰہیہ قائم کئے بغیر اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔

حکومتِ الٰہیہ قائم کرنے کی فکر ہے مگر
اپنے اندر دین قائم کرنے کی فکر نہیں

آج جماعت اسلامی میں جو لوگ ہیں ان کی زندگی پر سرسری نظر ڈالیں تو آپ پائیں گے کہ ان کو نمازوں سے کوئی دلچسپی نہیں، روزوں سے کوئی دلچسپی نہیں، ان کا لباس اسلامی نہیں، ان کے چہرے اسلامی نہیں، البتہ صبح سے شام تک سیاسی سرگرمیوں کے لئے دوڑ دھوپ کریں گے مگر نماز کا وقت آئے گا تو مسجد میں نظر نہیں آئیں گے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے بڑے حضرت نے اسلام کی چکی کا کیلا ہی بدل دیا ہے، حضور ﷺ کے زمانہ سے آج تک پوری امت یہی سمجھتی آئی ہے کہ اسلام کا کیلا رضوان من اللہ ہے، اگر آپ کی عبادتوں سے، آپ کے معاملات سے، آپ کی معاشرت واخلاق سے اللہ خوش ہیں تو آپ کامیاب ہیں اور جہاں حالات ساز گار ہوں وہاں حکومت الٰہیہ قائم کرنا بھی مسلمانوں پر فرض ہے اس کا ہمیں انکار نہیں، اسی لئے جب انھوں نے الجہاد فی الاسلام لکھی تو ہمارے اکابر نے منہ بھر کر اس کی تعریف کی۔ پس یہ بات اچھی طرح ذہن میں بٹھا لیجئے کہ خلافتِ الٰہیہ قائم کرنا وہاں فرض ہے جہاں حالات ساز گار ہوں، حضور ﷺ مکہ معظّمہ میں تیرہ سال رہے،

کوئی خلافتِ الٰہیہ قائم نہیں کی، مدینہ منورہ آنے کے بعد جب ایک اجتماعیت اور مرکزیت حاصل ہوئی تو پھر آہستہ آہستہ حکومت قائم ہونی شروع ہوئی۔ الغرض دوسری بات سمجھنے کی یہ ہے کہ سارے مودودی لیٹریچر کا خلاصہ حکومتِ الٰہیہ کا قیام ہے، اللہ کی خوشنودی کا ان کے یہاں کوئی تصور نہیں۔

۳-تصوف چنیا بیگم ہے

دین تین چیزوں کا نام ہے، اور تینوں میں چولی دامن کا ساتھ ہے، چولی کے بغیر دامن نہیں ہوسکتا اور دامن کے بغیر چولی بے معنی ہے۔ وہ تین چیزیں کیا ہیں؟ ایک مرتبہ نبی پاک ﷺ صحابہ کے ایک مجمع میں تشریف فرما تھے اور مجلس چل رہی تھی کہ اچانک کوئی صاحب مسجد میں داخل ہوئے، نہایت اجلے کپڑے پہنے ہوئے، بال کالے، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ابھی نہا کر آرہے ہیں، مجمع چیرتے ہوئے آگے بڑھے اور حضور ﷺ کے گھٹنوں سے گھٹنے ملا کر بیٹھے اور سوال کرنے شروع کئے: ما الإیمان؟ ایمان کیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا: چھ چیزوں کو دل سے قبول کرنے کا نام ایمان ہے، یہ باتیں ایمان مفصل میں لی گئی ہیں۔ انھوں نے دوسرا سوال کیا: ما الإسلام؟ اسلام کیا ہے؟ حضور ﷺ نے فرمایا: پانچ اعمال کا نام اسلام ہے۔ تیسرا سوال کیا: ما الإحسان؟ نکوکردن کیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا: اللہ کو دیکھتے ہوئے عبادت کرو، اور اگر تم اللہ کو نہیں دیکھ رہے تو اللہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔ بس یہ مؤمن کی زندگی کا خلاصہ ہے اور انہی تین چیزوں کا مجموعہ دین کہلاتا ہے اور ان کے درمیان چولی دامن کا ساتھ ہے، ایک دوسرے سے الگ نہیں ہوسکتے، اسی ایمان کو مدرسوں میں علم کلام کے نام سے پڑھایا جاتا ہے، اور اسلام کو فقہ کے نام سے پڑھایا جاتا ہے، اور احسان: تصوف کا نام ہے اور تصوف تصحیح نیت کا نام ہے اور یہی احسان یا تصوف ایمان (عقائد) اور اسلام (اعمال) کی جان ہے، اگر عقائد میں نیت صحیح نہ رہے تو وہ نفاق اعتقادی ہے، اعمال میں نیت صحیح نہ رہے تو وہ شرک خفی ہے، الغرض یہ تینوں چیزیں لازم ملزوم ہیں۔ اب مودودی صاحب آئے، انھوں نے ایمان واسلام کو تو مان لیا مگر تصوف کے بارے میں کہا کہ یہ چنیا بیگم ہے، افیم ہے، جس

چیز کو اللہ کے رسول نے ایمان واسلام کے ساتھ لازم ملزوم کر کے بیان کیا ہے اس کو جناب عالی نے چنیا بیگم قرار دیدیا۔ اور یہ نظریہ صرف انہی کا نہیں، غیر مقلد بھی یہی کہتے ہیں کہ تصوف ایک بھوت ہے جو لوگوں پر چڑھ جاتا ہے۔ اللہ غنی! قرآنِ کریم میں جس کے تذکرے ہیں، حدیثوں میں جس کے تذکرے ہیں وہ چنیا بیگم اور بھوت قرار دیدیا گیا۔ حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ جن کو یہ غیر مقلد اور مودودی بھی بڑا مانتے ہیں، انھوں نے حجۃ اللہ البالغہ میں احسان پر اتنا لمبا باب باندھا ہے کہ اس کی شرح رحمۃ اللہ الواسعہ میں تین سو صفحے میں آئی ہے۔ بہر حال اس جماعت کی تیسری گمراہی یہ ہے کہ احسان اور تصوف کو نہیں مانتے، اس کو چنیا بیگم (افیم) قرار دیتے ہیں۔ پس جس چیز کا قرآن وحدیث میں اتنا صاف تذکرہ آیا ہے اس کا اگر کوئی انکار کرے تو وہ اہل حق میں سے کیسے ہوگا؟

۴- دین ہم خود سمجھیں گے!

قرآن میں حضور ﷺ کے بارے میں آیا ہے: ﴿وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ ﴾ حضور ﷺ صحابہ کو قرآن وحدیث سکھلاتے ہیں، قرآن وحدیث کا نام ہی دین ہے، صحابہ نے قرآن وحدیث تابعین کو سکھایا، تابعین نے تبع تابعین کو، اس طرح دین سیکھنے کا سلسلہ چلتے چلتے ہم تک پہنچا۔ مودودی صاحب نے اسلاف سے دین فہمی کا یہ سلسلہ کاٹ دیا اور کہا کہ دین سمجھنے کے لئے اسلاف سے تعلق قائم کرنے کی ضرورت نہیں، دین ہم خود سمجھیں گے، قرآن وحدیث ہم خود سمجھیں گے، وہ ماڈرن اسلام کے داعی ہیں، تیرہ سو سال سے اسلاف نے دین کو جس طریقہ پر سمجھا ہے وہ اولڈ اسلام ہے اور ماڈرن اسلام کہاں سے آئے گا؟ اس کا ایک ہی راستہ ہے کہ قرآن وحدیث کو سمجھنے کا اسلاف سے جو طریقہ چلا آرہا ہے ہم اسے نہ لیں بلکہ ہم قرآن وحدیث کو خود سمجھیں۔ یہ سب سے بڑی گمراہی ہے، اس سے بڑی گمراہی کوئی نہیں ہوسکتی۔ میرے بھائیو! قرآن وحدیث ماڈرن ہیں یا اولڈ؟ اولڈ ہیں، آج بھی مسلمانوں کے ایک ہاتھ میں قرآن ہے اور ایک ہاتھ میں حدیث ہے، ان دونوں کے ہوتے ہوئے ماڈرن اسلام کہاں سے آئے گا؟ ہاں اگر ماڈرن قرآن لائیں، ماڈرن حدیثیں

لائیں تو ماڈرن اسلام بھی آسکتا ہے، لیکن یہ قرآن وحدیث تو چودہ سو سال پرانے ہیں ان میں سے مارڈن اسلام کیسے نکلے گا؟! ان میں سے ماڈرن اسلام نکالنے کی ایک ہی صورت ہے کہ آپ قرآن کی من مانی تفسیر کریں، حدیثوں کی من مانی تشریح کریں اور ماڈرن اسلام نکال لیں۔ چنانچہ انھوں نے قرآن کے ساتھ یہ ظلم کیا کہ اسلاف سے قرآن سیکھنے کی ضرورت نہیں، چند نوجوان، چند ڈاکٹر، چند پروفیسر بیٹھ جاتے ہیں اور جو سمجھ میں آئے تشریح کرتے ہیں، بلکہ اب تو عورتیں بھی بیٹھ جاتی ہیں۔ اور بے دھڑک من مانی تفسیر کرتی ہیں۔

الغرض قرآن وحدیث کے سمجھنے کے لئے اسلاف سے جو تسلسل چلا آرہا تھا وہ تسلسل انھوں نے کاٹ دیا، اور زمانہ کے تقاضوں کے مطابق انھوں نے نئی تشریح کی اور یوں ماڈرن اسلام نکال کر لے آئے۔ ماڈرن اسلام چاہئے تھا تو نیا قرآن نازل کرتے، نئی حدیثیں گڑھتے۔ ان کی یہ گمراہی سب سے بڑی اور سب سے خطرناک گمراہی ہے۔

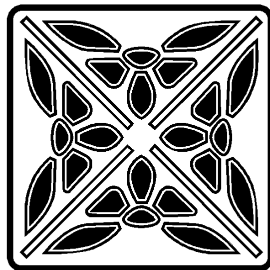
۵- بالادستی عقل کو حاصل ہے یا نقل کو؟

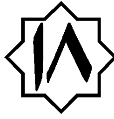
اللہ نے ہمیں عقل دی ہے، اور استعمال کرنے کے لئے دی ہے، کھو پا کھانے کے لئے نہیں دی۔ اور اللہ نے نبوت کا سلسلہ بھی شروع کیا ہے اور کتابیں نازل کی ہیں، اور آخری کتاب قرآن کریم ہے، اور اس کی تبیین وتشریح حدیثیں ہیں، یہ ہے نقل۔ اس نقل کے بھیجنے کا مطلب ہی یہ ہے کہ آپ صرف عقل سے مسئلہ حل نہیں کر سکتے، آپ عقل سے کھیتی کر سکتے ہیں، بزنس کر سکتے ہیں، ایٹم بم بنا سکتے ہیں، ہوائی جہاز بنا سکتے ہیں، دنیا کے سارے کام کر سکتے ہیں لیکن اللہ کی پسند اور ناپسند کو عقل سے نہیں جان سکتے، جنت میں لے جانے والے اعمال کونسے ہیں اور جہنم میں لے جانے والے اعمال کونسے ہیں؟ آپ اس کو عقل سے طے نہیں کر سکتے، اگر عقل سے یہ مسائل طے ہو سکتے تھے تو جیسے کھیتی سکھانے کے لئے، بزنس سکھانے کے لئے اور صنعت سکھانے کے لئے کوئی نبی نہیں آیا دین سکھانے کے لئے بھی کسی نبی کی ضرورت نہیں تھی، لوگ اپنی عقل سے خود ہی دین تجویز کر لیتے، مگر چونکہ یہ کام صرف عقل سے نہیں کیا جا سکتا اس لئے اللہ نے عقل کے ساتھ ہمیں نقل بھی دی۔ اب بتاؤ اس

عقل اور نقل میں توازن کیسے قائم کیا جائے؟ دونوں برابر تو ہو نہیں سکتے۔ عقل اوپر ہے اور نقل نیچے، یعنی عقل جو کہے وہی نقل کا مطلب لیا جائے۔ یہ مودودیوں کا ذہن ہے، ان کے نزدیک آیت کا مطلب جوان کی عقل کہے بس وہی صحیح ہے، جوان کی عقل کہے وہی حدیث کا مطلب ہے، اور چودہ سوسال سے یہ چلا آرہا ہے کہ نقل اوپر ہے اور عقل اس کے نیچے، اللہ نے عقل نقل کو سمجھنے کے لئے دی ہے، آپ اس عقل کی مدد سے قرآن وحدیث کو سمجھیں مگر اس کو قرآن وحدیث پر حاکم نہ بنائیں، قرآن وحدیث کو اُس روشنی میں سمجھا جائے گا جو حضور ﷺ کے زمانہ سے چلی آرہی ہے اگر آپ کی عقل آیت اور حدیث کا وہ مطلب سمجھتی ہے جو مطلب حضور ﷺ اور صحابہ کے زمانہ سے چلا آرہا ہے تو سبحان اللہ! اور اگر آپ کی عقل کوتاہ ہے تو آپ عقل کے پیچھے نہیں چلیں گے بلکہ نقل کی پیروی کریں گے اور نقل کا جو مطلب چودہ سوسال سے سمجھا جارہا ہے اسی کو لیں گے۔ مودودی صاحب نے عقل کو نقل سے اوپر کر دیا اور کہا کہ جو مطلب ہماری عقل میں آئے گا بس وہی مطلب صحیح ہے، اسی کو ہم لیں گے۔ یہی مزاج ماضی میں معتزلہ کا رہا ہے، اور یہی مزاج آج مودودیوں کا ہے۔

مودودی حضرات کی یہ وہ پانچ گمراہیاں ہیں جو میں نے مختصراً آپ حضرات کے سامنے رکھی ہیں، میں تفصیل میں نہیں گیا کیونکہ آگے سفر درپیش ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں راہ حق دکھائیں اور اس پر چلنے کی توفیق عطا فرمائیں۔ آمین یارب العالمین

و آخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمين





حجۃ اللہ البالغہ سے فائدہ کیسے اٹھائیں؟

تمہید: حضرت مولانا مفتی یوسف ساچا صاحب دامت برکاتہم کے دولت کدہ پر (بروز پیر مورخہ ۱۴؍شعبان ۱۴۳۱ھ مطابق ۲۶؍جولائی ۲۰۱۰ عیسوی) حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری (شیخ الحدیث وصدر المدرسین دارالعلوم دیوبند) دامت برکاتہم تشریف لائے، اس موقع کو غنیمت سمجھتے ہوئے ہم چند دوستوں نے ان سے حجۃ اللہ البالغہ کے بارے میں ابتدائی معلومات بیان کرنے کی درخواست کی۔ حضرت محترم نے درخواست بصد خوشی قبول فرمائی اور مذکورہ تاریخ میں گیارہ بجے صبح سے قبل الظہر ایک بج کر پچاس منٹ تک موصوف نے حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی رحمہ اللہ کی کتاب حجۃ اللہ البالغہ کے سلسلہ میں ابتدائی معلومات پر مشتمل تقریر فرمائی، چونکہ موصوف حجۃ اللہ البالغہ کے شارح ہیں اور آپ کی شرح کو ہندو پاک کے ممتاز علماء کرام نے سراہا ہے، اس لئے ہمیں اس سلسلہ کی معلومات جاننے کا شوق پیدا ہوا اور اس مقصد کے پیش نظر گذارش کی گئی، سامعین کی تعداد تقریباً ساٹھ ستر تھی، جو سب علماء تھے، پیر کا دن اور صبح کا وقت ہونے کی وجہ سے اکثر علماء مصروفیت اور مشغولیت کی بنا پر شرکت سے معذور رہے، حضرت موصوف نے اہم باتیں ہمارے سامنے بیان فرمائیں جن کو اسی وقت ریکارڈ کرلیا گیا، بعد میں ان کو کاغذ پر نقل کیا گیا۔ الحمد للہ علی ذلک۔ یوسف احمد پٹیل ماما قاسمی عفی عنہ مقیم باٹلی (برطانیہ)

تقریر کا آغاز

خطبۂ مسنونہ کے بعد: ﴿اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ ۝ خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۝ اِقْرَأْ وَرَبُّكَ الْأَكْرَمُ ۝ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۝ عَلَّمَ الْإِنْسَانَ مَالَمْ يَعْلَمْ ۝﴾

واجب الاحترام علمائے کرام! مجھے آج تقریر کے لئے موضوع یہ دیا گیا ہے کہ امام الہند حضرت اقدس شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی قدس سرہ کی مشہور زمانہ، مایۂ ناز کتاب: **حجة الله البالغة** کے سلسلہ میں کچھ باتیں عرض کروں۔

آپ سبھی حضرات جانتے ہیں کہ حجۃ اللہ البالغہ ایک دقیق کتاب ہے، مگر دقیق ہونے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس سے پردہ نہیں اٹھایا جاسکتا، اس کو حل نہیں کیا جاسکتا، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کو سمجھنے کے لئے محنت کرنی پڑے گی۔ عام کتابوں کے پڑھنے اور سمجھنے کے لئے جتنی محنت درکار ہوتی ہے اتنی محنت اس کتاب کے لئے کافی نہیں۔ اس کے لئے محنت شاقہ کرنی پڑے گی، جبھی کتاب سمجھ میں آئے گی۔

جیسے ایک حدیث ہے: **أَرْبَعٌ فِيْ أُمَّتِيْ مِنْ أَمْرِ الْجَاهِلِيَّةِ، لَنْ يَّدَعَهُنَّ النَّاسُ، النِّيَاحَةُ، والطعنُ في الأَحْسَاب، والْعَدْوىٰ: أَجْرَبَ بعيرٌ فأجرب مأةَ بعيرٍ، مَنْ أَجْرَبَ البعيرَ الأولَ؟ وَالأَنْوَاءُ: مُطِرْنَا بِنَوْءِ كِذَا وَكَذَا** (ترمذی شریف حدیث: ۸۸۲)

ترجمہ: میری امت میں جاہلیت کی چار باتیں ایسی ہیں جنھیں لوگ ہرگز نہیں چھوڑیں گے (۱) نوحہ کرنا، مرنے والے کا ماتم کرنا (۲) خاندان پر اعتراض کرنا (۳) یہ اعتقاد رکھنا کہ ایک کی بیماری دوسرے کو لگتی ہے، لوگ کہتے ہیں: ایک اونٹ کو کھجلی ہوئی تو سب کو ہوگئی، ان سے پوچھو: پہلے اونٹ کو کھجلی کہاں سے لگی (۴) نچھتروں کا عقیدہ کہ فلاں نچھتر لگا تو بارش ہوئی۔

اس حدیث کا یہ مطلب نہیں ہے کہ جب امت ان باتوں کو نہیں چھوڑے گی تو یہ باتیں چلنے دی جائیں، ان کے ازالے کے لئے محنت نہ کی جائے، بلکہ حدیث کا مطلب یہ ہے کہ مصلحین امت ان چار باتوں کو امت میں سے نکالنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگائیں، کسی بھی طریقے سے ان چار باتوں کو امت میں سے ختم کریں، جیسے کپڑے پر داغ لگ جاتا ہے تو دھوتے ہیں اور چائے گر جاتی ہے تو اس کو ہر ممکن طریقہ سے زائل کرتے ہیں، اسی طرح یہ چار خرابیاں امت میں ایسی ہیں جو آسانی سے نکلنے والی نہیں، پس مصلحین امت کی ذمہ داری ہے کہ ان کے پیچھے خصوصی محنت کریں، اور کسی بھی طرح امت میں سے ان چار باتوں کو نکالیں۔

اسی طرح میں عرض کرتا ہوں کہ حجۃ اللہ البالغہ دقیق کتاب ہے، اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس کو یہ کہہ کر چھوڑ دو کہ یہ ہمارے بس کا روگ نہیں! ارے بھائی! انسان نے لکھی ہے، ہم ایسی کتاب لکھ نہیں سکتے تو سمجھ تو سکتے ہیں، مگر عام طور پر لوگوں کا حال یہ ہے کہ سپر ڈال دیتے ہیں، ہمت ہار جاتے ہیں، کہتے ہیں: یہ کتاب بہت مشکل ہے، چیدہ چیدہ حضرات ہی اس کا مطالعہ کرتے ہیں، عام طور پر لوگوں نے اس کو چھوڑ رکھا ہے، پڑھنے پڑھانے کا سلسلہ موقوف کر دیا ہے، اس طرح اس کتاب کا جو عظیم فائدہ تھا اس سے امت محروم ہوگئی، اس لئے میں نے قرآن کی جو پہلی وحی ہے اس کی پانچ آیتیں پڑھی ہیں، پہلے یہ پانچ آیتیں سمجھ لی جائیں تو بات آگے بڑھائی جائے گی۔

پڑھنے کی اہمیت

قرآنِ کریم کی پہلی وحی میں دو اقرأ ہیں، ایک: ناخواندہ کا اقرأ ہے اور ایک: خواندہ کا، ناخواندہ کے اقرأ کی آخری حد ہے، مگر خواندہ کا اقرأ غیر محدود ہے، زندگی کے آخری سانس تک پڑھنا چاہئے۔ جب یہ دو اقرأ جمع ہوں گے تبھی قلعہ فتح ہوگا، اگر کسی نے ایک اقرأ پر اکتفا کر لیا تو قلعہ فتح نہیں ہوگا۔

پہلی وحی کے مخاطب اول کون تھے؟ ناخواندہ لوگ! جو اپنے امی ہونے پر فخر کیا کرتے تھے، ان سے پہلی بات جو کہی گئی ہے اس سے پڑھنے کی اہمیت واضح ہوتی ہے۔ پھر پہلی وحی کا جو پہلا کلمہ ہے اس سے پڑھنے کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے۔

پہلی وحی کا پہلا کلمہ: پڑھ!

اللہ تعالیٰ کی پہلی وحی کا پہلا کلمہ ہے پڑھ! فرمایا: ﴿اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ﴾: پڑھ اس پروردگار کے نام سے جس نے تجھے پیدا کیا، جس نے تجھے نیست سے ہست کیا، اس کے نام کی مدد لے کر پڑھ وہ ضرور تجھے عالم بنادے گا۔ ذرا تو اپنی پیدائش کے مراحل کو سوچ، تجھے اللہ نے سات مراحل سے گذار کر انسان بنایا ہے، اور یہ ساتوں مراحل بے جان

مادہ ہیں، ان سات بے جان مادوں سے گذار کر تجھے اشرف المخلوقات بنایا، پس جو ہستی بے جان مادوں میں تبدیلیاں کر کے اشرف المخلوقات بنا سکتی ہے وہ تجھ جاہل ناخواندہ کو اگر تو اس کے نام کی مدد سے پڑھے تو مختلف مراحل سے گذار کر عالم نہیں بنا سکتی؟ ضرور بنا سکتی ہے، پس تو پڑھنے کے لئے کمر کس لے۔

تخلیقِ انسانی کے سات مراحل

تخلیقِ انسانی کے سات مراحل کا تذکرہ اٹھارہویں پارے کے پہلے رکوع میں ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اُن آیات میں انسان کی تخلیق کے سات مراحل کا بیان ہے، وہ سات مراحل کیا ہیں؟ پہلا مرحلہ یہ ہے کہ اللہ نے انسان کو مٹی سے بنایا، پھر مٹی کا ست (جوہر) نکالا، ایک ہی آیت میں دو مرحلوں کا ذکر ہے: ﴿لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ سُلَالَةٍ مِنْ طِينٍ﴾: مٹی کے جوہر سے ہم نے انسان کو پیدا کیا۔ مٹی کا جوہر کیا ہے، ہم مٹی سے پیدا ہونے والی غذائیں کھاتے ہیں، ان غذاؤں سے ہمارے بدن میں خون بنتا ہے، یہ خون مٹی کا سلالہ اور جوہر ہے ﴿ثُمَّ جَعَلْنَاهُ نُطْفَةً فِي قَرَارٍ مَّكِينٍ﴾: پھر ہم نے اس جوہر کو نطفہ بنایا، یہ تیسرا مرحلہ ہے، ہمارے بدن میں جو خون ہے اس سے خاص جوہر نکالا جاتا ہے، وہ مادہ بنتا ہے، اس مادے کو اللہ تعالیٰ رحم مادر میں پہنچاتے ہیں اور حمل ٹھہرتا ہے، حمل ٹھہرنے کے بعد بچہ دانی کا منھ بند ہو جاتا ہے، نہ باہر کی کوئی چیز اندر جا سکتی ہے اور نہ اندر کی کوئی چیز باہر آسکتی ہے، یہی قرار مکین: اطمینان سے نطفہ کے ٹھہرنے کی جگہ ہے۔ انسان کی تخلیق کے یہ تین مرحلے ہوئے، مٹی، مٹی کا جوہر (خون) اور مادہ۔

بچہ دانی میں جا کر وہ مادہ چالیس دن میں علقة (خون بستہ) بن جاتا ہے۔ یہ چوتھا مرحلہ ہے جو بیچ کا مرحلہ ہے، جب سات مرحلے ہیں تو بیچ میں کوئی نہ کوئی مرحلہ ضرور ہوگا، پھر اس کے بعد علقة: مضغة (بوٹی) بنتا ہے پھر اس مضغہ میں ہڈیاں پیدا ہوتی ہیں پھر ان ہڈیوں پر گوشت چڑھتا ہے۔ یہ کل سات مرحلے ہوئے اور یہ ساتوں مرحلے بے جان مادہ ہیں ان سات مراحل سے گذار کر اللہ تعالیٰ نے ایک ایسی مخلوق بنادی جس سے بہتر اور اشرف

مخلوق کوئی نہیں، بڑی برکت والی ہے وہ ذات جو احسن الخالقین ہے۔

ان سات مرحلوں میں سے بیچ کے مرحلہ کا ذکر فرماتے ہیں: ﴿خَلَقَ الإِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ﴾: اللہ نے انسان کو جمے ہوئے خون سے بنایا، اس پروردگار کے نام کی مدد سے پڑھ وہ تجھ جاہل ناخواندہ کو عالم بنادے گا۔ یہ پہلا اقرأ ہے جو ناخواندہ کا اقرأ ہے، وہ الف باء سے شروع ہوتا ہے اور اس کا آخری مرحلہ یہ ہے کہ آدمی میں استعداد پیدا ہو جائے، جب تک استعداد پیدا نہ ہو پڑھتا رہے، دورہ پڑھ کر یہ نہ سمجھ لے کہ میں فارغ ہو گیا۔

دوسرا اِقْرَأْ

پھر دوسرا اقرأ شروع ہوتا ہے اور غور کرو انداز بیان کیسے بدل رہا ہے، فرمایا: ﴿اِقْرَأْ وَرَبُّكَ الأَكْرَمُ﴾: پڑھ اور تیرا پروردگار بڑا اکریم (سخی) ہے، اس کے یہاں فضل کی کمی نہیں، جتنا پڑھے گا اتنا بڑھے گا۔ وہ تجھے بے حساب علم دے گا۔

یہ خواندہ کا اقرأ ہے اور اس کی کم سے کم مقدار متعین ہے، مطالعہ کی صلاحیت پیدا ہونے کے بعد یہ مرحلہ شروع ہوتا ہے، اور اس کی آخری حد کوئی نہیں۔ کائنات میں سب سے زیادہ علم رکھنے والے ہمارے آقا حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ ہیں، حضرت نانوتوی قدس سرہ نے رسالہ تحذیر الناس میں ایک حدیث لکھی ہے: عُلِّمْتُ علمَ الأولین والآخرین: مجھے اگلوں اور پچھلوں کا علم دیا گیا ہے، پوری کائنات کے پاس جتنا علم ہے اتنا حضور ﷺ کو دیا گیا ہے، ایسی ہستی کو اللہ نے دعا سکھلائی ہے: ﴿وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا﴾: آپؐ دعا کیجئے کہ اے اللہ! میرے علم میں اضافہ فرما، اتنا علم رکھنے والا بھی مامور ہے کہ وہ علم میں اضافہ کی دعا کرے، معلوم ہوا کہ علم کی کوئی حد نہیں۔

اس کے بعد فرماتے ہیں: ﴿الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ﴾ تیرا پروردگار وہ ہے جو قلم کے ذریعہ علم سکھاتا ہے، پہلے استاذ کے سامنے زانوئے ادب تہہ کرتا ہے پھر قلم کے ذریعہ یعنی اگلوں نے جو کچھ لکھا ہے اسے پڑھتا ہے، اس طرح ﴿عَلَّمَ الإِنْسَانَ مَالَمْ يَعْلَمْ﴾: اللہ تعالیٰ انسان کو وہ علوم سکھاتے ہیں جو وہ نہیں جانتا یعنی جو اس نے مدرسہ کی زندگی میں نہیں جانے وہ علوم

اب ذاتی مطالعہ سے حاصل کرے گا۔

دورتنزل

مگراب تنزل کا زمانہ آگیا ہے۔طلبہ کے پڑھنے میں بھی اوراساتذہ کے پڑھنے میں بھی،طلبہ استعداد بننے سے پہلے فارغ ہوجاتے ہیں،اوراساتذہ عربی کتابوں کو ہاتھ نہیں لگاتے،وہ سمجھتے ہیں کہ اردوشرحوں سے کام چل جائے گا،حالانکہ مصادر اصلیہ کا مطالعہ کئے بغیر علم میں کمال پیدانہیں ہوسکتا،اس لئے میں نے یہ آیات کریمہ پڑھیں تاکہ ہم اپنی کمی دور کریں،اگر ہم نے اپنی کمی دور کرلی تو پھر ہمیں حجۃ اللہ البالغہ کسی سے پڑھنے کی ضرورت نہیں، یہ تو دوسرے اقرأمیں آتی ہے،ہرایک کو یہ کتاب خود پڑھنی ہے،مگر پڑھے گا وہی جو پہلے مرحلہ کے اقرأسے کامیاب گذرا ہے،اگر پہلے مرحلہ سے کامیاب نہیں گذرا تو نہ خود مطالعہ کرسکتا ہے نہ اس کو پڑھانے سے کچھ حاصل ہوگا،میں نے یہ کتاب حضرت حکیم الاسلام رحمہ اللہ سے پڑھی ہے۔حضرت کثیرالاسفار تھے،صرف چند ابواب ہم نے حضرت سے پڑھے ہیں مگراس سے کتاب کا اندازہ ہوگیااور ہم نے طے کرلیا کہ اس کتاب کو حل کرکے چھوڑیں گے الحمدللہ وہ خواب شرمندۂ تعبیر ہوگیا،کتاب حل کرلی،بلکہ شرح بھی لکھ دی۔

شاہ صاحب کی دوربینی

حضرت حکیم الاسلام قدس سرہ فرمایا کرتے تھے کہ حضرت شاہ صاحبؒ نے مستقبل میں جومحسوسات کا دورشروع ہونے والا تھااس کو پہلے سے محسوس کرلیا تھا،حضرت شاہ صاحبؒ کا زمانہ عقلیت پسندی کا زمانہ تھا،مگرشاہ صاحب کو یہ احساس ہوگیا تھا کہ آگے محسوسات کا دور آرہاہے،سائنس کا دورآرہاہے،ہربات محسوس کرکے امت کے سامنے پیش کرنی ہوگی۔اب یہ دورشروع ہوچکا ہے۔حضرت شاہ صاحبؒ نے حجۃ اللہ اسی دور کے لئے لکھی ہے،اوراس میں ایسے افکار پیش کئے ہیں جن کی روشنی میں تمام مسائل شرعیہ کو محسوس بنا کرلوگوں کے سامنے پیش کیاجاسکتاہے،یورپ اورامریکہ تو ترقی یافتہ ممالک ہیں،یہاں بچے بھی ہربات کی

وجہ پوچھتے ہیں، ابھی اس نے ہوش کے ناخن بھی نہیں لئے، مگر مسائل شرعیہ کے بارے میں پوچھتا ہے: ایسا کیوں ہے؟ یعنی مسئلہ کو محسوس کر کے سمجھاؤ، تبھی وہ سمجھے گا ورنہ نہیں سمجھے گا۔

بیت اللہ کی چھت نہ دیکھنے کی وجہ

ٹورنٹو کی مسجد دارالسلام میں ایک باپ اپنے بچہ کو لے کر آیا، بچے کی عمر مشکل سے دس گیارہ سال رہی ہوگی، اس کا باپ کہنے لگا: اس بچہ کا ایک سوال ہے، آپ اس کا جواب دیں۔ میں نے پوچھا: پیارے! تیرا کیا سوال ہے؟ اس نے کہا: میں نے ایک کتاب میں پڑھا ہے کہ جو شخص کعبہ شریف کے اندر جائے وہ چھت کی طرف نہ دیکھے، ایسا کیوں ہے؟ چھت کی طرف کیوں نہیں دیکھ سکتا؟ میں نے اس سے پوچھا: کعبہ شریف کے اندر کیوں جاتے ہیں؟ وہ بچہ تھا کیا جواب دیتا! اس لئے میں نے اسے بتایا کہ کعبہ کے اندر نماز پڑھنے کے لئے جاتے ہیں، عبادت کرنے کے لئے جاتے ہیں، پھر میں نے اس سے پوچھا: پرانی عمارتیں (آثار قدیمہ) دیکھنے کے لئے اسکول کے بچے کیوں جاتے ہیں؟ اس نے کہا: عمارت دیکھنے کے لئے جاتے ہیں کہ کیسی ہے؟ کس چیز سے بنی ہے؟ اب میں نے اس کو سمجھایا کہ کعبہ شریف تمام عمارتوں سے پرانی عمارت ہے، مگر اس کے اندر جانا آثار قدیمہ دیکھنے کے لئے جانا نہیں ہے، اندر جانا عبادت کے لئے ہے، اللہ جتنی توفیق دیں نماز پڑھنی چاہئے اور نماز پڑھ کر نکل آنا چاہئے، دیواریں دیکھنا، چھت دیکھنا وغیرہ تو آثارِ قدیمہ کی عمارتوں میں ہوتا ہے، اور دیوار دیکھنے کی ممانعت اس لئے نہیں کی کہ اس پر تو ضرور ہی نظر پڑے گی، اس سے نظر بچا نہیں سکتے، اور چھت کو دیکھنے کی کوئی ضرورت نہیں، وہ بچہ سمجھ گیا، اور مطمئن ہو کر چلا گیا، کیونکہ میں نے محسوس بنا کر بات پیش کی تھی، اس لئے وہ آسانی سے سمجھ گیا۔

اسی طرح ایک نوجوان میرے پاس آیا، یہ بھی ٹورنٹو کا واقعہ ہے، اس نے سوال کیا: دو نمازیں: ظہر اور عصر خاموش کیوں ہیں؟ اور تین نمازیں: مغرب، عشاء اور فجر جہری کیوں ہیں؟ یہ ایک دقیق مسئلہ تھا، ہمارے طلبہ بھی اس کو نہیں سمجھ پاتے، وہ تو کالج میں پڑھنے والا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا: آپ کی شادی ہوئی ہے؟ اس نے کہا: ہاں! میں نے کہا: تم

میاں بیوی گپ کب کرتے ہو؟ دن میں یا رات میں؟ اس نے کہا: رات میں، دن میں تو ضروری باتیں کرتے ہیں، میں نے کہا: آپ کے سوال کا یہی جواب ہے، دن کو اللہ نے ایسا بنایا ہے کہ زیادہ باتیں کرنے کو جی نہیں چاہتا، اسی لئے سنیما، تھیٹر اور گانے بجانے کے پروگرام رات میں ہوتے ہیں کیونکہ رات کی فطرت میں اللہ نے انبساط رکھا ہے اور دن کی فطرت میں انقباض اور جب طبیعت میں انقباض ہوتا ہے تو نہ سنانے کو جی چاہتا ہے نہ سننے کو، اس لئے دن کی نمازیں خاموش ہیں، اور رات میں طبیعت میں انبساط ہوتا ہے سنانے کو بھی جی چاہتا ہے اور سننے کو بھی، اس لئے رات کی نمازیں جہری ہیں۔

پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ دن کی فطرت میں انقباض اور رات کی فطرت میں انبساط کیوں ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ دن کو اللہ تعالیٰ نے معاش کا وقت بنایا ہے، اگر اس میں انبساط رکھا جاتا تو آدمی ٹی وی دیکھتا رہتا، گاتا بجاتا رہتا، بیوی سے گپ کرتا رہتا۔ نہ جوب (کام) پر جاتا نہ شوپ (دوکان) پر، اس لئے اس میں انقباض رکھا تاکہ آدمی صبح اٹھ کر نہا دھو کر نوکری پر پہنچ جائے یا دوکان کھول کر بیٹھ جائے، اور رات میں کوئی دھندا نہیں، وہ سونے کے لئے ہے، اس لئے رات میں انبساط رکھا۔ اور شریعت نے انقباض وانبساط کا احکام میں لحاظ رکھا، اسی لئے دن کی نمازوں کو سری اور رات کی نمازوں کو جہری کر دیا۔

اس نے سوال کیا: پھر جمعہ اور عیدین میں جہری قرأت کیوں ہے؟ میں نے اس سے پوچھا: آپ کے یہاں روز زفاف ہوتا ہے یا نہیں؟ شادی کے بعد رخصی دن میں عمل میں آتی ہے یا نہیں؟ اس نے کہا: دن میں بھی عمل میں آتی ہے (یورپ اور امریکہ میں دن میں بھی رخصتی ہوتی ہے) میں نے کہا: جب رخصتی دن میں ہو اور روزِ زفاف ہو تو پہلی ملاقات میں میاں بیوی گپ کرتے ہیں یا نہیں؟ اس نے کہا: کرتے ہیں، میں نے کہا: یہی آپ کے سوال کا جواب ہے، اس نے کہا: میں سمجھا نہیں۔ میں نے کہا: یہ موقع کی بات ہے اور خاص موقعوں کے احکام الگ ہوتے ہیں، جمعہ کے دن اور عید کے دن آدمی نہاتا ہے، نئے یا دھلے ہوئے کپڑے پہنتا ہے، خوشبو لگاتا ہے اور بڑے اجتماع میں پہنچتا ہے۔ ایسے موقعہ پر طبیعت میں انبساط پیدا ہو جاتا ہے، اس لئے قرآن زور سے پڑھا جاتا ہے۔

یہ دقیق ترین مسئلہ تھا مگر میں نے اس کو محسوس بنا دیا تو اس کی سمجھ میں آ گیا، یہ سب حجۃ اللہ کی برکت ہے، حجۃ اللہ میں یہ مسئلہ نہیں آیا، مگر پڑھتے پڑھاتے ایک مزاج بن گیا، اب شریعت کا کوئی مسئلہ ہو میں اس کو محسوس بنا کر پیش کر سکتا ہوں۔

غرض حکیم الاسلام نے فرمایا: شاہ صاحب کو ڈیڑھ سو سال پہلے یہ بات محسوس ہو گئی تھی کہ اب عقلیت کا دور ختم ہونے والا ہے اور سائنس کا دور شروع ہونے والا ہے، جس میں معنویات کو محسوس بنا کر پیش کرنا ہوگا، اس لئے شاہ صاحب نے حجۃ اللہ لکھی تا کہ دو سو سال کے بعد جب یہ دور شروع ہو، علماء امت اس قابل ہو جائیں کہ وہ ہر مسئلہ کو محسوسات کے دائرہ میں لا کر افہام و تفہیم کر سکیں۔

مشکل کتاب کو حل کرنے کا طریقہ

اگر آپ کوئی گہرا فن اور گہری کتاب سمجھنا چاہتے ہیں تو اس کا طریقہ شاہ صاحبؒ نے یہ بتایا ہے کہ پہلے اس کے آلات جمع کریں، کسی بھی مسئلہ کو سمجھنے کے لئے جو ابتدائی معلومات درکار ہوتی ہیں ان کو جمع کریں، پھر تدریجاً آگے بڑھیں، ایک دم چھلانگ نہ لگائیں، مثلاً: حجۃ اللہ میں ایک مضمون ہے، اس میں ہے کہ واقعات سلسلۂ مُعِدّات ہیں، اس کو سمجھنے کے لئے پہلے مُعِدّ کو سمجھنا پڑے گا، اس کے بغیر یہ بات نہیں سمجھ سکتے، غور کریں کہ یہ کس فن کی بات ہے؟ یہ منطق کی اصطلاح ہے، منطق کی کتابوں میں معدّ وہ چیز ہے جو موجود ہو کر فنا ہو جائے تب اگلا فرد وجود میں آئے، جیسے میرا ایک قدم وجود میں آیا، پھر دوسرا قدم کب وجود میں آئے گا؟ جب میں پچھلا پیر اٹھا کر آگے رکھونگا تب دوسرا قدم وجود میں آئے گا، اب پچھلا قدم ختم ہو گیا، اور دوسرا قدم وجود میں آ گیا، اسی طرح اعداد (گنتی) بھی سلسلہ معدات ہیں، چھ میں ایک ملائیں گے تب سات بنیں گے، اب چھ ختم ہو گئے اور سات وجود میں آ گئے، اسی طرح سات میں ایک ملایا تو آٹھ بنا، اب سات ختم ہو گیا اور آٹھ وجود میں آ گیا۔

غرض لفظ یا اصطلاح جس فن کی ہے اس فن میں جا کر جب تک معنی متعین نہیں کریں گے پلّے کچھ نہیں پڑے گا، اس لئے شاہ صاحب نے فرمایا کہ جب کوئی مشکل مضمون ہو یا

مشکل کتاب ہواور آپ اس کو سمجھنا چاہیں تو پہلے اس کے آلات مہیا کریں، جو تمہیدی باتیں ضروری ہیں ان کو پہلے حاصل کریں، پھر تدریجاً آگے بڑھیں۔ تدریج سے ذہن میں آگے بڑھنے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے، اور رفتہ رفتہ آدمی مجتہد بن جاتا ہے۔ امام محمد رحمہ اللہ رات میں سوتے نہیں تھے، سوچتے تھے اور جب کوئی دقیق مسئلہ حل ہوتا تو صحن میں گھومتے تھے، اور خوش ہوکر فرماتے: بادشاہوں کے لڑکوں کو یہ نعمت کہاں حاصل! امین و مامون کو یہ نعمت کہاں حاصل! بہت خوش ہوتے تھے۔

معلوم ہوا کہ سوچنا بھی ایک مطالعہ ہے، حضرت علامہ محمد ابراہیم صاحب بلیاوی رحمہ اللہ جب درس کے لئے آتے تو پہلے وضو کرتے، عمامہ باندھتے، پھر تپائی پر رکھ کر ترمذی شریف کھولتے اور جو ابواب پڑھانے ہوتے ان کو ایک نظر دیکھتے، پھر کتاب بند کر کے دس منٹ سوچتے، پھر پڑھانے کے لئے چل دیتے، یہ سر جھکا کر بیٹھنا ہی ان کا مطالعہ تھا کیونکہ مواد تو سارا دماغ میں اکٹھا ہوتا ہی تھا، صرف ترتیب دینے کی ضرورت تھی کہ مسئلہ کو کس انداز سے بیان کرنا ہے۔

شاہ صاحب نے حجۃ اللہ کے مقدمہ میں لکھا ہے: **وكذلك كلُّ علم يَتَراءٰى بادئَ الرأى: أن البحث عنه مستحيلٌ، و الاحاطةَ به ممتنعةٌ، ثم إذا ارْتِيْضَ بِأَدَوَاتِهِ، وَتُدُرِّجَ في فهم مقدِّماته حصل التمكُّن فيه، وتيسر تأسيس مبانيه، وتفريعُ فروعه وذويه:** اسی طرح ہر فن سرسری نظر میں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس سے بحث کرنا ممکن نہیں، اور اس کا احاطہ کرنا محال ہے، مگر جب اس کے اوزاروں کے ذریعہ اس کو سدھالیا جاتا ہے اور آہستہ آہستہ اس کی تمہیدی باتوں کو سمجھنے کی کوشش کی جاتی ہے تو اس میں جماؤ حاصل ہوجاتا ہے، اور اس کی بنیادوں کو قائم کرنا اور اس کی جزئیات و متعلقات کی تفریع کرنا آسان ہوجاتا ہے (رحمۃ اللہ ۱:۱۲۱)

حجۃ اللہ مشکل کیوں ہے؟

اور حجۃ اللہ دو وجہ سے مشکل ہے، ایک: اس میں ایجاز (اختصار) ہے اور جب بھی کلام

میں ایجاز ہوتا ہے بات مشکل سے سمجھ میں آتی ہے۔ دوم: مضامین بہت بلند ہیں، میں نے رحمۃ اللہ کے مقدمہ میں لکھا ہے کہ شاہ صاحبؒ عرش پر بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں۔ ان مضامین کو فرش پر لانا مشکل ہوتا ہے، جب تک ان کی اصطلاحات حل نہ کی جائیں، ان کے انداز بیان سے واقفیت پیدا نہ کی جائے مضمون سمجھ میں نہیں آتا۔

حجۃ اللہ کیسے سمجھیں؟

مگر اب حجۃ اللہ کا سمجھنا بہت آسان ہو گیا ہے، آپ رحمۃ اللہ الواسعہ لے کر بیٹھیں اور ایک مقدار متعین کریں کہ مجھے روزانہ ایک مسئلہ پڑھنا ہے یا تین صفحے پڑھنے ہیں، اس سے زیادہ نہ پڑھیں، اس کو اپنی کاپی میں دوسرے لفظوں میں لکھیں، لمبے مضمون کو مختصر کریں اور چوبیس گھنٹے اس مضمون کو دماغ میں گھمائیں، ساتھیوں سے مذاکرہ کا موقعہ ملے تو مذاکرہ کریں، ساتھی نہ ملیں تو چند تپائیاں سامنے رکھ کر تقریر کریں، اس سے مضمون یاد بھی ہوگا اور ذہن میں بھی بیٹھے گا۔

البتہ حجۃ اللہ کی دو قسمیں ہیں: قسم اول میں سات مباحث ہیں اور ہر مبحث میں متعدد ابواب ہیں، اگر کوئی ان سات مباحث پر قابو پالے تو شریعت کا ہر مسئلہ حل کر سکتا ہے، ہر مسئلہ کا راز اور حکمت پا سکتا ہے۔ حجۃ اللہ میں اُس مسئلہ کا ہونا ضروری نہیں، اور قسم ثانی میں حضرت نے مشکوۃ شریف کو سامنے رکھ کر اسی ترتیب سے حدیثیں لکھی ہیں اور حدیثوں میں جو حکم آیا ہے اس کا راز بیان کیا ہے اس کی حکمت بیان کی ہے۔

قسم ثانی کا سمجھنا آسان ہے، کہیں کہیں کوئی بات مشکل آجاتی ہے، ورنہ وہ بہت آسان ہے، ہر پڑھا لکھا آدمی اس کو سمجھ سکتا ہے، پس جو حضرات حجۃ اللہ کا مطالعہ کریں وہ پہلے قسم ثانی پڑھیں، جب اس سے فارغ ہوں تو قسم اول شروع کریں، رحمۃ اللہ میں میں نے اس کی ایک مثال دی ہے۔ ایک ماہر باورچی ہے، اس کے پاس پلاؤ پکانے کا ایک فارمولہ ہے، مگر مجمع میں باورچی اس فارمولہ کو بتائے تو ضروری نہیں کہ ہر آدمی اس فارمولہ کے مطابق پلاؤ پکالے، کوئی کامیاب ہو سکتا ہے اور کوئی ناکام۔ لیکن اگر وہ باورچی پلاؤ پکا کر سب کے سامنے

پلیٹوں میں کھانا سجا دے تو پھر کیا دیر ہے؟ ہاتھ بڑھائے اور کھانا شروع کرے۔ پہلی قسم میں حضرت نے اصول وضوابط بیان کئے ہیں اور اصول وضوابط ہمیشہ نظری ہوتے ہیں اور نظری چیزوں کا سمجھنا دشوار ہوتا ہے اس لئے قسم اول کا سمجھنا دشوار ہے، اور قسم ثانی میں حدیثوں کو سامنے رکھ کر ان میں جو احکام آئے ہیں ان کے اسرار وحکم بیان کئے ہیں، یعنی اصول وضوابط کے مطابق حدیث میں مذکور احکام کے اسرار وحکم بیان کر کے کھانا سامنے کر دیا ہے، اب کیا کمی ہے آگے بڑھو اور خوانِ نعمت سے فائدہ اٹھاؤ۔

حجۃ اللہ کے ہم پلہ کوئی کتاب نہیں

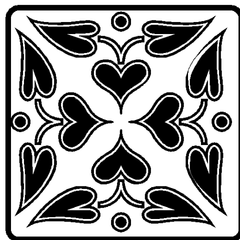
حجۃ اللہ کے انداز پر اور بھی کتابیں لکھی گئی ہیں لیکن حجۃ اللہ کے ہم پلہ کوئی کتاب نہیں، حضرت تھانویؒ کی **المصالح العقلية فی الأحكام النقلية** ہے، اس میں صرف احکام کی حکمتیں ہیں کہ یہ حکم کیوں ہے؟ وضوء میں چار فرض کیوں ہیں؟ اطراف کیوں دھوئے جاتے ہیں؟ لیکن اس میں کوئی ایسا فارمولہ نہیں کہ وہ ہم جان لیں تو خود شریعت کے احکام کی حکمت نکال لیں، اور حجۃ اللہ میں آدھی کتاب میں ایسے ہی فارمولے بیان کئے ہیں۔ علامہ حسین جسر رحمہ اللہ نے بھی عقائد میں ایک کتاب لکھی ہے، انھوں نے بھی احکام کی علتیں بیان کی ہیں، مگر فارمولہ بیان نہیں کیا، الغرض جو بھی کتاب اس باب میں لکھی گئی ہے وہ حجۃ اللہ کے ہم پلہ نہیں، حجۃ اللہ پہلی اور آخری کتاب ہے، اس میں جہاں احکام کی حکمتیں بیان کی گئی ہیں وہیں اصول اور ضابطے بھی بیان کئے گئے ہیں۔

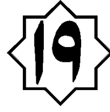
نظام الاوقات بنانا ضروری ہے

مگر ہمارے فضلاء پر احساس کمتری چھایا ہوا ہے وہ کچھ کرنا ہی نہیں چاہتے، بھائیو! کب تک سننے کے محتاج رہوگے، پڑھنا شروع کرو، دس سال تک کانوں سے علم حاصل کیا اب آنکھوں کو استعمال کرو، اور اس کے ذریعہ علم حاصل کرو، کہتے ہیں: اجی وقت نہیں، فرصت نہیں، بھائی! جب آپ چاہیں گے وقت بھی نکل آئے گا اور فرصت بھی مل جائے گی۔ اپنا

حساب کرو، ہم کم از کم چار گھنٹے فضولیات میں ضائع کرتے ہیں، اِدھر کھڑے ہیں، اُدھر باتیں کررہے ہیں، خواہ مخواہ مس کال ماررہے ہیں، پیسہ بھی برباد کررہے ہیں اور وقت بھی ضائع کررہے ہیں، ہمیں چاہئے کہ وقت کی حفاظت کریں، وقت کو بچا کر پڑھنے کا نظام بنائیں۔ نظام الاوقات بنائے بغیر کچھ نہیں ہوگا، طے کرلیں کہ فلاں وقت یہ کرنا ہے اور فلاں وقت وہ، رات کو دس بجے سے بارہ بجے تک ضرور پڑھنا ہے، اور یہ پڑھنا ہے، اور اس طرح پڑھنا ہے، کچھ بھی ہوجائے پڑھنا ہے۔ حضرت تھانوی قدس سرہ کا واقعہ ہے: ایک مرتبہ ان کے استاذ حضرت مولانا خلیل احمد صاحب تھانہ بھون آئے، حضرت تھانویؒ بہت خوش ہوئے اور زور کی دعوت کی، کھانے کے بعد مجلس میں بیٹھے۔ حضرت تھانویؒ نے عرض کیا: حضرت! اس وقت میرا بیان القرآن لکھنے کا معمول ہے اگر اجازت ہو تو میں لکھنے کے لئے چلا جاؤں؟ حضرت نے فرمایا: بالکل جاؤ اور لکھو! حضرت تھانوی چلے گئے، اور دس منٹ کے بعد آ گئے، حضرت نے پوچھا: کیوں آ گئے؟ کہنے لگے: حضرت! میں نے اپنا معمول پورا کرلیا، اور چونکہ آپ تشریف فرما ہیں اس لئے لکھنے کو جی نہیں چاہتا، دس منٹ لکھا اور معمول پورا کرلیا، اس طرح آدمی نظام الاوقات بنائے تو کامیابی حاصل ہوتی ہے، یہ نہیں کہ کسی دن موقع ملا تو پڑھ لیا اور سات دن ناغہ کردیا۔ اب آٹھویں دن پڑھنے کو جی نہیں چاہے گا، اس لئے ایک وقت مقرر کرکے مطالعہ میں لگ جاؤ اور پابندی سے لگے رہو تو استعداد بڑھے گی، دماغ میں معلومات جمع ہونگی، اور رفتہ رفتہ دین کا علم پکا ہوجائے گا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو حجۃ اللہ پڑھنے کی توفیق عطا فرمائیں۔ آمین یارب العالمین۔

و آخر دعوانا أن الحمدلله رب العالمين.





جھگڑا کھڑا کرنے والی چھ باتیں

(تمسخر کرنا، طعنہ دینا، برا لقب رکھنا، بدگمانی کرنا، ٹوہ میں لگنا، غیبت کرنا)

خطبہ مسنونہ کے بعد: ﴿یٰأَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا لَایَسْخَرْ قَوْمٌ مِنْ قَوْمٍ عَسٰی أَنْ یَّکُوْنُوْا خَیْرًا مِنْهُمْ، وَلَا نَسَاءٌ مِنْ نِسَاءٍ عَسٰی أَنْ یَکُنَّ خَیْرًا مِنْهُنَّ، وَلَا تَلْمِزُوْا أَنْفُسَکُمْ، وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْأَلْقَابِ، بِئْسَ الِاسْمُ الْفُسُوْقُ بَعْدَ الْإِیْمَانِ، وَمَنْ لَمْ یَتُبْ فَأُوْلٰئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝ یٰأَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا اجْتَنِبُوْا کَثِیْرًا مِنَ الظَّنِّ، إِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ إِثْمٌ، وَلَا تَجَسَّسُوْا، وَلَا یَغْتَبْ بَعْضُکُمْ بَعْضًا، أَیُحِبُّ أَحَدُکُمْ أَنْ یَأْکُلَ لَحْمَ أَخِیْهِ مَیْتًا فَکَرِهْتُمُوْهُ، وَاتَّقُوْا اللّٰهَ إِنَّ اللّٰهَ تَوَّابٌ حَکِیْمٌ﴾ (الحجرات ۱۱و۱۲)

بزرگو اور بھائیو! میں نے آپ کے سامنے جو آیات پاک پڑھی ہیں وہ سورۂ حجرات کی ہیں، ان میں تھوڑا اوپر سے مضمون شروع ہو رہا ہے اگر دو مسلمان آپس میں لڑیں، وہ دو فرد ہوں، دو قبیلے ہوں، یا دو جماعتیں تو ان میں صلح کرادو۔

فرد بھی جماعت ہو سکتا ہے

آپ کہیں گے کہ زید اور عمر تو دو جماعتیں نہیں ہیں، جواب یہ ہے کہ ایک آدمی بھی جماعت ہو سکتا ہے، قرآنِ کریم میں ہے: ﴿إِنَّ إِبْرَاهِیْمَ کَانَ أُمَّةً قَانِتًا لِلّٰهِ حَنِیْفًا﴾: (النحل ۱۲۰) حضرت ابراہیم ایک انجمن تھے، ایک امت تھے، حضرت تو فرد تھے پھر بھی قرآن نے ان کو أمة کہا ہے، کیونکہ جو بھی نبی، رسول اور مصلح آتا ہے جب وہ محنت شروع کرتا ہے تو اکیلا نہیں رہتا لوگ قافلہ میں جڑتے چلے جاتے ہیں اور وہ اس کے متبعین کہلاتے ہیں، اس لیڈر کے نام

سے ایک جماعت بن جاتی ہے۔ لڑائیوں میں بھی ایسا ہی ہوتا ہے کہ شروع میں دو آدمی لڑتے ہیں پھر ان کے حمایتی کھڑے ہو جاتے ہیں اور دو جماعتیں بن جاتی ہیں۔ اگر آپ تاریخ کا مطالعہ کریں تو پائیں گے کہ جو بڑی بڑی لڑائیاں ہوئی ہیں وہ دو شخصوں سے شروع ہوئی ہیں۔

اوس وخزرج کی ڈیڑھ سو سالہ جنگ کی وجہ

انصار کے دو قبیلے تھے: اوس اور خزرج، ان کے درمیان ڈیڑھ سو سال تک جنگ چلی ہے، اور یہ جنگ اس بات پر شروع ہوئی تھی کہ ایک آدمی گھوڑے پر سوار ہو کر کسی سے بات کر رہا تھا اور دوسرا آدمی بھی وہاں کھڑا تھا، گھوڑے نے دم جھٹکی، اس کے بال کھڑے ہوئے شخص کے منہ پر لگے، اس نے چاقو نکالا اور گھوڑے کی دم کاٹ ڈی، سوار اترا اور اس نے آدمی کو کاٹ ڈالا۔ یہاں سے لڑائی شروع ہوئی اور ڈیڑھ سو سال تک چلی۔ یہ لڑائی نبی پاک ﷺ کی بعثت کی برکت سے ختم ہوئی اور دونوں قبیلے شیر وشکر بن گئے، قرآنِ کریم نے اس احسان کا تذکرہ کیا ہے ﴿وَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ﴾ اللہ وہ ہستی ہیں جنھوں نے اوس وخزرج کے دلوں کو آپس میں جوڑ دیا ﴿لَوْ أَنْفَقْتَ مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيْعًا مَا أَلَّفْتَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ﴾ اگر آپ زمین کی ساری دولت خرچ کر دیتے تو بھی آپ ان کے دلوں کو جوڑ نہیں سکتے تھے ﴿وَلٰكِنَّ اللّٰهَ أَلَّفَ بَيْنَهُمْ﴾ (الانفال ۶۳) مگر اللہ نے ان کے دلوں کو جوڑ دیا۔

اوس وخزرج کی لڑائی حضور ﷺ کی بعثت کی تمہید تھی

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ایک عجیب نکتہ بیان کیا ہے اور یہ حدیث بخاری میں آئی ہے، فرماتی ہیں کہ اوس وخزرج کے درمیان جو ڈیڑھ سو سال تک لڑائی چلی وہ حضور ﷺ کی بعثت کی تمہید تھی۔ کیسے؟ عرب میں جتنے مضبوط اور بڑے قبیلے تھے ان میں سے کوئی حضور کو اپنے یہاں لے جانے کے لئے تیار نہیں تھا، حضور ﷺ نے متعدد قبیلوں کے سامنے اپنے آپ کو پیش کیا، طائف تو خود تشریف لے گئے کہ مکہ تو ساتھ دیتا نہیں تم ہی ساتھ دو، وہ ساتھ تو کیا دیتے اوباشوں کو آپ کے پیچھے لگا دیا جنھوں نے اتنے پتھر مارے کہ حضور ﷺ کی ایڑیاں لہولہان ہو گئیں۔ خیر طائف سے نکلے تو سوچا کہ کہاں جائیں؟ چونکہ رات ہو گئی

تھی اس لئے آپ ایک باغ میں رک گئے، وہاں دو واقعے پیش آئے: ایک: ملک الجبال: یعنی پہاڑوں کے انتظام پر جو فرشتہ مقرر ہے وہ حاضر ہوا اور اللہ کی طرف سے سلام عرض کیا اور پوچھا کہ آپ کے ساتھ طائف والوں نے جو برتاؤ کیا وہ اللہ کے سامنے ہے اور اللہ نے مجھے حکم دیا ہے کہ اگر آپ چاہیں تو طائف کے دو طرف کے پہاڑوں کو ملا دوں اور سب کو بیچ میں کچل دوں، آپ نے جواب دیا: بارگاہ خداوندی میں میرا سلام پیش ہو، اور یہ عرض کیا جائے کہ میری قوم مجھے جانتی نہیں، اس لئے میرے ساتھ انھوں نے ایسا برتاؤ کیا ہے، میری اللہ سے دعا ہے کہ میری اس قوم کو ہدایت نصیب ہو!

جنات کا ایمان لانا حضور کی تسلی کے لئے تھا

اس باغ میں دوسرا واقعہ یہ پیش آیا کہ حضور ﷺ نے یہاں رات میں آرام فرمایا، فجر کی نماز آپ حضرت بلال اور حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہما کے ساتھ پڑھ رہے تھے، اچانک جنات کا ایک وفد یہاں سے گذرا، ان کے کانوں میں قرآن کی آواز پڑی وہ رک گئے اور قرآن کریم سنا اور سن کر اس نتیجہ پر پہنچے کہ یہی وہ کلام ہے جس کے نزول کی وجہ سے ہمارے اوپر پہرہ لگا ہے، اور اپنی قوم میں جا کر انھوں نے اُسی انداز سے جس انداز سے آج کل رپورٹ لکھی جاتی ہے، ایک مفصل رپورٹ پیش کی جو سورۂ جن میں ہے، اللہ نے نماز کے بعد حضور ﷺ کو اطلاع دی کہ جنات کا ایک وفد قرآن سن کر اور متاثر ہو کر گیا ہے اور ایمان لے آیا ہے، اور انھوں نے جو رپورٹ پیش کی ہے اس میں پوری قوم کو ایمان کی دعوت دی ہے، یہ حضور ﷺ کے لئے تسلی تھی کہ طائف والوں نے اگر آپ کی بات نہیں مانی تو اللہ نے ایک دوسری امت کھڑی کر دی۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ پہلے جنات آسمانوں کے اوپر جنت تک جاتے تھے، پھر جب حضرت آدم علیہ السلام کو زمین پر اتارا گیا تو جنات کا داخلہ آسمان سے اوپر بند کر دیا گیا، لیکن آسمان تک جنات برابر جاتے رہے، جب قرآنِ کریم کا نزول شروع ہوا تو آسمانوں کے قریب جانے پر بھی پابندی لگ گئی، سیکورٹی کھڑی کر دی گئی —— قرآنِ کریم کا نزول

مکمل ہونے کے بعد سیکورٹی اب بھی باقی ہے یا اٹھادی گئی؟ معلوم نہیں کیونکہ اس بارے میں کوئی نص نہیں ــــــ اب اگر کوئی جن آسمان کے قریب جاتا ہے تو وہاں سے میزائل داغا جاتا ہے، جس سے کبھی وہ بالکل بھسم ہو جاتا ہے اور کبھی خبطی ہو جاتا ہے۔

جب یہ نئی صورتِ حال پیش آئی تو جنات کی اتھارٹی نے کانفرنس بلائی، یہ کانفرنس اتنی بڑی تھی کہ زمین پر منعقد نہ ہو کر سمندر پر منعقد ہوئی، اس میں یہ مسئلہ زیرِ غور آیا کہ دنیا میں ایسی کیا نئی بات پیدا ہوئی ہے جس کی وجہ سے ہم پر پہرہ لگا ہے؟ اس بات کو جاننے کے لئے انھوں نے زمین کے چپہ چپہ میں وفود بھیجے، ایک وفد تہامہ کے لئے بھی تھا، جس میں مکہ معظّمہ آتا ہے اور یہ وفد نصیبین کا رہنے والا تھا، یہ وفد اس علاقہ کا سروے کرتے ہوئے صبح کے قریب یہاں سے گذرا اور حضور ﷺ کو فجر کی نماز میں قرآن پڑھتے ہوئے سنا تو کھڑا ہو گیا اور قرآن سن کر چلا گیا، اس کا تذکرہ سورۂ احقاف میں ہے ﴿وَإِذْ صَرَفْنَا إِلَيْكَ نَفَرًا مِنَ الْجِنِّ﴾ پھر انھوں نے جا کر رپورٹ پیش کی۔

ڈیوٹی کے درمیان دوسرا کام کرنا اصول کے خلاف ہے

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب وہ لوگ ایمان لے آئے تھے اور جا کر قوم کو دین کی دعوت دی تو حضور ﷺ سے مل کر کیوں نہیں گئے؟ جواب: قاعدہ یہی ہے، کسی شخص کو کوئی کام سونپا جائے پھر وہ کام ہوا ہو یا نہ ہوا ہو، بھیجنے والے کے پاس آ کر مطلع کرنا چاہئے۔

ایک مرتبہ صحابہ کی میٹنگ بیٹھی، اس میں یہ اختلافی مسئلہ زیرِ غور آیا کہ اگر کوئی اپنی بیوی سے صحبت کرے اور انزال نہ ہو تو غسل واجب ہو گا یا نہیں؟ بعض نے کہا: واجب ہو گا، بعض نے کہا: واجب نہیں ہو گا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا آپ بدری صحابہ اس میں اختلاف کریں گے تو آگے امت کا کیا حال ہو گا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے مشورہ دیا کہ یہ مسئلہ حضور ﷺ کی بیویوں سے پوچھنا چاہئے کہ اس میں حضور کا عمل کیا تھا؟ حضرت عمرؓ نے کہا: ٹھیک ہے، اور اس سلسلے میں ایک آدمی انھوں نے اپنی بیٹی ام المؤمنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے پاس بھیجا انھوں نے جواب دیا: میرے ساتھ ایسا معاملہ پیش نہیں آیا، اس آدمی نے

واپس آ کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو بتایا۔ پھر اسی آدمی کو حضرت عمرؓ نے حضرت عائشہؓ کے پاس بھیجا، حضرت عائشہؓ نے جواب دیا: میرے ساتھ ایسا معاملہ پیش آیا ہے اور ہم نے غسل کیا ہے۔ اس آدمی نے واپس آ کر جواب حضرت عمرؓ کو بتایا، جب حضور ﷺ کا عمل سامنے آیا تو حضرت عمرؓ نے لوگوں سے کہا: حضور کا عمل آ گیا ہے اب اس کے خلاف کوئی فتوی نہ دے، چنانچہ اس وقت سے اس مسئلہ میں اجماع ہو گیا۔

مجھے اس واقعہ میں یہ بتانا ہے کہ آدمی کو پہلے حضرت حفصہؓ کے پاس بھیجا، جب وہاں سے جواب معلوم نہ ہوا تو اس کو دیگر ازواج مطہرات کے پاس خود ہی چلا جانا چاہئے تھا مگر نہیں گیا، جب اسے دوبارہ حضرت عائشہؓ کے پاس بھیجا گیا تبھی گیا۔ اسی طرح جنات کا یہ وفد آن ڈیوٹی تھا، اور ڈیوٹی پوری کرنے سے پہلے دوسرا کام کرنا اصول کے خلاف ہے، چنانچہ یہ وفد اس وقت نہیں ملا، دوسرے وقت میں یہی نصیبین کے جنات بار بار حضور ﷺ کی خدمت میں آئے ہیں۔ جب انھوں نے رپورٹ پیش کی تو کانفرنس نے متفقہ طور پر فیصلہ کیا کہ یہی وہ کلام ہے جس کے نزول کی وجہ سے یہ سیکورٹی قائم کی گئی ہے۔

بہرحال کوئی قبیلہ حضور ﷺ کو اپنانے کے لئے تیار نہیں ہوا، مگر انصار خود بڑھ کر گئے اور حضور نے اپنے آپ کو ان کے سامنے پیش کیا کہ دین کا کام کرنے میں تم میری مدد کرو، وہ فوراً تیار ہو گئے۔ فوراً کیوں تیار ہوئے؟ ڈیڑھ سو سال سے لڑتے لڑتے تھک گئے تھے، اور مدینہ کے یہودی ان پر ایسے چھا گئے تھے کہ جینا ان کے لئے مشکل ہو گیا تھا، یہودی ان کے بچوں اور عورتوں کو گروی رکھ کر قرضے دیا کرتے تھے، جب ان یہودیوں سے چھٹنے کی کوئی شکل نہیں رہی تو ان دونوں قبیلوں نے سوچا کہ ان سے نجات پانے کا بس ایک ہی راستہ ہے کہ ان نبی صاحب کو لے آؤ، اور اپنے اختلاف کو بھلا کر ان کے ساتھ مل کر بل اور قوت پیدا کرو، تو ہی ہم ان یہودیوں سے لوہا لے سکیں گے، یوں وہ لوگ حضور ﷺ کو دعوت دے کر مدینہ لائے، اللہ نے اسی کا احسان جتایا ہے کہ یہ دونوں قبیلے جو ایک ہوئے ہیں وہ اللہ کے ایک کرنے سے ایک ہوئے ہیں۔

خیر بات کہیں سے کہیں چلی گئی، میں تو یہ بتا رہا تھا کہ فرد بھی جماعت بن جاتا ہے، اس

لئے مسلمانوں کو حکم دیا جا رہا ہے کہ اگر مسلمانوں کی دو جماعتیں آپس میں لڑیں تو پہلی فرصت میں ان کے درمیان صلح کراؤ، پھر اس سلسلے کے تفصیلی احکام ہیں۔

لڑائیاں کیوں ہوتی ہیں؟

اس کے بعد یہ مضمون شروع ہوتا ہے کہ لڑائیاں کیوں ہوتی ہیں؟ وہ سوراخ کہاں ہے جس سے پانی رس کر آتا ہے، چنانچہ اگلی آیت میں لڑائیاں کھڑی کرنے والے تین اسباب کا بیان ہے: ﴿يٰأَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا لاَيَسْخَرْ قَوْمٌ مِنْ قَوْمٍ عَسٰى أَنْ يَّكُوْنُوْا خَيْرًا مِنهُمْ، وَلاَ نَسَاءٌ مِنْ نِسَاءٍ عَسٰى أَنْ يَكُنَّ خَيْرًا مِنهُنَّ، وَلاَ تَلْمِزُوْا أَنْفُسَكُمْ، وَلاَ تَنابَزُوْا بِالْأَلْقَابِ، بِئْسَ الِاسْمُ الْفُسُوْقُ بَعْدَ الإِيْمَانِ، وَمَنْ لَمْ يَتُبْ فَأُوْلٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُوْنَ﴾ اس آیت میں تین حکم دیئے گئے ہیں، پہلا حکم: تمام مسلمانوں کو، خواہ وہ مرد ہوں یا عورتیں، یہ دیا ہے کہ تمسخر مت کرو، ٹھٹھا مخول مت کرو۔

مزاح سنت ہے، مذاق ٹھیک نہیں اور ٹھٹھا حرام ہے

ٹھٹھا سب سے اوپر کا درجہ ہے، اس سے نیچے مذاق ہے اور مذاق سے نیچے مزاح ہے، مزاح سنت ہے، مذاق پسندیدہ نہیں، اور ٹھٹھا ممنوع ہے۔ مزاح کے لئے اردو میں لفظ ہے: دل لگی، یعنی ایسی بات کرنا جس سے دل خوش ہو اور تکلیف کسی کو نہ پہنچے، حضور ﷺ نے صحابہ سے اور صحابہ نے حضورؐ سے مزاح فرمایا ہے، اور حدیثوں میں اس کے بہت سے واقعات آئے ہیں، چونکہ دل لگی میں کسی کو تکلیف پہنچانا نہیں ہوتا بس سامنے والے کا دل خوش کرنا مقصد ہوتا ہے اس لئے اس میں کوئی حرج نہیں، مزاح سے اوپر کا درجہ ہے: مذاق، عربی میں اس کے لئے کوئی لفظ نہیں، عربی میں لفظ مذاق ہے مگر اس کے معنی چکھنے کے ہیں، بہرحال مذاق: مزاح اور ٹھٹھے کے بیچ کا درجہ ہے جیسے اساءۃ مکروہ تحریمی اور مکروہ تنزیہی کے بیچ کا درجہ ہے، مکروہ تحریمی تو حرام ہوتا ہے اور مکروہ تنزیہی خلاف اولیٰ، ان دونوں کے بیچ میں اساءۃ کا درجہ ہے جس کا مطلب ہے: برا کرنا۔ حدیث میں ہے کہ حضور ﷺ نے صحابہ کو وضو کا طریقہ سکھایا، اس کے بعد فرمایا: فمن زاد أو نقص فقد أساء وظلم: جس نے تین بار سے

زیادہ دھویا یا کم دھویا، اس نے یقیناً برا کیا، اور اپنا ہی نقصان کیا، زاد کے ساتھ أساء ہے اور ظلم کا تعلق نقص کے ساتھ ہے، کیونکہ ایک دفعہ دھونا تو واجب ہے دوسری دفعہ دھونا چھوٹی سنت ہے اور تیسری دفعہ دھونا بڑی سنت ہے، پس جس نے تین دفعہ سے کم دھویا تو اپنا ہی نقصان کیا کہ بڑی سنت کا ثواب نہ پا کر چھوٹی سنت کا ثواب پایا، اور اگر تین مرتبہ سے زیادہ دھویا تو اس نے برا کیا، یہی برا کرنا مکروہ تحریمی اور مکروہ تنزیہی کے درمیان کا درجہ ہے، کیونکہ چار مرتبہ دھونا مکروہ تحریمی یعنی حرام نہیں اور چار مرتبہ دھونا مکروہ تنزیہی یعنی خلاف اولیٰ بھی نہیں، ان دونوں کے بیچ کا درجہ ہے یعنی برا ہے۔ ایسے ہی مذاق بیچ کا درجہ ہے، اس میں بعض دفعہ سامنے والے کو کچھ تکلیف پہنچ جاتی ہے اور کہنا پڑتا ہے کہ سوری! میں مذاق کر رہا تھا، مذاق میں سوری کیوں کہنا پڑا؟ معلوم ہوا کہ مذاق میں تکلیف بھی پہنچتی ہے۔

الغرض مزاح تو سنت ہے مگر مذاق ٹھیک نہیں، پھر اس سے اوپر کا درجہ تمسخر کا ہے جس کا آیتِ کریمہ میں ذکر ہے، فرمایا: ﴿يٰأَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا لَايَسْخَرْ قَوْمٌ مِنْ قَوْمٍ عَسٰى أَنْ يَّكُوْنُوْا خَيْرًا مِنْهُمْ﴾: اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو، ٹھٹھا نہ کریں کچھ لوگ دوسرے لوگوں کا، ہوسکتا ہے کہ وہ لوگ جن کا ٹھٹھا کیا جا رہا ہے وہ بہتر ہوں ان ٹھٹھا کرنے والوں سے ﴿وَلَا نِسَاءٌ مِنْ نِسَاءٍ عَسٰى أَنْ يَّكُنَّ خَيْرًا مِنْهُنَّ﴾ اسی طرح کچھ عورتیں دوسری عورتوں کا ٹھٹھا نہ کریں، ہوسکتا ہے کہ وہ عورتیں جن کا ٹھٹھا کیا جا رہا ہے وہ اللہ کے یہاں بہتر ہوں ان عورتوں سے جو ٹھٹھا کر رہی ہیں۔

عورت اور مرد دو الگ الگ صنفیں ہیں

اس آیت سے معلوم ہوا کہ مردوں اور عورتوں میں پردہ ہے، اگر پردہ نہ ہوتا جیسا کہ آج کل غیروں کا معاشرہ ہے تو اس معاشرہ میں مرد عورتوں کا، اور عورتیں مردوں کا بھی ٹھٹھا کرتیں۔ یہ سمجھنے کا نکتہ ہے، اگر معاشرہ میں پردہ نہ ہو، دونوں الگ الگ نہ ہوں، تو یہ کہنا کہ مرد مردوں کا ٹھٹھا نہ کریں اور عورتیں عورتوں کا ٹھٹھا نہ کریں، اس تخصیص کی کوئی ضرورت نہیں تھی، جب دونوں مل کر ایک سوسائٹی ہیں تو مرد عورتوں کا بھی ٹھٹھا کر سکتے ہیں اور عورتیں مردوں کی بھی تھیکڑی اڑا سکتی ہیں، لیکن نہیں! قرآن حکم دیتا ہے کہ مرد مردوں کا ٹھٹھا نہ کریں

اور عورتیں عورتوں کا ٹھٹھا نہ کریں، معلوم ہوا کہ ان دونوں صنفوں کے درمیان اتنی بے تکلفی نہیں ہونی چاہئے کہ ایک دوسرے کے ٹھٹھے کی نوبت آئے، رہے محرم تو ان کے ساتھ ٹھٹھے کا کوئی سوال نہیں، ماں بیٹے کے ساتھ کیا ٹھٹھا کرے گی؟ بہن بھائی کے ساتھ کیا ٹھٹھا کرے گی؟ یہ تو اجنبیوں میں چلتا ہے۔

ٹھٹھا کیوں نہ کریں؟ ٹھٹھے کی ممانعت کیوں ہے؟ اس کی دلیل اسی میں ہے، پس یہ آیت **قضية قياساتها معها** کے قبیل سے ہے، یعنی وہ بات جس کی دلیل اسی کے ساتھ ہے۔ ٹھٹھا ہمیشہ وہ کرتا ہے جو اپنے کو بہتر سمجھتا ہے، اور اس کا کرتا ہے جس کو اپنے سے کمتر سمجھتا ہے، کوئی بندہ اپنے باپ کے ساتھ ٹھٹھا نہیں کرتا، کوئی بیٹی اپنی ماں کے ساتھ ٹھٹھا نہیں کرتی، کوئی شاگرد اور مرید اپنے استاذ اور پیر کے ساتھ ٹھٹھا نہیں کرتا، کیونکہ یہ سب ان کو اپنے سے بہتر سمجھتے ہیں، جہاں بھی ٹھٹھا ہوتا ہے اس کے پیچھے یہ ذہن کام کرتا ہے کہ میں اچھا اور یہ مجھ سے کمتر، قرآن نے کہا کہ بہتر اور کمتر کا فیصلہ تو اللہ کے یہاں ہوگا، اس دنیا میں تو کوئی یہ بات جان ہی نہیں سکتا کہ بہتر کون ہے؟ پس ٹھٹھے کی جو بنیاد تھی اس کو ڈھا دیا کہ تم کیا جانو کہ کون بہتر ہے اور کون کمتر؟ ہوسکتا ہے کہ جن کا ٹھٹھا کیا جارہا ہے وہ بہتر ہوں اور ٹھٹھا کرنے والے کمتر ہوں۔

﴿وَلَا تَلْمِزُوْا أَنْفُسَكُمْ﴾ اور اپنے لوگوں کو طعنے مت دو، یہ بھی جھگڑا کھڑا کرتا ہے اور طعنہ دینا ٹھٹھا کرنے سے بھی اوپر کی برائی ہے، اور اوپر کا درجہ ہے۔

﴿وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْأَلْقَابِ﴾ اور ایک دوسرے کے برے نام مت رکھو، اس سے جھگڑا تو کھڑا ہوتا ہی ہے، دوسرا نقصان ہے: ﴿بِئْسَ الِاسْمُ الْفُسُوْقُ بَعْدَ الْإِيْمَانِ﴾ ایمان کے بعد برا نام لگانا بہت بری بات ہے، یعنی کسی مؤمن کے لئے برا لفظ استعمال کرنے سے زیادہ بری بات اور کیا ہوسکتی ہے۔ طعنہ تو ایک وقتی چیز ہے، اور اس کا نام ہی برا رکھ دیا تو یہ طعنہ اس کے ساتھ ہمیشہ کے لئے لگ گیا۔ ارے کیا کررہا ہے گدھے! یہ طعنہ ہے اور اگر اس کا نام ہی گدھا رکھ دیا تو یہ اس سے بھی اوپر کا درجہ ہے۔

برا لقب نہیں رکھنا چاہئے لیکن اگر وہ چل پڑے تو کیا کرے؟

برا سرنیم (عرف) رکھنے کی بیماری انسانوں میں قدیم زمانہ سے چلی آرہی ہے، ایسا لقب

رکھنا جس میں برائی نہ ہواس میں کوئی حرج نہیں، لیکن جس میں برائی ہواس کے ذریعہ لقب نہیں رکھنا چاہئے، قرآن نے منع کیا ہے، لیکن اگر کوئی ایسا برالفظ کسی بھی وجہ سے چل پڑے اور اتنا مشہور ہوجائے کہ وہ لفظ بولے بغیر وہ شخص پہچانا نہ جائے تو پھر مسئلہ یہ ہے کہ اس عیب دار لفظ کا استعمال جائز ہے، جیسے بڑے محدثین میں ایک سلیمان اعمش ہیں، اعمش کے معنی ہیں: چندھیا عبدالرحمٰن اعرج بھی ہیں، اعرج کے معنی ہیں: لنگڑا، اب اگر ہم ان کے نام کے ساتھ اعمش اور اعرج نہ لگائیں تو ہمارا طالب علم پہچان نہیں سکتا کہ یہ کون راوی ہے؟ پس اگر کوئی لقب کسی کے ساتھ ایسا خاص ہوجائے کہ لقب لگائے بغیر وہ پہچانا نہ جائے تو پھر وہ سرنیم بن جاتا ہے، اور جب کوئی برالفظ سرنیم بن جائے تو اس میں سے برائی ختم ہوجاتی ہے، اور آدمی خود اپنے لئے بھی اپنا سرنیم بے تکلف استعمال کرتا ہے جیسے ابھی ایک بڑے عالم گذرے ہیں: شیخ عبدالفتاح ابوغدہ، غدہ کے معنی ہیں گانٹھ اور رسولی۔ ان کے باپ دادا میں کسی کے گانٹھ نکلی ہوگی اس لئے وہ ابوغدہ کہلائے، پھر یہ لقب بن کران کے خاندان میں چل پڑا اور شیخ عبدالفتاح خود بھی اپنے ہاتھ سے اپنے آپ کو بے تکلف ابوغدہ لکھا کرتے تھے، کیونکہ اس کے بغیر وہ پہچانے نہیں جاسکتے تھے، غرض لقب اگر ایسا مشہور ہوجائے تو اس کا استعمال جائز ہے، کیونکہ اب اس میں سے برائی کے معنی ختم ہوجاتے ہیں، لیکن شروع میں ایسا برالقب رکھنا جائز نہیں یہ تین احکام ہیں جو جھگڑا کھڑا کرنے والے ہیں، ان اسباب سے بچیں گے تبھی جھگڑوں سے بچ سکیں گے، اوران میں مؤمن کی ایذارسانی بھی ہے جس سے ہر آدمی کو بچنا چاہئے۔

اور اگر ان تین گناہوں میں سے کوئی گناہ ہوجائے تو قرآن نے کہا توبہ کرو ﴿وَمَنْ لَّمْ يَتُبْ فَأُولٰئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ﴾ اور جو توبہ نہیں کریں گے وہی حقیقت میں ظالم ہیں، انسان سے کوتاہیاں ہوجاتی ہیں، کوتاہی ہونے کے بعد شرمسار ہونا آدم علیہ السلام کی صفت ہے، اور کوتاہی ہونے کے بعد اس پر اڑجانا شیطان کی صفت ہے، اس لئے اللہ نے فرمایا کہ ان تین کاموں میں سے کوئی کام اگر کسی سے ہوجائے تو توبہ کرو، اور جو توبہ نہیں کرے گا وہی ظالم ہے۔

توبہ کی حقیقت کیا ہے؟

توبہ کی حقیقت تین چیزیں ہیں: تینوں اکٹھا ہوں تو توبہ ہے ورنہ زبانی جمع خرچ ہے،

ایک: جو برائی ہوئی ہے اس پر ندامت کے آنسو بہانا۔ دوم: طے کر لینا کہ اب زندگی بھر یہ غلطی نہیں کروں گا، سوم: جو کچھ ہوا اس پر قول سے یا فعل سے اللہ سے معذرت چاہنا، معافی کا طلب گار ہونا، قول سے معافی مانگنے کے لئے تھوڑی تیاری کرنی پڑتی ہے، قرآن وحدیث میں اس کے لئے صلاۃ التوبہ رکھی ہے کہ توبہ سے پہلے کم از کم دو نفلیں پڑھو، پھر اللہ کی بارگاہ میں ہاتھ اٹھاؤ اور معافی مانگو، اللہ تعالیٰ ہاتھوں کو خالی واپس نہیں کریں گے، اور فعلی توبہ یہ ہے کہ آدمی زندگی کا ورق پلٹ دے پچھلی زندگی کو پلٹ کر دیکھے بھی نہیں۔ حدیث میں ہے:

الحج یهدم ما کان قبله: حج سابقہ برائیوں کو ڈھا دیتا ہے، مٹا دیتا ہے۔

یہاں ایک سوال ہے کہ کبیرہ گناہ تو توبہ کے بغیر معاف نہیں ہوتے، پھر حج سے کیسے معاف ہو گئے؟ علماء نے اس کا یہی جواب دیا ہے کہ حج فعلی توبہ ہے، کیونکہ اس نے حج کے بعد زندگی کا ورق پلٹ دیا، علماء نے حج مقبول کی علامت یہی لکھی ہے کہ برا تھا نیک بن کر آیا، نیک تھا نکھر کر آیا، اگر ڈاڑھی منڈاتا ہوا گیا تھا اور ڈاڑھی منڈاتا ہوا واپس آیا تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ اللہ کے یہاں اس کا حج قبول نہیں ہوا، یہ علامت قرآن وحدیث میں نہیں ہے، علماء نے بیان کی ہے۔

غرض توبہ میں تین چیزیں ضروری ہیں: پہلے: گناہ پر پشیمانی، پھر: آئندہ نہ کرنے کا عہد، اور اگر خدانخواستہ دوبارہ گناہ ہو جائے تو پھر توبہ کرے، اور تیسرے: قول سے یا فعل سے اللہ سے معافی کا طلب گار ہونا۔ پس فرمایا کہ ان تین گناہوں میں سے کوئی گناہ اگر کسی سے ہو گیا تو توبہ کرے اور جو توبہ نہیں کرے گا اللہ کے یہاں وہی مجرم ہے۔ اور مسلم شریف کی روایت میں ہے: **التائب من الذنب کمن لا ذنب له:** آدمی اپنے گناہوں سے توبہ کر لے تو ایسا صاف ہو جاتا ہے جیسے اس نے گناہ کیا ہی نہیں۔

میرے بھائیو! یہ مبارک مہینہ چل رہا ہے اس میں اپنی ہر برائی سے توبہ کرو، جو ڈاڑھی منڈاتے ہیں وہ اس سے توبہ کریں، جو سود دیتے لیتے ہیں وہ اس سے توبہ کریں جو دوسروں کو ستاتے ہیں وہ اس سے توبہ کریں۔

اس کے بعد جو آیت ہے اس میں بھی جھگڑے کے تین اسباب بیان کئے گئے ہیں:

ایک: بدگمانی کرنا، دوسرا: ٹوہ میں لگنا، تیسرے: غیبت کرنا۔ یہ تینوں چیزیں بھی جھگڑے کھڑے کرتی ہیں چنانچہ فرمایا: ﴿يٰأَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا اجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِنَ الظَّنِّ﴾: اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو! بہت سے گمانوں سے بچو۔ جب بہت سے گمان کہا تو بعض گمانوں کا استثناء خود بخود ہو گیا، یعنی اللہ نے ہر گمان سے منع نہیں کیا، اگر ہر گمان سے منع کر دیا جاتا تو زندگی کا دائرہ بہت تنگ ہو جاتا، آدمی پریشان ہو جاتا اس لئے فرمایا: ﴿كَثِيْرًا مِنَ الظَّنِّ﴾: بہت سے گمانوں سے بچو۔ کیوں بچیں؟ ﴿إِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ إِثْمٌ﴾: بعض گمان گناہ ہوتے ہیں، اور تم کیا جانو کہ تم نے جو گمان باندھے ہیں ان میں سے کونسا گمان گناہ ہے اور کونسا نہیں، جب جانتے نہیں تو گمان کرنے سے بچو۔

گمان سو فیصد ممنوع نہیں، کچھ گمان جائز ہیں، حدیث میں ہے کہ نبی پاک ﷺ نے فرمایا: من الحزم سوء الظن: چوکنا پن بدگمانی ہے، پس بعض بدگمانی کو جائز رکھا ہے جیسے آپ نے نماز کے وقت جوتے اٹھا کر الماری میں رکھے اس بدگمانی سے کہ ہو سکتا ہے کوئی جوتے اٹھا کر لے جائے، اگرچہ آپ کے جوتے کبھی نہیں اٹھے، مگر اٹھتے دیر کیا لگتی ہے، پس آپ کا اس بدگمانی سے اپنے جوتے اٹھا کر رکھنا بھی چوکنا پن ہے، یہی احتیاط ہے، یہ بدگمانی جائز ہے، کیونکہ یہ کسی معین آدمی کے بارے میں بدگمانی نہیں، اور ایسی بدگمانی جائز ہے، پس حدیث سے بدگمانی کے جواز کی ایک شکل نکلی۔

میں اس کی ایک اور مثال دوں، آپ کوئی قیمتی سامان ڈاک سے بھیجنا چاہیں تو رجسٹری بھیجیں، کیوں؟ ہو سکتا ہے ڈاک ضائع ہو جائے، اور سامان قیمتی ہو تو حکومت ذمہ دار ہو گی، سادہ ڈاک میں حکومت کی ذمہ داری نہیں ہوتی، کوئی کہے میری ڈاک تو کبھی ضائع نہیں ہوئی، ٹھیک ہے، لیکن اگر ہو گئی تو؟ اس لئے احتیاط کی بات یہ ہے کہ قیمتی سامان رجسٹری ڈاک سے بھیجا جائے۔ بہر حال بعض گمانوں کا شریعت نے استثناء کیا ہے۔

حدیث: نبی پاک ﷺ کو ایک قبیلہ میں تقسیم کے لئے مال بھیجنا تھا، حضورؐ نے اسی قبیلہ کے ایک صحابی کو بلایا اور ان سے کہا کہ یہ مال لے جاؤ اور اپنے قبیلہ میں تقسیم کر دو، وہ تیار ہو گئے، ایک دوسرے صاحب کو پتہ چلا وہ ان کے پاس آئے اور ساتھ چلنے کی پیش کش کی،

پہلے صحابی نے سوچا اتنا سارا مال ہے، راستہ میں لوٹ کھسوٹ ہوتی رہتی ہے، یہ ساتھ رہیں گے تو ان کا تعاون ملے گا اور بوریت بھی کم ہوگی، وہ یہ سوچ کر حضور ﷺ کی خدمت میں آئے اور کہا یارسول اللہ! مجھے ایک ساتھی مل گیا ہے، آپؐ نے پوچھا: کون ہے؟ کہا: فلاں شخص ہے! آپؐ نے فرمایا: أخاك البكرى فلا تأمنه: یہ عربی کا ایک محاورہ ہے، جس کے معنی ہیں: بکری قبیلہ کا کوئی بھی آدمی ہو اس پر بھروسہ نہیں کرنا چاہئے۔ خیر وہ دونوں چلے، یہ جو دوسرے صاحب تھے ان کے گاؤں سے پہلے کوئی گاؤں آیا انھوں نے کہا: بھائی ذرا تھوڑی دیر رک جاؤ، میری اس گاؤں میں کچھ رشتہ داری ہے، میں ابھی مل کر آیا، وہ رک گئے اور یہ اکیلے گاؤں میں چلے گئے، اِن کے جانے کے بعد اُن کو حضور ﷺ کا ارشاد یاد آیا کہ أخاك البكرى فلا تأمنه وہ فوراً وہاں سے آگے بڑھ گئے، بہت دور گئے تو انھوں نے دیکھا کہ ان کا ساتھی کچھ آدمی لے کر ان کے پیچھے آرہا ہے اور سب کے ہاتھ میں ہتھیار ہیں، چونکہ یہ کافی دور نکل گئے تھے اس لئے بچ گئے۔ پس حضورؐ نے جو جملہ ارشاد فرمایا تھا اس میں آپؐ نے بدگمان رہنے کی تعلیم دی تھی، معلوم ہوا کہ بعض گمان جائز ہیں۔

جائز ناجائز گمان پہچاننے کا طریقہ

رہی یہ بات کہ ہم کیسے جانیں کہ کونسا گمان گناہ ہے اور کونسا گناہ نہیں؟ جواب: گمان ایک بیج ہے، اس بیج سے درخت پیدا ہوتا ہے، پھر اس پر پھول اور پھل آتے ہیں، پس جس گمان پر اچھے ثمرات مرتب ہوں وہ گناہ نہیں، اور جس پر برے ثمرات مرتب ہوں وہ گناہ ہے جیسے مدرسے سے ایک طالب علم فارغ ہوا ہم نے سوچا کہ اس کو مدرس رکھ لیا جائے یہ بہت آگے جائے گا، یہ اچھا گمان ہے، پھر ہمارا گمان پورا ہوا تو سبحان اللہ! نہیں ہوا تو کوئی حرج نہیں۔ یہ وہ گمان ہے جس سے اچھا پھل آیا، یا جیسے ہم نے ایک شخص کے بارے میں گمان کیا کہ یہ اگر چہ غریب ہے مگر ہمارا دشمن ہے اس لئے ہم اسے زکوٰۃ نہیں دیں گے، ارے بھائی جب وہ غریب ہے تو زکوٰۃ کیوں نہیں دیتے؟ اور یہ جو تم کہتے ہو کہ وہ ہمارا دشمن ہے، یہ صرف تمہارا گمان ہے یا اس کی تمہارے پاس کوئی علامت اور دلیل ہے؟ دلیل تو نہیں ہے، پھر یہ تمہارا خالی گمان ہی گمان ہے، گاؤں میں یا رشتہ داریوں میں اس طرح کا گمان بہت

باندھا جاتا ہے، اور خیر کے کاموں میں بھی اس کا تعاون نہیں کرتے۔ یہ وہ گمان ہے جس پر برا پھل آیا، ایسا گمان گناہ ہے۔

الغرض وہ گمان جو کسی معین آدمی پر واقع نہ ہو یا واقع ہو مگر ثمرات اس پر اچھے مرتب ہوں تو وہ جائز ہے اور جو گمان کسی معین آدمی پر واقع ہو یا اس پر برے ثمرات مرتب ہوں وہ ناجائز ہے۔

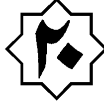
پھر گمان کے بعد اگلا مرحلہ ہے: تجسس، ٹوہ اور سراغ لگانے کا ﴿وَلَا تَجَسَّسُوْا﴾ لوگوں کے احوال کا سراغ مت لگاؤ، ہوتا یہ ہے کہ ایک شخص دوسرے سے بدگمان ہوجاتا ہے، اور مخالف کی ہر بات کو برائی پر محمول کرتا ہے، پھر اس پر الزام لگانا شروع کرتا ہے اور اس کی ٹوہ میں لگ جاتا ہے کہ کوئی برائی کی بات ہاتھ لگے تو اس کو خوب اچھالے، کوئی بھید کی بات ہاتھ لگے تو اس پر حاشیے چڑھائے، اور اس کی غیبت سے اپنی مجلس گرم کرے، اس لئے اس آیت میں بھید ٹٹولنے اور ٹوہ لگانے سے منع کیا، کیونکہ یہ بات اختلاف اور تفریق کو بڑھاوا دیتی ہے، اور بات لڑائی جھگڑے تک پہنچ جاتی ہے۔

پھر تجسس کے بعد اگلا مرحلہ غیبت کا ہے، چنانچہ فرمایا: ﴿وَلَا يَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا﴾: ایک دوسرے کی پیٹھ مت کاٹو، کسی کی برائیاں مت اچھالو، گندگی میں ڈھیلا پھینکنے سے کیا فائدہ؟ اس سے تو گندگی اچھلے گی۔

ہاں جہاں غیبت کا کچھ فائدہ ہو تو جائز ہے، علماء نے ایسی چھ جگہیں متعین کی ہیں جہاں غیبت جائز ہے، ان میں سے ایک جگہ ہے رجال حدیث پر جرح کرنا، کیونکہ اس کے بغیر دین کا محفوظ رکھنا محال ہے۔

پھر فرمایا: مسلمان بھائی کی غیبت کرنا ایسا گھناؤنا گناہ ہے جیسے کوئی اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت نوچ کر کھائے، اس کو تو ہر شخص برا سمجھتا ہے، پھر کسی کی غیبت کیوں کرتا ہے؟ اللہ سے ڈرو، اس کی نصیحتوں پر کاربند رہو اور کوئی غلطی سرزد ہوجائے تو صدق دل سے توبہ کرو، اللہ تعالیٰ اپنی مہربانی سے معاف فرمادیں گے!

وآخر دعوانا أن الحمدللہ رب العالمين



حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دو واقعات

(ستارہ پرستوں اور صنم پرستوں سے گفتگو)

خطبہ مسنونہ کے بعد: ﴿وَلَقَدْ آتَيْنَا إِبْرَاهِيمَ رُشْدَهُ مِنْ قَبْلُ وَكُنَّا بِهِ عَالِمِيْنَ﴾
بزرگو اور بھائیو! آج حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ایک واقعہ سورۂ انبیاء میں پڑھا گیا ہے، اس کے علاوہ حضرت ابراہیمؑ کے تین واقعے پہلے گذرے ہیں اور ایک واقعہ آگے آئے گا، حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زندگی کے یہ پانچ واقعات بڑی اہمیت کے حامل ہیں، اور قرآن کریم چونکہ واقعات کی کتاب نہیں اس لئے جس واقعہ کا جہاں موقع ہوتا ہے وہاں وہ واقعہ بیان کیا جاتا ہے، سارے واقعات اکٹھا کر کے ایک سلسلہ بیان میں بیان نہیں کئے جاتے۔

نوح علیہ السلام آدم ثانی ہیں

حضرت آدم علیہ السلام انسانوں کے پہلے باپ ہیں اور حضرت نوح علیہ السلام دوسرے، سورۂ صافات میں ہے ﴿وَجَعَلْنَا ذُرِّيَّتَهُ هُمُ الْبَاقِيْنَ﴾: ہم نے ان کی اولاد کو باقی رہنے دیا یعنی اور کسی کی نسل نہیں چلی، طوفان میں سب غرق ہو گئے، یہ طوفان ساری دنیا میں نہیں آیا تھا صرف اس علاقہ میں آیا تھا جہاں حضرت نوح علیہ السلام رہتے تھے؟ حضرت آدم اور حضرت نوح علیہما السلام کے درمیان دس باپ ہیں، یہ سلسلۂ نسب بائبل میں ہے، سچ یا جھوٹ وہ جانیں، اور دس باپوں کی اولاد اتنی نہیں ہو سکتی کہ ان سے ساری زمین بھر جائے، پس معلوم ہوا کہ حضرت نوح علیہ السلام جہاں تھے وہی علاقہ انسانوں سے آباد تھا، وہاں طوفان آیا اور

سب انسان غرق ہو گئے، صرف کشتی میں جو اسّی مرد و زن تھے وہی بچے، پھر ان کی نسلیں چلیں، رفتہ رفتہ سب کی نسلیں منقطع ہو گئیں، حضرت نوح علیہ السلام کے جو تین بیٹے کشتی میں تھے انہی کی نسلیں آگے چلیں، اور آج دنیا کے تمام انسان نوحؑ کے ان تین بیٹوں کی اولاد ہیں، اس لئے حضرت نوحؑ آدم ثانی ہیں، دوسرے باپ ہیں، اسی بات کو سورۂ صافات کی اس آیت میں بیان کیا گیا ہے کہ نوحؑ کی اولاد ہی کو ہم نے باقی رہنے والا بنایا۔

حضرت نوح علیہ السلام کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام کا دور آیا

حضرت نوحؑ کے بعد حضرت ابراہیمؑ کا دور آیا، کتنے عرصہ بعد؟ معلوم نہیں، حضرت نوح اور حضرت ابراہیم علیہما السلام کے درمیان کوئی عظیم الشان اولوالعزم پیغمبر مبعوث نہیں ہوئے، حضرت نوحؑ کے بعد جو بڑی شخصیت پیدا ہوئی وہ حضرت ابراہیمؑ کی تھی، حضرت ابراہیمؑ کی خصوصیت یہ ہے کہ آپ کے بعد جو نبی آیا اور جو کتاب نازل ہوئی وہ آپ کی اولاد میں نازل ہوئی، ان کی یہ خصوصیت قرآن کریم میں ہے: ﴿وَجَعَلْنَا فِيْ ذُرِّيَّتِهِمُ النُّبُوَّةَ وَالْكِتَابَ﴾: ابراہیمؑ کی نسل میں ہم نے نبوت اور کتاب گردانی، ایک سلسلہ حضرت اسحاق علیہ السلام سے چلا، حضرت اسحاق، حضرت یعقوب، حضرت یوسف، حضرت یوسف کے چار سو سال بعد حضرت موسیٰؑ ہوئے، پھر بنی اسرائیل آئے، بنی اسرائیل میں ایک لاکھ انبیاء آئے، اور سب سے آخر میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام خاتم انبیاء بنی اسرائیل آئے۔ اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں خاتم النّبیین حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ ہیں، چونکہ ہمارے نبی حضرت ابراہیمؑ کی اولاد میں ہیں اور ملت ابراہیمی اور ملت اسماعیلی پر مبعوث ہوئے ہیں، اس لئے حضرت ابراہیم کے چند اہم واقعات قرآن میں آئے ہیں اور وہ پانچ واقعات ہیں۔

ستارہ پرست اور صنم پرست

حضرت ابراہیمؑ جس قوم کی طرف مبعوث کئے گئے تھے وہ قوم دو حصوں میں بٹی ہوئی تھی، کچھ لوگ ستاروں کو پوجتے تھے اور کچھ مورتیوں کو، ان دونوں کی طرف حضرت ابراہیمؑ

مبعوث کئے گئے تھے، حضرت ابراہیمؑ نے اپنی قوم کے ان لوگوں کو جو آسمان کے تاروں کو پوجتے تھے اللہ کی وحدانیت کیسے سمجھائی؟ کیا دلیل ان کے سامنے پیش کی؟ اور جو لوگ مورتیوں کو پوجتے تھے ان کو حضرت نے کس طرح اللہ کی وحدانیت اور معبودیت سمجھائی؟ اور بتوں کی بے ثباتی اور بے حیثیتی کس طرح ان کے ذہن نشیں کی؟ یہ دو واقعے ہیں، پھر جب قوم نے مندر کی مورتیوں کو توڑنے کا معاملہ نمرود کے سامنے رکھا جو خدائی کا دعوے دار تھا کہ ابراہیمؑ نے ہمارے بتوں کی گت بنائی ہے، اس وقت حضرت ابراہیمؑ کا اس بادشاہ کے ساتھ مناظرہ ہوا، یہ تیسرا واقعہ ہے، چوتھا واقعہ یہ ہے کہ حضرت نے اپنے بڑے بیٹے حضرت اسماعیلؑ کو جہاں آج کعبہ ہے بسایا، پھر جب حضرت اسماعیلؑ بڑے ہوئے، باپ کی مدد کے قابل ہوئے تو دونوں نے مل کر کعبہ شریف تعمیر کیا، اور پانچواں واقعہ یہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کو حکم دیا گیا کہ اپنے بیٹے کی قربانی کرو، چنانچہ انہوں نے حضرت اسماعیل کی قربانی کے سارے جتن کر لئے، پھر اللہ کی وحی آئی کہ تمہارا امتحان ہو گیا، قربانی مقصود نہیں، اور دنبہ بھیجا کہ اسماعیل کی جگہ اس کی قربانی کرو، چنانچہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی جگہ دنبہ کی قربانی کی، اور یہ قربانی حضرت اسماعیلؑ کی اولاد میں یادگار بن کر چلی اور آج تک وہ قربانی چل رہی ہے، حضرت اسحاق کی نسل یعنی یہود و نصاریٰ میں یہ قربانی نہیں، قربانی کی یہ سنت حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں ہے اگرچہ بائبل نے اس قربانی کے واقعے میں حضرت اسماعیلؑ کا نام کاٹ کر حضرت اسحاق کا نام رکھ دیا ہے، یہ جھوٹ ہے، اگر حضرت اسحاق کی قربانی ہوئی ہوتی تو حضرت اسحاق کی نسل میں یہ یادگار کے طور باقی رہتی جبکہ یہود و نصاریٰ میں قربانی نہیں، یہ بائبل میں تحریف کی صاف دلیل ہے، بہر حال یہ پانچ واقعے قرآن کریم نے متفرق جگہوں پر بیان کئے ہیں، ان میں سے دو واقعات آج حافظوں نے پڑھے ہیں میں مناسب سمجھتا ہوں کہ ان کی تھوڑی تفصیل آپ حضرات کے سامنے پیش کروں۔

ستارہ پرستوں سے گفتگو

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قوم کے کچھ لوگ ستاروں کو پوجتے تھے اور ستاروں کے

پجاری کسی ایک ستارہ کونہیں پوجتے تھے، جیسے مورتیوں کے پجاری کسی ایک مورتی کونہیں پوجتے، دسیوں بیسیوں مورتیوں کو پوجتے ہیں، ایسے ہی ستاروں کو پوجنے والے بھی کسی ایک ستارے کونہیں پوجتے، کوئی کسی کو پوجتا ہے، کوئی دوسرے کو پوجتا ہے، حضرت ابراہیمؑ نے ان ستاروں کے پوجنے والوں سے سب سے پہلے چھوٹے ستارے کے بارے میں گفتگو کی ﴿فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ اللَّيْلُ﴾ جب رات چھا گئی ﴿رَأٰى كَوْكَبًا﴾ تو حضرت ابراہیمؑ نے ایک ستارہ دیکھا، یہ کوئی ایسا ستارہ تھا جو رات کو گیارہ بارہ بجے نکلتا تھا کیونکہ آیت میں جَنَّ ہے یعنی رات چھا گئی، بہرحال دس گیارہ بجے کوئی ستارہ نکلا جس کو قوم پوجتی تھی تو حضرت ابراہیمؑ نے ان سے کہا: هٰذَا رَبِّيْ: یہ میرا پروردگار ہے، میرے عقیدے کے مطابق نہیں، تمہارے عقیدے کے مطابق، یعنی تم کہتے ہو کہ یہ خدا ہے اور سبھی انسانوں کا خدا ہے تو یہ میرا بھی خدا ہے، قوم نے کہا آج تو ابراہیم ڈھیلے پڑے ہیں، سمجھداری کی بات کررہے ہیں، لیکن وقت گزرنے کے ساتھ وہ ستارہ ڈوب گیا تو حضرت نے کہا: ﴿لَا أُحِبُّ الْآفِلِيْنَ﴾: ڈوبنے والے خدا کو میں پسند نہیں کرتا، لہٰذا یہ میرا خدا نہیں ہوسکتا، اس کو عربی میں کہتے ہیں: **مماشاة مع الخصم**، جس سے مناظرہ ہورہا ہے تھوڑی دیر اس کے ساتھ چلنا، طالب علموں میں ہم اس کی مثال یہ دیتے ہیں: تین طالب علموں نے طے کیا کہ چوتھے کو آج عصر کے بعد مارنا ہے، چنانچہ صبح سے یہ تینوں اس کے پیچھے لگ گئے، ایک نے کہا: یار گنا کھائے بہت دن ہوگئے، آج عصر کے بعد گنا کھانے چلیں گے، دوسرا ملا اس نے کہا: ارے یار تیرے پاس پیسے ہیں یا نہیں؟ گنا کھائے بہت دن ہوگئے ہیں، میرے پاس پیسے ہیں، میں کھلاؤں گا، بہرحال صبح سے تین چار مرتبہ اس سے ملے، اور عصر کے بعد چاروں چلے، راستہ میں گنا خریدا، اور کھاتے کھاتے جب شہر سے باہر گئے تو وہی گنا ڈنڈا بن گیا، صبح سے عصر تک میٹھی میٹھی باتیں کیں یہی **مماشاة مع الخصم** ہے اگر شروع سے دشمنی ظاہر کرتے تو وہ ساتھ آتا ہی نہیں، پھر پٹائی کیسے کرتے؟ اسی طرح اگر ستارہ نکلتے ہی کہتے کہ یہ میرا خدا نہیں، میں اس کونہیں مانتا تو بات کیسے چلتی؟ ان پر حجت تام کیسے ہوتی، اس لئے **مماشاة مع الخصم** کی اور کہا: ﴿هٰذَا رَبِّيْ﴾ چنانچہ وہ قریب آئے پھر ستارہ ڈوبا تو حضرت نے صاف کہا: ﴿لَا أُحِبُّ الْآفِلِيْنَ﴾:

ایک پوائنٹ دماغوں میں بٹھا دیا کہ جو چھپ جائے، غائب ہو جائے وہ خدا کیسے ہو سکتا ہے؟

پھر کسی اور رات چاند نکلا تو حضرت نے پھر قوم کے لوگوں سے کہا: ﴿هٰذَا رَبِّیْ﴾: یہ میرا رب ہے، یعنی وہ ستارہ تو ڈوب گیا، اب یہ میرا رب ہے، پھر تھوڑے اور قریب آئے، جب چاند بھی اپنے وقت پر غروب ہو گیا تو حضرت نے فرمایا: دیکھو یہ بھی ڈوب گیا اور میں یہ پہلے بتلا چکا ہوں کہ ڈوبنے والا اور غائب ہونے والا خدا نہیں ہو سکتا، پھر خدا ہے کون؟ یہ بات خدا ہی بتائے گا دوسرا نہیں بتا سکتا، اگر اللہ کی طرف سے سمجھ نہ دی جائے تو آج کتنے بڑے بڑے پڑھے لکھے ہیں لیکن اللہ کے علاوہ دوسروں کی خدائی میں پھنسے ہوئے ہیں، پتھروں اور غیر اللہ کو پوج رہے ہیں، ایسا کیوں ہے؟ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ نکتہ سمجھایا: ﴿لَئِنْ لَّمْ يَهْدِنِیْ رَبِّیْ لَأَكُوْنَنَّ مِنَ الْقَوْمِ الضَّالِّيْنَ﴾: اگر میرا پروردگار مجھے صحیح راستہ نہ دکھائے تو میں گمراہوں میں سے ہو جاؤں گا، میں از خود اللہ کو نہیں پہچان سکتا، ایک اللہ کی معبودیت کا اقرار آدمی اپنی عقل سے نہیں کر سکتا، اللہ کی توفیق شامل حال ہو تو اس کی سمجھ میں بات آئے گی ورنہ نہیں، اسی وجہ سے اللہ تعالی نے پہلے انسان سے لے کر آخری پیغمبر تک کم و بیش ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء لا إلٰه إلا الله کی تعلیم دینے کے لئے بھیجے، ان انبیاء نے آ کر محنتیں کیں پھر بھی انسانوں کی اکثریت آج تک اس بات کو نہیں سمجھی۔ بہر حال حضرت ابراہیمؑ نے فرمایا کہ اگر میرا پروردگار مجھے صحیح راستہ نہ دکھائے تو میں گمراہوں میں سے ہو جاؤں گا۔

پھر ایک وقت کے بعد سورج کی طرف لوگوں کو متوجہ کیا اور کہا: ﴿هٰذَا رَبِّیْ، هٰذَا أَكْبَرْ﴾: یہ میرا پروردگار ہے اور اس سے بڑا کوئی ستارہ نہیں، اگر خدا ہے تو یہ ہو سکتا ہے پھر ایک وقت کے بعد سورج بھی ڈوب گیا، تب حضرت نے ڈنکے کی چوٹ اعلان کیا: ﴿يا قَوْمِ إِنِّیْ بَرِیْءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ﴾: جن ستاروں کو تم پوجتے ہو، خدا مانتے ہو میں ان سے بری اور بیزار ہوں، ان میں سے کوئی میرا خدا نہیں، ماننا نہ ماننا تو انسان کا اختیار ہے لیکن حضرت ان کو اس مرحلہ تک لے آئے کہ ان کی بولتی بند ہو گئی، حجت تام کر دی اور آدمی اتنا ہی کر سکتا ہے، کسی کو راہ راست پر لے آنا انسان کے بس کی بات نہیں، قرآن میں ہے: ﴿إِنَّكَ لَاتَهْدِیْ مَنْ أَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِیْ مَنْ يَّشَآءُ﴾: آپ جس کو چاہیں سیدھا راستہ دکھا دیں یہ ممکن

نہیں، اللہ جسے چاہیں اسے سیدھا راستہ دکھاتے ہیں۔

کائنات کی کوئی حالت اللہ کی قدرت سے باہر نہیں

سوال: یہاں کوئی یہ سوال کرسکتا ہے کہ جب تک اللہ توفیق نہیں دیں گے بات سمجھ میں نہیں آسکتی، تو اگر کسی انسان کو ہدایت نہیں ملی تو اس میں اس کا قصور کیا ہے؟

جواب: پوری کائنات اللہ کی پیدا کی ہوئی ہے، پس کائنات کی کوئی حالت اللہ کی قدرت سے باہر نہیں ہوسکتی، اگر مخلوق کی کوئی حالت اللہ کی قدرت سے باہر ہو جائے تو پھر اللہ اللہ کہاں رہے؟ قادر مطلق کہاں ہوئے؟ مخلوق بھی قادر ہوگئی لہٰذا مخلوق کی کوئی حالت اللہ کی قدرت سے باہر نہیں ہوسکتی، اور ہم جو چاہتے ہیں یہ بھی ہماری ایک حالت ہے اگر ہم چاہنے میں مختار ہوں تو پھر ہم بھی خدا ہوگئے کیونکہ ہمارا چاہنا ہمارے اختیار میں ہوگیا، یہ نہیں ہوسکتا، ہمارا چاہنا بھی اللہ کے چاہنے کے تابع ہے، قرآن میں ہے: ﴿وَمَا تَشَاءُ وْنَ إِلَّا أَنْ يَّشَاءَ اللّٰهُ رَبُّ الْعَالَمِيْنَ﴾ تم چاہ نہیں سکتے جب تک اللہ نہ چاہیں، لہٰذا یہ بات تو بالکل طے ہوگئی کہ اللہ تعالی خالق ہیں اور ساری کائنات مخلوق ہے اور مخلوق کی کوئی حالت اللہ کی قدرت سے باہر نہیں ہوسکتی، مخلوق کا چاہنا بھی اللہ کے چاہنے کے تابع ہے۔

جب ہمارا چاہنا بھی اللہ کے چاہنے کے تابع ہے تو پھر بھینس اور ہم میں کیا فرق رہا؟ بھینس کھونٹے سے کھل گئی، آبادی میں بھاگی ایک بچہ کو کچلا، دوسرے کو مارا، پہلی حالت اور دوسری حالت میں بھینس پر کوئی فرق نہیں پڑا، جس بے دردی سے اس نے پہلے بچے کو کچلا دوسرے کو بھی اسی طرح کچلا، تیسرا بچہ آیا تو وہ بھی کچلا گیا، پھر لوگوں نے بھینس کو پکڑا اور بچوں کے وارثین نے ڈنڈے بجانے شروع کئے، تھوڑی دیر تو لوگ خاموش رہے پھر کہیں گے: بھائی! کتنا مارو گے، جانور ہی تو ہے، اور کوئی مقدمہ بھینس پر نہیں کرتا۔ غرض تین بچے کچلنے کے باوجود بھینس کے دل کی حالت یکساں ہوگی، اس کے برخلاف انسان اگر بے خبری میں ...... جان بوجھ کر کوئی شریف آدمی ایسا کر ہی نہیں سکتا ...... اس کی گاڑی کے نیچے کوئی بچہ آجائے تو انسان کے قلب کا برا حال ہو جاتا ہے اور پھر سالوں ایسی غلطی اس سے دوبارہ نہیں

ہوتی، دور سے بچے کو دیکھ کر سنبھل جاتا ہے اور اگر کوئی آدمی جان بوجھ کر بچے کو کچل دے تو لوگ اس کو پکڑ کر پہلے تو ماریں گے پھر کورٹ کی ذریعہ کیفر کردار کو پہنچائیں گے اور پھانسی دلوائیں گے۔

سوال یہ ہے کہ انسان اور بھینس کے عمل میں یہ فرق کیوں ہے؟ جواب انسان کو اللہ نے اختیار دیا ہے مگر کسی بھی معاملہ کا پورا اختیار نہیں دیا بلکہ جزوی اختیار دیا ہے، حضرت علی کرم اللہ وجہ کے پاس ایک شخص آیا اس نے یہی سوال کیا کہ انسان مجبور ہے یا مختار؟ حضرت نے جواب دیا: اختیار بھی رکھتا ہے اور مجبور بھی ہے، اس نے پوچھا: یہ کیسے؟ حضرت نے فرمایا: کھڑے ہو جاؤ، کھڑا ہو گیا، فرمایا: ایک پیر اٹھالو، اٹھالیا، کہا: دوسرا بھی اٹھالو، کہنے لگا! دوسرا کیسے اٹھاؤں؟ حضرت نے فرمایا: دیکھو اتنا تمہارا اختیار ہے کہ بیٹھے تھے کھڑے ہو گئے۔ پھر ایک پیر اٹھالیا، یہاں تک تمہارا اختیار تھا اب آگے تم مجبور ہو، اسی طرح حضرت علیؓ نے سمجھایا کہ انسان کو جزوی اختیار دیا گیا ہے اور یہ جزوی اختیار اللہ نے انسان کو دیا ہے بھینس کو نہیں دیا اسی جہ سے انسان اور بھینس کا حال الگ الگ ہے۔

دور صحابہ کا ایک قصہ ہے، صحابہ کا لشکر جا رہا تھا ایک صحابی جن کا لقب سفینہ تھا کسی وجہ سے لشکر سے پیچھے رہ گئے چلتے چلتے رات ہوگئی اور لشکر نظر نہیں آرہا، مغرب کے بعد پہاڑ سے ایک شیر اترا اور حضرت کی طرف بڑھا، جب قریب آیا تو حضرت نے اس سے کہا: یا أبا الحارث تعال: اے ابوالحارث (شیر کی کنیت) یہاں آ، وہ قریب آیا تو حضرت نے اس سے کہا: میں رسول اللہ کا صحابی ہوں اور لشکر سے بچھڑ گیا ہوں، رات ہوگئی ہے مجھے لشکر میں پہنچا، اس نے گھوم کر اشارہ کیا کہ میرے اوپر سوار ہو جاؤ، حضرت بیٹھ گئے اور وہ یہ جا وہ جا، لشکر جب قریب آیا تو وہ رک گیا، حضرت اتر گئے اور وہ واپس لوٹ گیا، یہ کون شیر تھا جس نے اتنا بڑا کارنامہ انجام دیا؟ اللہ جانے کون تھا!

دوسرا واقعہ سنو! غزوۂ احد میں جب شکست کی صورت بنی تو نبی پاک ﷺ ایک چٹان پر چڑھنا چاہتے تھے، مگر وہ چٹان بہت اونچی تھی حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ گھوڑا بنے اور حضور ان کی پیٹھ پر چڑھے، پھر وہ کھڑے ہوئے تو حضورؐ ان کے کندھوں پر پیر رکھ کر چٹان پر چڑھے

اور حضورؐ نے فرمایا: أَوْجَبَ طلحة: طلحہ کے لئے جنت واجب ہوگئی، طلحہ یہ عمل کریں تو ان کے لئے جنت واجب ہوجائے اور وہ شیر پیٹھ پر بٹھا کر لشکر تک لا کر چھوڑے تو اس کا کوئی خاص تذکرہ نہ ہو کہ یہ شیر کون تھا؟ جنت اس کو ملی یا نہیں؟ ان دو میں فرق کیوں ہے؟ شیر نے جو کام کیا ہے وہ تکوینی نظام کے تحت کیا ہے اپنی مرضی سے نہیں کیا اور حضرت طلحہؓ نے جو کام کیا ہے اس میں ان کی مرضی کا دخل ہے، ان کا جزوی اختیار اس میں ہے تو ان کے لئے وہ عمل جنت کا موجب بن گیا اور تاریخ میں سنہرے حروف سے یہ واقعہ درج ہوا۔

یہ میں حیوان اور انسان کے درمیان فرق سمجھا رہا ہوں کہ حیوانات کو اللہ نے جزوی اختیار نہیں دیا اسی لئے بھینس کے دل پر تین بچے کچل دینے کے باوجود کوئی اثر نہیں ہوا اور انسان کی گاڑی کے نیچے اگر ایک بچہ آجائے تو اس کا دل دہل جاتا ہے کہ خدایا مجھ سے یہ کیا ہوگیا، اور زندگی بھر وہ کانٹا اس کے دل سے نہیں نکلتا اور کوئی جان بوجھ کر ایسا کرے تو لوگ اس کو پھانسی دلوا کر چھوڑتے ہیں کیونکہ انسان جو کچھ کرتا ہے وہ اپنے جزوی اختیار سے کرتا ہے اور اسی جزوی اختیار پر آخرت میں جزاؤسزا کا مدار ہے اسی طرح انسان ہدایت کے لئے جب یہ جزوی اختیار استعمال کرے گا تب اللہ تعالی ہدایت دیں گے، الغرض جب اللہ ہدایت دیتے ہیں تب ہدایت ملتی ہے اور اللہ کب دیتے ہیں؟ جب انسان جزوی اختیار سے ہدایت چاہتا ہے۔

بہر حال میں عرض یہ کررہا تھا کہ حضرت ابراہیمؑ نے دوٹوک اعلان کیا: ﴿إِنِّى بَرِىْءٌ مِمَّا تُشْرِكُوْنَ﴾: جن ستاروں کو تم اللہ کے ساتھ خدائی میں شریک گردانتے ہو میرا ان سے کوئی تعلق نہیں، ان کو اس مرحلہ پر لائے کہ اب آگے ان کے پاس کوئی دلیل نہیں رہی اسی حد تک انسان قائل کرسکتا ہے اس سے آگے انسان کے لئے لمحۂ فکریہ پیدا ہو اور وہ کوشش کرے تو اللہ کی طرف سے فیضان کا دروازہ کھلتا ہے اور ہدایت نصیب ہوتی ہے۔

صنم پرستوں سے معاملہ

اور جو لوگ مورتی پوجا کرتے تھے ان میں حضرت کا باپ بھی تھا، وہ مہنت تھا، حضرت

نے اس مسئلہ پر اپنے باپ سے بھی گفتگو کی ہے جو سورۂ مریم میں آئی ہے، قوم کو بھی سمجھایا ہے مگر جب انسان کی عقل پر پتھر پڑ جاتے ہیں تو وہ پتھر کو خدا بنا لیتا ہے، حضرت نے ایک دن قوم سے کہا: تمہارے ان خداؤں کی ایک دن میں گت بناؤں گا جب تم یہاں نہیں ہوؤ گے، بات گئی گزری ہوگئی، پھر ایک میلہ آیا جس میں سب کو جانا تھا تو باپ نے بیٹے سے کہا کہ ابراہیم تو بھی چل حضرت نے کہا: ﴿إِنِّیْ سَقِیْمٌ﴾: میری طبیعت ناساز ہے، اور یہ بات ستاروں کو دیکھتے ہوئے کہی، لوگوں نے سمجھا کہ انہوں نے ستاروں کی چالیں دیکھ کر یہ اندازہ لگایا ہے فی الحال تو بیمار نہیں، آگے چل کر بیمار پڑیں گے، لوگوں نے ان کو چھوڑ دیا اور میلے میں چلے گئے، ان کے جانے کے بعد جب مندر خالی ہو گیا تو حضرت نے کلہاڑی لی اور سب کو مار مار کر زمین بوس کر دیا اور جو سب سے بڑا بت تھا اس کو باقی رہنے دیا اور کلہاڑا اس کی گردن میں لٹکا دیا، تین دن کے بعد وہ لوگ آئے اور مندر کا حال دیکھا تو بڑا شور مچایا کہ ہمارے خداؤں کے ساتھ یہ حرکت کس نے کی؟ سب جانتے تھے کہ بستی میں صرف ابراہیم تھے اور وہ پچھلی بات بھی یاد آئی کہ ابراہیم نے ایک دن کہا تھا کہ جب تم یہاں نہیں ہوؤ گے تو میں ان کی گت بناؤں گا، لہٰذا یہ حرکت اسی کی ہے، چنانچہ لوگوں نے ان سے اس بارے میں پوچھا حضرت نے جواب دیا: ﴿بَلْ فَعَلَهٗ﴾: بلکہ کیا ہے اس کو جس نے کیا ہے ﴿كَبِیْرُهُمْ هٰذَا فَاسْئَلُوْهُمْ﴾ یہ گرو گھنٹال کلہاڑا لئے کھڑا ہے اس سے پوچھو یہ حرکت کس نے کی ہے؟ لوگ بھی سمجھتے تھے کہ یہ گرو نہ توڑ سکتا ہے اور نہ بول سکتا ہے، تو ان کی دماغوں کی چولیں ہل گئیں کہ ہم کسے پوجتے ہیں: ﴿ثُمَّ نُكِسُوْا عَلٰى رُءُوْسِهِمْ لَقَدْ عَلِمْتَ مَا هٰٓؤُلَآءِ یَنْطِقُوْنَ﴾: مگر کتے کی دم ٹیڑھی ہی رہی۔

ابراہیم علیہ السلام نمرود کے دربار میں

چنانچہ وہ مقدمہ بادشاہ کے پاس لے گئے جو خود خدائی کا دعوے دار تھا، حضرت ابراہیمؑ دربار میں بلائے گئے، حضرت جب پہنچے تو بادشاہ نے سوال کیا کہ تم نے قوم کے خداؤں کو ڈھا دیا، پھر تمہارا خدا کون ہے؟ حضرت نے فرمایا: ﴿رَبِّیَ الَّذِیْ یُحْیٖ وَیُمِیْتُ﴾: میرا

پروردگار وہ ہے جو جلاتا ہے اور مارتا ہے، بادشاہ نے کہا کہ یہ کام تو میں بھی کرتا ہوں اور فوراً ایک بے گناہ کی گردن اتار دی اور کہا: دیکھ میں نے مار دیا، اور ایسا ایک آدمی جس کی پھانسی کا فیصلہ ہو چکا تھا اس کو بلایا اور آزاد کر دیا اور کہا: دیکھو یہ مرا ہوا تھا میں نے اس کو زندہ کر دیا، حالانکہ جلانے اور مارنے کا یہ مطلب نہیں تھا، مگر اس خر دماغ کو کون سمجھائے، اور مناظرہ میں گھری بات آجائے تو وہ کوئی زیادہ اچھا اثر نہیں چھوڑتی اس لئے حضرت نے اس دلیل کو چھوڑ کر دوسری دلیل پیش کی اور فرمایا: ﴿فَإِنَّ اللّٰهَ يَأْتِيْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَأْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ﴾: میرا پروردگار وہ ہے جو روزانہ مشرق سے سورج نکالتا ہے اگر تو کائنات کا پروردگار ہے تو آئندہ کل مغرب سے سورج نکال ﴿فَبُهِتَ الَّذِيْ كَفَرَ﴾: بادشاہ ہکا بکا رہ گیا اور کوئی جواب نہ دے سکا۔

ہمارا طالب علم کہتا ہے: بادشاہ جواب دے سکتا تھا کہ روزانہ مشرق سے سورج میں نکالتا ہوں، ابراہیم! تو اپنے خدا سے کہہ کہ آئندہ کل مغرب سے سورج نکالے، جب طالب علم یہ کہتا ہے تو میں اس سے کہتا ہوں: نمرود تیرے جتنا بے وقوف نہیں تھا اگر وہ ایسا کہتا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کو کیا دیر لگتی، وہ ہاتھ اٹھاتے کہ پروردگار! کل سورج مغرب سے نکلے! اللہ مغرب سے نکال دیتے، اللہ کے لئے کیا مشکل تھا؟ مگر وہ جانتا تھا کہ مشرق سے سورج میں نہیں نکالتا اور مغرب سے نکالنے کے لئے میں اس سے کہوں گا تو یہ دعا کرے گا اور سورج کل مغرب سے نکل آئے گا، ﴿وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَا أَنْفُسُهُمْ﴾: انبیاء کے مخالفین کو انبیاء کے سچے ہونے کا یقین ہوتا ہے مگر پھر بھی وہ انکار کرتے ہیں، نمرود بھی دل میں سب کچھ سمجھ رہا تھا مگر وہ زبان سے انکار کر رہا تھا، وہ اتنا بڑا بے وقوف نہیں تھا کہ ایسی بات کہتا۔

دو واقعے جن کا نمرود کے واقعہ سے تعلق ہے

سورۂ بقرہ میں جہاں یہ واقعہ آیا ہے اس کے بعد کی دو آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے دو واقعے اور ذکر کئے ہیں، ایک واقعہ: بنی اسرئیل کے ایک بزرگ کا ہے جس میں اللہ تعالی نے ان کو سو سال تک مارے رکھا تھا، پھر سو سال بعد ان کو زندہ کیا اور ان کے سامنے ان کے گدھے کو بھی

زندہ کیا دوسرا واقعہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر کیا ہے جس میں حضرت ابراہیمؑ نے اللہ تعالیٰ سے اطمینان قلب کے لئے سوال کیا تھا کہ اے میرے پروردگار! آپ مردوں کو زندہ کس طرح کریں گے؟ اللہ نے ان کو چار پرندے زندہ کر کے دکھائے کہ یوں زندہ کرونگا، یہ دونوں واقعات ذکر کر کے اللہ نے جلانے کی مثال دی ہے کہ نمرود اتنا کوڑھ مغز تھا کہ جلانے کی حقیقت نہیں سمجھا، جلانا اس کو نہیں کہتے کہ سزائے موت کے مجرم کو چھوڑ دیا جائے یہ جلانا نہیں، ہم نے بنی اسرئیل کے بزرگ اور ان کے گدھے کو جلایا یہ جلانا ہے اسی طرح ہم نے ابراہیم علیہ السلام کے لئے پرندوں کو جلایا یہ جلانا ہے۔

نمرود نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں کیوں ڈالا؟

خیر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بات کا اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا، وہ ہکا بکا رہ گیا، مثل ہے کھسیانی بلی کھمبا نوچے، بلی کتے سے لوہا لے نہیں سکتی اس لئے کھمبے پر غصہ نکالتی ہے غصہ میں بادشاہ نے کہا! اے ابراہیم! میں تیری بات نہیں مانتا اور تو کہتا ہے کہ تیری بات نہ ماننے والا جہنم میں جائے گا اور ماننے والا جنت میں جائے گا، دیکھ تجھے میں جہنم میں ڈالوں گا اور میں خود جنت میں جاؤں گا، چنانچہ اس نے دو کام ایک ساتھ شروع کئے، ایک جنت بنانی شروع کی، دوسری حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جلانے کے لئے لکڑیاں جمع کیں، یہ لکڑیاں کوئی پانچ دس گٹھر نہیں تھیں، اہل تاریخ لکھتے ہیں کہ پورے ملک نے چھ مہینے تک سوختہ جمع کیا پھر اس کو دہکایا گیا اور اس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ڈالا گیا۔

سوال یہ ہے کہ کسی بھی انسان کو جلانے کے لئے پانچ دس گٹھر کافی ہو جاتے ہیں، اتنا سارا سوختہ جمع کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ اتنا سارا سوختہ جمع کر کے بادشاہ نے جو آگ لگائی تھی یہ اس نے اپنے گمان میں جہنم تیار کی تھی جس میں ڈالنے کی دھمکی اس نے حضرت ابراہیمؑ کو دی تھی اور ڈالا بھی مگر اللہ کا آگ کو حکم پہنچا کہ ٹھنڈی ہو جا، چنانچہ وہ ان کے لئے گل وگلزار بن گئی اور یوں اس کا حضرت کو جہنم میں ڈالنے کا پلان فیل ہو گیا۔

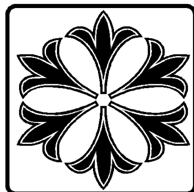
اور حضرت کی اس بات کے جواب میں کہ میری بات ماننے والے ہی جنت میں جائیں

گے اس نے دنیا میں جنت تیار کی، جب وہ بن کر تیار ہوگئی تو بادشاہ کے اس میں جانے کی تاریخ مقرر ہوئی، اس سے پہلے کہ وہ دن آتا اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ بادشاہ کے ناک میں ایک مچھر گھس گیا اور دماغ میں چڑھ گیا اور بھیجا کھانے لگا جس سے اس کے سر میں درد شروع ہو گیا اور جنت میں جانے کا پروگرام مؤخر ہوگیا، مچھر بھیجا کھاتا رہا جس سے اس کی طبیعت دن بدن خراب ہوتی رہی، پہلے سر دبانے سے چین آتا تھا اب سر میں مکے پڑنے سے بھی چین نہ آتا، مکوں سے بھی کام نہ چلا تو جوتے مارے جانے لگے، ایک دن کسی منچلے نے پتھر اٹھا کر سر میں دے مارا اور قصہ ختم کر دیا اور جناب کی جنت دھری کی دھری رہ گئی، ایک نظر دیکھنے کی بھی حسرت پوری نہ ہوئی اور حضرت ابراہیمؑ کے لئے اس کی بنائی ہوئی جہنم جنت بن گئی، بردوسلام بن گئی۔

آگ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو کیوں نہیں جلایا؟

اللہ کے کتنے ہی بندے ہیں جن کو آگ میں ڈالا گیا اور آگ نے سب کو جلا دیا، کسی کو بھی نہیں چھوڑا، لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ نے نہیں جلایا، یہ اللہ کے داعی اور اللہ کے دشمن کے درمیان مقابلہ تھا، حق وباطل کا فیصلہ پورے ملک کے سامنے آنا تھا، اگر آگ حضرت ابراہیمؑ کو جلا دیتی تو پورا ملک دھوکہ میں پڑ جاتا، اس لئے آگ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو نہیں جلایا تا کہ پورا ملک ان کے حق پر ہونے کو اور بادشاہ کے باطل پر ہونے کو اپنی آنکھ سے دیکھ لے، اس کے بعد بھی جو لوگ ایمان نہ لائے وہ ہٹ دھرمی سے نہیں لائے، اس کے ذمہ دار وہ خود ہیں، لیکن بات سب نے سمجھ لی کہ حق پر ابراہیمؑ ہیں کہ اتنی بڑی آگ نے ان کا ایک بال بھی بیکا نہیں کیا۔

وآخر دعوانا أن الحمد للہ رب العالمین



مسائل

سورۂ فاتحہ کے ختم پر آمین کہنا

لوگوں میں ایک غلطی چل رہی ہے اس کی اصلاح ہونی چاہئے، جب بھی سورۂ فاتحہ پڑھی جائے سب کو آمین کہنی چاہئے، ابھی میں نے سورۂ فاتحہ پڑھی کسی نے آمین نہیں کہی، یہ ایک عام غلطی ہے اس کی اصلاح ہونی چاہئے۔

کبھی حفظ کے بچوں کا قرآن ختم ہوتا ہے وہ اپنا قرآن ختم کر کے الحمد شریف پڑھتا ہے پھر سورۂ بقرہ کا شروع کا حصہ پڑھتا ہے جب وہ الحمد شریف ختم کرتا ہے تو کوئی آمین نہیں کہتا، پڑھنے والا بچہ بھی نہیں کہتا، ہاں کبھی کہتا ہے جب کہ اس کو سکھایا گیا ہو لیکن مجمع میں سے کوئی نہیں کہتا، کیونکہ ان کو بتایا نہیں گیا، پس جاننا چاہئے کہ جب بھی سورۂ فاتحہ پڑھی جائے تو اس کے ختم پر پڑھنے والے کو بھی اور سننے والوں کو بھی آمین کہنی چاہئے۔

خطیب کی شہادت کے ساتھ شہادت دینا

ایسی ہی ایک غلطی اور ہے، جب میں نے خطبہ پڑھا اور کہا **أشهد أن لا إله إلا الله**: میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، پس میں نے تو گواہی دی مگر آپ حضرات خاموش بیٹھے رہے، آپ حضرات نے یہ گواہی نہیں دی، یہ ٹھیک نہیں، اذان میں سب گواہی دیتے ہیں، جب مؤذن پکارتا ہے: **أشهد أن لا إله إلا الله**، تو سننے والے کہتے ہیں: **أشهد أن لا إلٰه إلا لله**، مگر دوسرے مواقع میں کوئی نہیں کہتا حالانکہ دوسرے مواقع پر بھی کہنا چاہئے۔ اور جواب دینے کے دو طریقے ہیں: مفصل اور مختصر، پورا جملہ لوٹانا مفصل جواب ہے، اور صرف و أنا: اور میں بھی (گواہی دیتا ہوں) یہ مختصر جواب ہے اور یہ بھی کافی ہے۔

بہر حال مقرر کی شہادت کے ساتھ ہر شخص کو شہادت دینی چاہئے، پھر ایک شہادت لمبی

ہے اور ایک مختصر، جس کا جی چاہے لمبا جواب دے اور جس کا جی چاہے مختصر جواب دے، جمعہ کے دن خطیب کے سامنے اذان ہوتی ہے، نبی پاک ﷺ منبر پر تشریف فرما ہوتے تھے جب اذان ہوتی اور مؤذن کہتا: أَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ تو آپؐ جواب دیتے: وَأَنَا: اور میں (بھی گواہی دیتا ہوں) یہ مختصر جواب ہے اگر اس طرح گواہی دی جائے تو بھی کافی ہے۔

ہر مجلس کے ختم پر کفارۃ المجلس پڑھنا

ایسی ہی ایک غلطی اور ہے حدیث پاک میں ایک دعا آئی ہے جس کا نام کفارۃ المجلس ہے، مجلس میں جو بھی لغو اور بے ہودہ باتیں ہوتی ہیں اگر مجلس کے ختم پر یہ دعا پڑھ لی جائے تو سب خطائیں معاف ہو جاتی ہیں، مگر وہ دعا ایک جگہ کے لئے خاص ہو کر رہ گئی ہے جب فضائل کی کتابیں پڑھتے ہیں تو اہلِ مجلس کفارۃ المجلس پڑھتے ہیں: یہ ٹھیک کرتے ہیں حالانکہ اس مجلس میں کوئی لغو اور بے ہودہ بات نہیں ہوئی اور جہاں پڑھنی چاہئے وہاں نہیں پڑھتے اس دعا کی اصل جگہ وہ مجلس ہے جس میں لغو باتیں ہوئی ہوں، ادھر ادھر کی باتیں ہوئی ہوں، ایسی مجلس کے ختم پر ہر ایک کو یہ دعا پڑھنی چاہئے: سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ، أَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ أَسْتَغْفِرُكَ وَأَتُوْبُ إِلَيْكَ: اے اللہ آپ کی ذات پاک ہے اور آپ ہر کمال کے ساتھ متصف ہیں، میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ کے علاوہ کوئی معبود نہیں، میں آپ سے گناہوں کی معافی چاہتا ہوں اور توبہ کرتا ہوں، یہ کفارۃ المجلس ہے ہر شخص کو ختم مجلس پر یہ ذکر کرنا چاہئے، اس سے لغو باتیں معاف ہو جاتی ہیں۔

نبی اپنی ذات کی طرف بھی مبعوث ہوتا ہے

نبی جس طرح امت کی طرف مبعوث ہوتا ہے اپنی ذات کی طرف بھی مبعوث ہوتا ہے، جیسے امت پر پانچ نمازیں فرض ہیں تو حضورؐ پر بھی فرض تھیں، امت پر روزے فرض ہیں تو حضور ﷺ پر بھی فرض تھے، امت پر حج فرض ہے تو حضورؐ پر بھی حج فرض تھا، امت کے لئے ضروری ہے کہ توحید کی گواہی دے تو حضور ﷺ کے لئے بھی یہ گواہی ضروری تھی،

امت کے لئے ضروری ہے کہ وہ حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کو اللہ کا رسول تسلیم کرے تو حضورؐ کے لئے بھی یہ بات ضروری تھی کہ آپؐ خود کو اللہ کا رسول مانیں، چنانچہ حضور جواب دیتے تھے کہ میں بھی گواہی دیتا ہوں کہ محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔

نبی کی دو حیثیتیں

نبی کی دو حیثیتیں ہیں، ایک اللہ کے نائب ہونے کی، دوسری اللہ کا بندہ ہونے کی، اللہ کے جو بھی احکام آتے ہیں: اللہ کے بندوں کے لئے آتے ہیں اور اللہ کے رسول اور انبیاء بھی اللہ کے بندے ہیں، پس اللہ کے یہاں سے جو احکام انبیاء نے لئے ہیں اور بندوں کو پہنچائے ہیں وہ احکام بندہ ہونے کی حیثیت سے خود نبی کے لئے بھی ہوتے ہیں، ایسا تو ہوسکتا ہے کہ کچھ احکام نبی کے لئے زائد ہوں مگر ایسا نہیں ہوتا کہ جو امت کے لئے احکام ہوں وہ نبی کے لئے نہ ہوں۔

سراً آمین کہنا افضل ہے

اور یہ بات بھی جاننا ضروری ہے کہ سورۂ فاتحہ کے ختم پر جو آمین کہی جاتی ہے وہ سراً کہنا افضل ہے، اگر زور سے کہیں تو جائز ہے لیکن آہستہ کہنا افضل ہے اور سب جگہ افضل ہے، جہاں بھی آمین کہیں آہستہ کہیں، امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک جس طرح نماز میں سورۂ فاتحہ کے ختم پر آہستہ آمین کہنا افضل ہے اسی طرح ہر جگہ آہستہ آمین کہنا افضل ہے۔

مگر اس میں بھی لوگ غلطی کرتے ہیں، کبھی نماز میں قنوت نازلہ پڑھی جاتی ہے، خاص طور سے فجر میں، اس وقت آپ دیکھیں گے کہ حنفی بھی زور سے آمین کہتے ہیں، جب قنوت نازلہ میں زور سے آمین کہتے ہو تو سورۂ فاتحہ میں زور سے آمین کیوں نہیں کہتے؟ آمین ہمیشہ سراً کہنا افضل ہے، آمین دعا ہے اور دعا میں سر (آہستگی) افضل ہے۔

اسی طرح جب مجمع میں دعا مانگی جاتی ہے تو پورا مجمع آمین کہتا ہے، تبلیغی جماعت کے جلسہ میں آخر میں دعا ہوتی ہے، تو لوگ اتنی زور سے آمین کہتے ہیں کہ کان پڑی سنائی نہیں دیتی، یہ بھی صحیح نہیں، آمین آہستہ کہنا افضل ہے اور ہر جگہ آہستہ کہنا بہتر ہے۔

جہری قراءت کی حد

نماز میں قراءت کی دوصورتیں ہیں، سرّی اور جہری، سرّی قراءکی کم سے کم مقدار تصحیح حروف ہے یعنی زبان حرکت کرے، مخارج پر لگے اور حرف ادا ہو، مگر آواز پیدا نہ ہو، اور زیادہ سے زیادہ کی تعریف ہے: إسماعُ نفسه: یعنی خود اپنا پڑھنا سنے۔ اور جہری قراءت کی تعریف ہے: إِسْمَاعُ غَيْرِهٖ: غیر کو سنانا، یعنی دوسرا سنے، دائیں طرف والا سنے، بائیں طرف والا سنے، یہ جہری قراءت کا ادنی درجہ ہے اس سے نیچے کوئی درجہ نہیں، جہری نمازوں میں اگر اس سے کم جہر کرے گا تو سجدۂ سہو واجب ہوگا کیونکہ وہ جہر (زور سے پڑھنا) نہیں۔ اور جہر کی زیادہ کی کوئی حد نہیں، بلکہ ﴿ إِنَّ أَنْكَرَ الْأَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِيْرِ ﴾: بیشک آوازوں میں سب سے بری آواز گدھوں کی آواز ہے، اس لئے بے ضرورت جہر مفرط ٹھیک نہیں۔

پس بعض لوگ نماز پڑھتے ہیں اور ان کے ہونٹ ساکن ہوتے ہیں اس طرح پڑھنے سے یعنی دل میں پڑھنے سے نماز نہیں ہوتی، کیونکہ ہونٹ نہیں ہل رہے، اس کا مطلب ہے زبان نہیں ہل رہی، زبان ہلے گی تو لامحالہ ہونٹ بھی ہلیں گے اور ڈاڑھی اگر شرعی ہو تو وہ بھی ہلے گی۔

اور بعض لوگ تکبیرات اور رکوع وسجود کے اذکار اتنی زور سے کہتے ہیں کہ دائیں بائیں والے سنتے ہیں، اور ان کی نمازوں میں خلل پڑتا ہے، یہ بھی غلط طریقہ ہے، یہ اذکار سراً سنت ہیں، اس لئے ان کو اتنا زور سے نہیں کہنا چاہئے کہ دائیں بائیں والے سنیں۔

شرعی ڈاڑھی کیا ہے

بعض لوگ فیشن والی ڈاڑھی رکھتے ہیں، اور سمجھتے ہیں کہ ہم اللہ کے حکم پر عمل کررہے ہیں حالانکہ وہ اللہ کے حکم پر عمل نہیں کررہے، وہ فیشن پر فریفتہ ہیں۔

شرعی ڈاڑھی کیا ہے؟ حضور ﷺ کے کتنی ڈاڑھی تھی؟ حدیث شریف میں ہے ایک مرتبہ طالب علموں نے حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ سے پوچھا: ظہر اور عصر کی نماز میں قراءت ہے؟ حضرت عمارؓ نے فرمایا: جی ہاں! طالب علموں نے پوچھا: آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ ان نمازوں میں قراءت ہے؟ حضرتؓ نے فرمایا: یہ نمازیں جب حضورؐ پڑھاتے تھے تو آپؐ کی

ڈاڑھی ہلتی تھی، اس سے ہم نے سمجھا کہ آپ قراءت کر رہے ہیں، آپ تجربہ کر کے دیکھیں کونسی ڈاڑھی ہلتی ہے؟ وہی ڈاڑھی ہلے گی جو شرعی ہے فیشن والی ڈاڑھی نہیں ہلے گی، مگر بالکل ڈاڑھی نہ ہونے سے یہ فیشن والی ڈاڑھی بھی اچھی ہے لیکن یہ شرعی ڈاڑھی نہیں، جب رکھنی ہے تو شریعت کا تقاضہ پورا کرو، ایک بندہ وہ ہے جو رکھتا ہی نہیں، اللہ نے توفیق نہیں دی، لیکن ایک بندہ وہ ہے جو ڈاڑھی رکھتا ہے پس اسے چاہئے کہ ڈھنگ سے رکھے، جب اس نے ہمت کر کے رکھ لی تو اتنی ہمت اور کر لے!

اور کچھ لوگ کہتے ہیں: ڈاڑھی کا ذکر قرآن میں دکھاؤ؟ کیا ہر مسئلہ کا ذکر قرآن میں ہونا ضروری ہے؟ اگر ایسا ہوتا تو حدیث کی کیا ضرورت تھی؟ فقہ کی کیا ضرورت تھی؟ میرے بھائیو! جان لو کہ دین کے تین مصادر ہیں: قرآن، حدیث اور فقہ۔ قرآن اصلِ اصول ہے اس کو متن کی حیثیت حاصل ہے، احادیث شریفہ اس کی شرح ہیں، اور فقہ دونوں کا خلاصہ اور نچوڑ ہے، پس کوئی بات تینوں مصادر میں سے کسی بھی ایک مصدر میں ہو تو وہ پکی بات ہے، ہر مأخذ میں اس کا ہونا ضروری نہیں۔

تاہم ڈاڑھی کا ذکر قرآن کریم میں بھی ہے۔ سورہ طٰہٰ (آیت ۹۴) میں ہے ﴿لَا تَأْخُذْ بِلِحْيَتِيْ﴾ حضرت ہارون علیہ السلام نے اپنے بھائی موسیٰ علیہ السلام سے کہا: بھائی جان! آپ میری ڈاڑھی نہ پکڑیں! معلوم ہوا کہ حضرت ہارونؑ کی ڈاڑھی اتنی بڑی تھی کہ اس کو پکڑا جا سکتا تھا، فیشن والی ڈاڑھی کو مٹھی میں نہیں پکڑ سکتے، پھر وہ شرعی ڈاڑھی کیسے ہو سکتی ہے؟

سوتی موزوں پر مسح جائز نہیں

چاروں اماموں کے نزدیک سوتی موزوں پر مسح جائز نہیں اگر ان پر مسح کریگا تو وضوء نہیں ہوگا، پس نماز نہیں ہوگی۔ اور شیعوں کے نزدیک پیروں کا دھونا نہیں ہے، ننگے پیروں پر مسح ہے، ان کے یہاں دو اعضاء (چہرہ اور ہاتھ) مغسول ہیں اور دو اعضاء (سر اور پاؤں) ممسوح ہیں، اور آج کل ایک نیا فرقہ نکلا ہے جو خود کو سلفی کہتا ہے ان کے نزدیک نائلون اور سوتی موزوں پر بھی مسح جائز ہے یہ لوگ درحقیقت غیر مقلد ہیں، اور چاروں ائمہ کہتے ہیں کہ خفین

پر یا خفین جیسے جورب پر مسح جائز ہے، حضور ﷺ کے زمانہ میں خفین تو چمڑے کے ہوتے تھے اور ایسے موزے آج بھی استعمال کئے جاتے ہیں، اور لفظ جورب فارسی سے بنا ہے۔ اس کی اصل 'گور پا' ہے یعنی پاؤں کی قبر، حضورؐ کے زمانہ میں جو جورب ہوتے تھے وہ خفین جیسے ہوتے تھے، پس جورب میں اگر تین شرطیں پائی جائیں تو ان پر مسح جائز ہے ورنہ نہیں، ایک: پنڈلی پر بغیر باندھے اپنے موٹاپے کی وجہ سے کھڑا رہے، دوسری: ان کو پہن کر بغیر جوتے چپل کے ایک فرسخ (تین میل) چلا جا سکے اور وہ پھٹیں نہ، تیسری: اگر اس پر پانی گرے تو پانی چھن کر اندر نہ جائے، یہ تین شرطیں جس جورب میں پائی جائیں اس پر مسح جائز ہے۔ اور سوتی اونی اور نائلون کے رائج موزوں میں ان میں سے کوئی شرط نہیں پائی جاتی اس لئے ان پر مسح جائز نہیں، اگر کوئی کرے گا تو اس کا وضوء نہیں ہوگا۔

سوتی موزوں پر مسح کرنے والے کے پیچھے نماز نہیں ہوتی

اور جو مسائل طہارت کے باب سے ہیں یا نماز کی صحت وفساد سے متعلق ہیں ان میں اگر مقتدی کو معلوم ہو کہ اس کے امام نے ایسا عمل کیا ہے جس سے اس کا وضوء ٹوٹ گیا ہے تو اس کے پیچھے اس مقتدی کی نماز نہیں ہوگی، اور جن کو معلوم نہیں ان کی نماز ہو جائے گی، مثلاً ایک حنفی ہے اس نے وضوء کے بعد اپنی بیوی کو ہاتھ لگایا، ایک شافعی نے اپنی آنکھوں سے اس کو دیکھا کہ وضوء کے بعد اس نے اپنی بیوی کو ہاتھ لگایا ہے اور نیا وضوء کئے بغیر نماز پڑھانے کے لئے کھڑا ہو گیا ہے تو اس امام کے پیچھے اس شافعی مقتدی کی نماز نہیں ہوگی، کیونکہ اس مقتدی کے عقیدے میں امام کا وضوء نہیں اور جب اس کے عقیدے میں امام کا وضوء نہیں تو اس کے پیچھے اس کی نماز کیسے ہوگی؟ دوسری مثال: ایک شافعی کی نکسیر پھوٹی، اور اس نے وضوء کئے بغیر نماز پڑھائی ایک حنفی نے اپنی آنکھ سے یہ بات دیکھی تو اس حنفی کی اس شافعی امام کے پیچھے نماز درست نہیں، کیونکہ مقتدی کے اعتقاد میں امام باوضوء نہیں، اسی طرح اگر کوئی سلفی نائلون کے موزوں پر مسح کر کے نماز پڑھائے تو جس نے اس کو مسح کرتے دیکھا ہے اس کی نماز نہیں ہوگی، یہ تقلید کا مسئلہ نہیں ہے اعتقاد کا مسئلہ ہے، جب مقتدی کے اعتقاد میں امام کا وضوء نہیں

تو اس کے پیچھے پڑھی ہوئی نماز نہیں ہوگی، حضرت تھانوی قدس سرہ کا واقعہ ہے: حضرت نے کانپور میں ایک اہلِ حدیث عالم کے پیچھے ظہر کی نماز پڑھی، عصر کا وقت ہوا تو اس اہلِ حدیث نے وضوء کیا اور سوتی موزوں پر مسح کیا، یہ دیکھ کر حضرت تھانویؒ نے ظہر کی نماز کا اعادہ کیا کیونکہ جب وہ عصر میں سوتی موزوں پر مسح کر رہا ہے تو ممکن ہے اس نے ظہر میں بھی مسح کر کے نماز پڑھائی ہو۔

دعا میں توسل جائز ہے واجب نہیں

تین چیزوں سے توسل کیا جاتا ہے، دو میں اتفاق ہے اور ایک میں اختلاف ہے:

ایک: اپنے نیک اعمال سے توسل کرنا جیسے قرآن کریم ختم کیا قرآن ختم کرنا ایک نیک عمل ہے، اب اگر کوئی اس سے توسل کرے اور کہے: اے اللہ! میں نے آپ کا کلام پاک پورا کیا ہے اسکے وسیلہ سے یعنی اس کی برکت سے میری دعا قبول فرما تو یہ توسل بالاتفاق جائز ہے۔

دوسرا: زندہ نیک آدمی کا توسل کرنا جیسے ایک صاحب نیک بندے ہیں، اب اگر کوئی یوں دعا کرے کہ اے اللہ! آپ کا یہ نیک بندہ ہے اس کے وسیلہ سے یعنی اس کی برکت سے میری دعا قبول فرما، تو یہ بھی بالاجماع جائز ہے۔

تیسرا: مردہ نیک بندہ کا توسل کرنا، اللہ کا ایک نیک بندہ دنیا سے گذر گیا، اور اس کا ایمان پر دنیا سے گذرنا یقینی ہے، جیسے ہمارے آقا دنیا سے گذر گئے آپؐ بالیقین اللہ کے نیک بندے تھے، اب اگر کوئی دعا کرے کہ اے اللہ! نبی پاک ﷺ کے وسیلہ سے یعنی برکت سے میری دعا قبول فرما تو یہ توسل نجدی اور غیر مقلدین کے نزدیک ناجائز ہے، اور چاروں ائمہ کے ماننے والے کہتے ہیں کہ یہ بھی جائز ہے، ایسا توسل اگرچہ واجب نہیں مگر حرام بھی نہیں، اور نجدی اور غیر مقلدین توسل کی اس قسم کو حرام کہتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ بخاری شریف میں روایت ہے: حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں ایک مرتبہ بارش نہیں ہو رہی تھی، حضرت عمرؓ نے استسقاء کی نماز پڑھائی، نماز کے بعد حضرت عمرؓ نے کہا اے اللہ! جب تک آپ کے رسول دنیا میں تھے تو ہم ان کا توسل کرتے تھے، اب حضورؐ دنیا میں

نہیں رہے یہ حضورؐ کے چچا حضرت عباسؓ ہمارے درمیان موجود ہیں ہم ان کا توسل کرتے ہیں کہ ہمیں بارش عطا فرما، **اللهم !إنا كنا نتوسل إليك بنبينا فتسقينا، وإنا نتوسل إليك بعم نبينا فاسقنا** (بخاری:۱۰۱۰)

یہ حضرات کہتے ہیں: اگر وفات کے بعد بھی نیک آدمی کا توسل جائز ہوتا تو حضرت عمرؓ نے حضور ﷺ کا توسل کیوں نہیں کیا؟ حضرت عباس کا توسل کیوں کیا، جو زندہ تھے، معلوم ہوا کہ مرے ہوئے نیک آدمی کا توسل جائز نہیں، توسل زندہ نیک آدمی کا ہی ہوسکتا ہے۔

اور چاروں ائمہ کے ماننے والے کہتے ہیں کہ بخاری شریف کی یہ روایت مختصر ہے، پوری روایت بخاری کی شرح عمدۃ القاری میں ہے، اس میں ہے کہ حضرت عمرؓ نے کہا: اے اللہ! جب تک حضور ﷺ دنیا میں زندہ تھے حضور ﷺ دعا کرتے تھے اور آپ ہمیں بارش عطا فرماتے تھے، اب حضور ﷺ نہیں رہے البتہ ہمارے درمیان حضور ﷺ کے چچا ہیں، ہم ان سے دعا کراتے ہیں، پھر حضرت عباسؓ سے کہا: آیئے اور دعا فرمایئے! اور حضرت عمرؓ پیچھے ہٹ گئے اور حضرت عباسؓ نے دعا کروائی اور مجمع نے آمین کہی، حضرت عباسؓ نے اس موقعہ پر جو دعا کی تھی وہ بھی عمدۃ القاری میں موجود ہے۔

اس روایت سے معلوم ہوا کہ یہاں توسل دعا کرانے کے معنی میں ہے اور ظاہر ہے جب حضور ﷺ دنیا میں نہیں رہے تو حضور ﷺ سے دعا کیسے کرائیں گے؟ آج بھی ایسے مواقع پر مجمع میں جو سب سے نیک آدمی ہوتا ہے اسی سے دعا کراتے ہیں اور مجمع آمین کہتا ہے۔

اور سوچنے کی بات یہ ہے کہ زندہ نیک آدمی کا توسل بالاتفاق جائز ہے جبکہ وہ کسی بھی وقت گمراہ ہوسکتا ہے، حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: **إِنَّ الْحَیَّ لَا تُؤْمَنُ عَلَیْهِ الْفِتْنَةَ**: زندہ کسی بھی وقت فتنہ کا شکار ہوسکتا ہے، یعنی کسی بھی وقت گمراہ ہوسکتا ہے، جب اس کا توسل جائز ہے تو جو بالیقین ایمان پر گذر گیا جیسے حضور ﷺ ان کا توسل کیوں جائز نہیں! مگر یہ بات یاد رہے کہ توسل صرف جائز ہے، فرض واجب یا مستحب نہیں، اس لئے یہ کوئی اہم مسئلہ نہیں، لوگ عام طور پر توسل نہیں کرتے، کسی خاص موقع پر ہی توسل کرتے ہیں مگر

علامہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے یہ مسئلہ اس لئے چھیڑا تھا کہ بدعتی توسل کو فرض قرار دیتے ہیں، ان کے نزدیک بزرگوں کے توسل کے بغیر دعا قبول نہیں ہوتی، اس لئے علامہ ابن تیمیہ کے موقف میں شدت آگئی اور انہوں نے حضور ﷺ کے توسل کو بھی ناجائز کہدیا، یہ بات ان کی مزاجی شدت کا نتیجہ تھی۔

نصف شعبان کی عبادت

پندرہ شعبان کے سلسلہ میں چار باتیں صحیح ہیں:

ایک: اس رات میں اللہ تعالی جتنی توفیق دیں اتنی گھر میں انفرادی عبادتیں کرنا، مگر ہم نے اس رات کو ہنگاموں کی رات بنادیا ہے، مسجدوں اور قبرستانوں میں اکٹھا ہوتے ہیں کھاتے پیتے اور شور کرتے ہیں یہ سب غلط ہے، اس کی کوئی حقیقت نہیں، اس رات میں نفلیں پڑھنی چاہئیں، اور پوری رات پڑھنی ضروری نہیں، جتنی اللہ توفیق دے گھر میں پڑھے، یہ انفرادی عمل ہے اجتماعی عمل نہیں۔

دوسری: اگلے دن روزہ رکھے، یہ روزہ مستحب ہے۔

تیسری: اس رات میں اپنے لئے اپنے مرحومین کے لئے اور پوری امت کیلئے دعائے مغفرت کرے اس کیلئے قبرستان جانا ضروری نہیں، اس رات میں نبی ﷺ قبرستان ضرور گئے ہیں مگر چپکے سے گئے ہیں حضرت عائشہؓ کو اتفاقاً پتہ چل گیا تھا نیز حضور ﷺ نے امت کو اس رات میں قبرستان جانے کا کوئی حکم بھی نہیں دیا، اس لئے ہمارے یہاں جو تماشے ہوتے ہیں وہ سب غلط ہیں۔

چوتھی بات: جن دو شخصوں کے درمیان لڑائی جھگڑا اور اختلاف ہو وہ اس رات میں صلح صفائی کرلیں، اگر صلح صفائی نہیں کریں گے تو بخشش نہیں ہوگی۔

یہ چار کام اس رات میں ضعیف احادیث سے ثابت ہیں اور ضعیف کا لحاظ اس وقت نہیں ہوتا جب سامنے صحیح حدیث موجود ہو، صحیح کے مقابل ضعیف حدیث کو نہیں لیا جاتا، لیکن اگر کسی مسئلہ میں ضعیف حدیث ہی ہو اس کے مقابل صحیح حدیث نہ ہو تو ضعیف حدیث لی جاتی

ہے، اور ایسا یہی ایک مسئلہ نہیں ہے بہت سے مسائل ہیں جن کی حدیثیں ضعیف ہیں اور ضعیف احادیث سے مسئلے ثابت ہوئے ہیں، جیسے صلاۃ التسبیح کی گیارہ روایتیں ہیں اور سب ضعیف ہیں، مگر سلف کے زمانہ سے صلوٰۃ التسبیح کا رواج ہے۔

البتہ ضعیف حدیث سے واجب اور سنت کے درجہ کا عمل ثابت نہیں ہوگا استحباب کے درجے کا حکم ثابت ہوگا پس صلاۃ التسبیح پڑھنا مستحب ہے، ایسے ہی نصف شعبان کے بارے میں جو روایات ہیں وہ بھی ضعیف ہیں مگر ان سے استحباب کے درجہ کا عمل ثابت ہوسکتا ہے، پس احادیث میں مذکور چاروں کام مستحب ہونگے، شب براءت، اس کے اعمال اور اس کے فضائل کو بالکل بے اصل کہنا صحیح نہیں، البتہ سورۃ الدخان کی آیت تین: ﴿إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةٍ مُّبَارَكَةٍ﴾ کا مصداق شب براءت نہیں، اس کا مصداق شب قدر ہے، کیونکہ قرآن شبِ قدر میں نازل ہوا ہے۔

مسجد میں دنیا کی باتیں کرنا نیکیوں کو کھا جاتا ہے

ایک بھائی پوچھ رہے ہیں: کچھ لوگ نماز باجماعت ادا کرنے کے بعد گروپ بنا کر مسجد میں ایک طرف کھڑے ہوجاتے ہیں اور بلند آواز سے باتیں کرتے ہیں یہ کیسا ہے؟ اس کا کیا حکم ہے؟

جواب: ایک حدیث میں حضور ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا ہے کہ مسجد میں دنیا کی باتیں کرنا نیکیوں کو اس طرح بھسم کردیتا ہے جس طرح آگ سوکھی ہوئی گھاس کو کھا جاتی ہے، سوکھی ہوئی گھاس کو آگ کی چنگاری دکھائی جائے تو لمحہ بھر میں وہ گھاس کو جلا کر خاکستر کردیتی ہے، اسی طرح مسجد میں دنیاوی باتیں کرنا، نیک اعمال کو بھسم کردیتا ہے، اس کو اردو میں کہتے ہیں: ثواب ندارد گناہ لازم! آئے تھے مسجد میں ثواب کمانے، ملا کچھ نہیں، جو بیلنس تھا وہ بھی گیا۔ دوسری حدیث میں نبی پاک ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے: بازاروں میں جس طرح شور وشغب کرتے ہیں مسجد میں اس طرح شور وشغب نہ کیا کرو، مگر یہاں (امریکہ میں) ایک مجبوری ہے، یہاں ہر شخص اپنے گھر میں محبوس ہے، ایک دوسرے سے ملاقات نہیں ہوتی، تین چار نمازیں تو لوگ جوب (کام) پر پڑھتے ہیں، ایک آدھ نماز کے لئے مسجد آتے ہیں، اس

لئے چوبیس گھنٹے کی باتیں کر لیتے ہیں۔ یہ ان ممالک کی پریشانی ہے، اس لئے ضروری ہے کہ ایسا انتظام کیا جائے کہ نہ سانپ بچے نہ لاٹھی ٹوٹے۔

انگلینڈ والوں نے ایسا انتظام کر رکھا ہے، ابھی یہاں (کینڈا میں) ایسا انتظام نہیں۔ انگلینڈ والوں نے یہ انتظام کیا ہے کہ مسجد کا خاص حصہ جہاں جماعت ہوتی ہے اس کو الگ کر دیا ہے، اور باہر کچھ حصہ چھوڑ دیا ہے، جو مسجد سے خارج ہے، نماز کے بعد جماعت خانہ بند ہو جاتا ہے، لوگ پیسیج میں بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں، اس طرح مسجد کی بے حرمتی نہیں ہوتی، ایسا انتظام آپ حضرات بھی کریں تو مسئلہ حل ہو جائے گا۔

ڈاڑھی میں دو واجب الگ الگ ہیں

ڈاڑھی رکھنا واجب ہے اور ایک مشت رکھنا واجب ہے، یہ دو الگ الگ واجب ہیں، ایک شخص بالکل ڈاڑھی نہیں رکھتا، وہ دونوں واجب کا تارک ہے، اور ایک آدمی خشخشی ڈاڑھی رکھتا ہے، اس نے ایک واجب پر عمل کیا کہ ڈاڑھی رکھی اور دوسرا واجب چھوڑ دیا، ایک مشت ڈاڑھی رکھنا بھی واجب ہے، اور ایک مشت سے زائد ڈاڑھی کاٹ لینا سنت ہے، ڈاڑھی میں سنت ایک مٹھی ہے: اس کا یہی مطلب ہے، غیر مقلدین کا عمل سنت کے خلاف ہے، وہ ڈاڑھی جہاں تک جائے چھوڑے رہتے ہیں، مشت سے زائد کاٹتے نہیں، ان کا یہ عمل سنتِ نبوی کے خلاف ہے۔

ہر مسئلہ قرآن میں ہونا ضروری نہیں

ایک صاحب پوچھتے ہیں: حدیث شریف میں تو ڈاڑھی کا ذکر ہے، مگر کیا قرآن میں بھی ڈاڑھی کا ذکر ہے؟

جواب: ہر مسئلہ کا قرآن میں ہونا ضروری نہیں، فجر کی دو رکعتیں ہیں، بتاؤ قرآن میں کہاں ہے؟ ظہر، عصر اور عشاء کی چار چار رکعتیں ہیں دکھاؤ قرآن میں کہاں ہے؟ مغرب کی تین رکعتیں ہیں، قرآن میں کہاں ہے؟ قرآن میں تو بس اتنا ہے کہ نماز کی پابندی کرو، اس کا اہتمام کرو، اور پانچ وقت کی نماز پڑھو، باقی تفصیل حدیثوں میں ہے، نماز میں کیا فرائض ہیں؟ کیا واجبات ہیں؟ کیا سنن و مستحبات اور آداب ہیں؟ کن چیزوں سے نماز فاسد ہوتی ہے؟

اورکونسی باتیں نماز کومکروہ کرتی ہیں؟ یہ سب تفصیلات حدیثوں میں ہیں، ہر مسئلہ کا قرآن میں ہونا ضروری نہیں، شریعت کے اصول تین ہیں: قرآن، حدیث اوراجماع۔اور دین کا مدار ان تینوں پر ہے، اگر ان میں سے کسی بھی ایک سے مسئلہ ثابت ہوجائے تو کافی ہے، ہر مسئلہ کی دلیل قرآن سے مانگنا صحیح نہیں۔

ڈاڑھی کا ذکر قرآن میں

اور ڈاڑھی کا ذکر قرآن میں موجود ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام جب طور پر گئے تو پیچھے بنی اسرائیل گمراہ ہوگئے، انھوں نے گوسالہ پرستی شروع کردی، حضرت ہارون علیہ السلام نے ان کو اس حرکت سے باز رکھنے کی پوری کشش کی مگر قوم باز نہیں آئی، حضرت موسیٰ علیہ السلام جب طور پر سے لوٹے اور اپنی قوم کو گمراہی میں پایا تو اپنے بھائی حضرت ہارون علیہ السلام کی سرزنش کی، انھوں نے خیال کیا کہ ہارون نے قوم کا خیال نہیں رکھا اس لئے وہ گمراہ ہوئی۔اور حضرت ہارون علیہ السلام کی ڈاڑھی پکڑ کر کھینچی، اس موقع پر حضرت ہارون علیہ السلام نے کہا: ﴿لَا تَأْخُذْ بِلِحْيَتِيْ وَلَا بِرَأْسِيْ﴾: بھائی جان! میری ڈاڑھی اور سر کے بال پکڑ کر نہ کھینچیں، میں نے ایک مصلحت سے خاموشی اختیار کی تھی، معلوم ہوا کہ ہارون علیہ السلام کی ڈاڑھی اتنی لمبی تھی کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس کو پکڑ کر کھینچا، ظاہر ہے خشخشی ڈاڑھی پکڑ کر کھینچی نہیں جاسکتی، پس قرآن میں ڈاڑھی کا ذکر ہے، اور لمبی ڈاڑھی کا ذکر ہے۔حضرت ہارون علیہ السلام کی لمبی ڈاڑھی تھی، اور حضرت عمار رضی اللہ عنہ کی حدیث سے پتہ چلتا ہے کہ آنحضور ﷺ کی بھی ڈاڑھی لمبی تھی، حضرت عمارؓ سے سوال کیا گیا: آنحضور ﷺ ظہر اور عصر میں قراءت کرتے تھے؟ حضرت عمارؓ نے جواب دیا: جی ہاں، قراءت کرتے تھے، اور یہ بات اس طرح معلوم ہوئی کہ آپؐ کی ڈاڑھی ہلتی تھی، ظاہر ہے لمبی ڈاڑھی ملتی ہے، خشخشی ڈاڑھی نہیں ہلتی۔

مسلمانوں کو تکلیف پہنچانا حرام ہے

بزرگو اور بھائیو! اس سے پہلے کہ میں ان آیات کی وضاحت کروں دو باتیں سمجھ لیں:

۱-آداب میں سے یہ ہے کہ اگر کسی کو صف میں کھل کر بیٹھنا ہے تو آگے بڑھ کر بیٹھے، پیچھے ہٹ کر نہ بیٹھے، پیچھے ہٹ کر بیٹھے گا تو پیچھے والے کے منہ سے اس کی پیٹھ لگے گی، اور ہوسکتا ہے یہ بات اسے ناگوار ہو، اور ایک مؤمن کو دوسرے مؤمن کی ذراسی تکلیف کا بھی خیال کرنا چاہئے، لہٰذا اگر کھل کر بیٹھنا ہے تو آگے بڑھ کر بیٹھے، اس صورت میں آپ کا منہ کسی کی پیٹھ سے لگے گا اور یہ آپ کا اپنا اختیار ہے۔

۲-ایک بھائی نے کہا ایک دوست اعتکاف میں بڑے زور سے خراٹے لیتے ہیں، جیسے ہیلی کوپٹر چل رہا ہو، ان کی وجہ سے دوسرے لوگ سو نہیں سکتے۔ ایسے بندہ کو اعتکاف میں نہیں بیٹھنا چاہئے۔

میں اس کی مثال دوں، آپ حضرات دیکھتے ہیں: میں سارا مہینہ اس مسجد میں رہتا ہوں کسی کے گھر کھانے بھی نہیں جاتا، پس میں اپنے کمرہ میں رہنے کے بجائے اگر مسجد میں ایک مہینہ کے اعتکاف کی نیت کرلوں تو اس میں مجھے پریشانی کیا ہے؟ کچھ نہیں، مگر میں ایسا نہیں کرتا، آخری عشرہ میں بھی اعتکاف نہیں کرتا کیونکہ میرا قرآن بڑی عمر کا حفظ کیا ہوا ہے اس لئے مجھے رات میں پڑھنا ہوتا ہے اور یاد کرنے کے لئے زور سے پڑھنا پڑتا ہے، آہستہ پڑھونگا تو یاد نہیں ہوگا، اب اگر میں اعتکاف میں بیٹھوں اور رات بھر زور سے پڑھوں، تو سونے والے کب سوئیں گے؟ ان کا خیال رکھنے کی وجہ سے میں اعتکاف میں نہیں بیٹھتا۔ اسی طرح ہر بندہ کو کوشش کرنی چاہئے کہ اس کے عمل سے دوسرے کو تکلیف نہ پہنچے کیونکہ اعتکاف سنت مؤکدہ ہے اور کسی مسلمان کو تکلیف پہنچانا حرام ہے۔ لہٰذا ایسا بندہ جس کو یہ بیماری ہو اس کو اعتکاف میں نہیں بیٹھنا چاہئے، لیکن اب جبکہ وہ بیٹھ چکے ہیں تو اس کا حل یہ ہے کہ وہ چت نہ لیٹیں، کروٹ پر لیٹیں، اور آس پاس والوں کو تاکید کردیں کہ اگر مجھے چت لیٹا ہوا پائیں تو جگادیں، کروٹ پر لیٹنے کی صورت میں خراٹے خود ہی بند ہوجائیں گے۔

حدیث: 'پڑھتا جا اور چڑھتا جا' کا مطلب

حدیث: جنت میں جنتی سے کہا جائے گا کہ قرآن پڑھتا جا اور درجات میں چڑھتا جا،

یہ حدیث صرف حافظ قرآن کے لئے نہیں ہے، یہ بات ہر قرآن پڑھنے والے سے کہی جائے گی، کیونکہ حدیث کے الفاظ ہیں: یُقَالُ لِقَارِئِ الْقُرْآن: قرآن پڑھنے والے سے کہا جائے گا۔ حافظ القرآن نہیں ہے۔ قاری ألقرآن ہے، اور کسی روایت میں لصاحب القرآن ہے یعنی ہر قرآن والے سے کہا جائے گا، چاہے وہ ناظرہ پڑھتا ہو یا حفظ پڑھتا ہو، کہا جائے گا پڑھتا جا اور چڑھتا جا۔

اور قرآن پڑھنے والا اور قرآن والا وہ شخص ہے جس کو قرآن سے خصوصی دلچسپی ہو، جو قرآن خوب پڑھتا ہو، بکثرت قرآن پڑھتا ہو، اس کو قرآن سے دلچسپی ہو، بعض مؤمنین کو بعض نیک کاموں سے خصوصی دلچسپی ہوتی ہے، کسی کو نفل نمازوں سے: وہ نماز والے ہیں، کسی کو خیر خیرات سے: وہ خیرات والے ہیں، کسی کو نفل روزوں سے، جن کے لئے جنت میں باب ریّان (سیرابی کا دراوزہ) ہوگا، کسی کو حج سے، کسی کو ذکر سے، اسی طرح جس کو قرآن کی تلاوت سے دلچسپی ہے وہ قرآن والا ہے، اس سے کہا جائے گا: پڑھتا جا اور چڑھتا جا!

اور لوگ سمجھتے ہیں کہ سیڑھی سے اوپر چڑھے گا، سیڑھی سے نہیں چڑھے گا ثواب، درجات اور علوم میں چڑھے گا، قرآن مجید کے عجائبات کبھی ختم ہونے والے نہیں، جنت میں بھی قرآن پڑھتے جائیں گے اور اس کے عجائبات کھلتے جائیں گے، یہانتک کہ وہ آخری آیت پر پہنچ جائے گا، اور قرآن کی کوئی آخری آیت نہیں، قرآن گول راؤنڈ ہے، جس مجلس میں ختم کرو اسی میں شروع کردو، اس لئے آخری آیت نہیں، پس تا ابد قرآن پڑھتا جائے گا اور درجات وعلوم میں چڑھتا جائے گا۔

ہر مخلوق اللہ کی پاکی بیان کرتی ہے

سورۂ بنی اسرائیل (آیت ۴۴) میں اللہ پاک کا ارشاد ہے: ﴿تُسَبِّحُ لَهُ السَّمَاوَاتُ السَّبْعُ وَالْأَرْضُ وَمَنْ فِيهِنَّ﴾: اللہ کی پاکی بیان کرتے ہیں ساتوں آسمان اور زمین اور وہ تمام مخلوقات جو آسمان وزمین میں ہیں ﴿وَإِنْ مِنْ شَيْءٍ إِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهِ﴾ اور کائنات کی کوئی چیز ایسی نہیں جو اللہ کی پاکی بیان نہ کرتی ہو ﴿وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ﴾ مگر تم

ان کی پا کی بیان کرنے کو سمجھتے نہیں، ان کی بولی اور ہے اور تمہاری بولی اور، زبان کے اختلاف کی وجہ سے تم ان کی تسبیح نہیں سمجھتے، مگر وہ تسبیح کرتے ہیں۔

تسبیح کے معنی ہیں: پا کی بیان کرنا، یعنی اللہ عزوجل کا عیوب ونقائص سے پاک ہونا بیان کرنا اور تحمید کے معنی ہیں: خوبیوں کے ساتھ متصف کرنا، یعنی اللہ کے لئے تمام کمالات ثابت کرنا، اسی کو تسبیح وتحمید کہتے ہیں۔

پس ہر مخلوق اللہ کی تسبیح وتحمید کرتی ہے مگر ہم اس کو نہیں سمجھتے، ان کی زبان اور ہے اور ہماری زبان اور، اس لئے ہمیں ان کا بولنا ایک مسلسل آواز معلوم ہوتا ہے، انسان خود بھی ایک دوسرے کی باتیں نہیں سمجھتے، اردو جاننے والے فارسی بولنے والوں کی باتیں نہیں سمجھتے، فارسی والے عربی والوں کی باتیں نہیں سمجھتے، ان کو وہ ایک مسلسل آواز معلوم ہوتی ہے، اور ہر زبان حقیقت میں ایک مسلسل آواز ہے، پھر لوگوں نے اس کے ٹکڑے کر کے اصطلاحیں بنالی ہیں، یوں زبانیں وجود میں آتی ہیں، پس جس زبان کو ہم نہیں جانتے وہ اگر ہمارے سامنے بولی جائے گی تو وہ ہمیں ایک مسلسل آواز معلوم ہوگی، اس کو وہی سمجھے گا جو اس زبان کی اصطلاحیں جانتا ہے، برسات میں چاروں طرف مینڈک بولتے ہیں، اور عجیب منظر بن جاتا ہے، ہم سمجھتے ہیں کہ ایک مسلسل آواز ہے حالانکہ وہ اللہ کی تسبیح کرتے ہیں، مگر ہم نہیں سمجھتے اس لئے کہ ہم ان کی زبان نہیں جانتے، حضرت سلیمان علیہ السلام جانوروں کی بولی جانتے تھے، چنانچہ وہ جانوروں کا بولنا سمجھتے تھے، ایک چیونٹی نے دوسری چیونٹیوں کو حکم دیا تو حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس کو سمجھ لیا، اگر جانوروں کی بولی نہ ہوتی تو حضرت سلیمان علیہ السلام چیونٹی کی بات کیسے سمجھتے؟ معلوم ہوا کہ تمام جانوروں کی بولیاں ہیں اور جو سمجھ سکتا ہے وہ جان سکتا ہے کہ وہ جانور کیا کہہ رہے ہیں، اور ہم جنس جانور ایک دوسرے کی بولی سمجھتے ہیں، اور وہ اللہ کی حمد وثنا اور تسبیح کرتے ہیں، یہ اس آیتِ کریمہ سے مفہوم ہوتا ہے۔

اور آیتِ کریمہ سے یہ بھی سمجھ میں آتا ہے کہ اللہ کی ہدایت کا نور جانوروں سمیت کائنات کے ذرہ ذرہ کو پہنچا ہے۔ اس لئے وہ اللہ کی پا کی اور حمد بیان کرتے ہیں، اللہ کی پا کی اور خوبی وہی بیان کرے گا جسے ہدایت کی روشنی ملی ہے، کافر نہ اللہ کی پا کی بیان کرتا ہے اور نہ

خوبی بیان کرتا ہے کیونکہ اس کو نور ہدایت نہیں ملا، تو وہ کیسے تسبیح وتحمید کرے گا، اور ہم اللہ کے فضل سے تسبیح وتحمید کرتے ہیں، کیونکہ ہم اللہ کو پہچانتے ہیں اللہ نے ہمیں ہدایت کی روشنی بخشی ہے۔

کائنات کا ذرہ ذرہ اللہ کو سجدہ کرتا ہے

اور سورۃ الحج کے دوسرے رکوع میں جو آیتِ سجدہ ہے —— میں اس کو پڑھ نہیں رہا، صرف ترجمہ کرتا ہوں، ترجمہ کرنے سے اور ترجمہ سننے سے سجدہ واجب نہیں ہوتا، آیت تلاوت کرنے سے اور سننے سے سجدہ واجب ہوتا ہے —— اس میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ’’اللہ کے لئے سجدہ کرتی ہیں تمام وہ چیزیں جو آسمانوں میں ہیں، اور تمام وہ چیزیں جو زمین میں ہیں۔ اور سورج، اور چاند، اور ستارے اور پہاڑ اور درخت اور چوپائے ﴿وَكَثِيْرٌ مِنَ النَّاسِ﴾ اور انسانوں میں سے بہت سے ﴿وَكَثِيْرٌ حَقَّ عَلَيْهِ الْعَذَابَ﴾ اور انسانوں میں بہت سے وہ ہیں جن پر عذاب ثابت ہو چکا یعنی وہ اللہ کو سجدہ نہیں کرتے۔

انسانوں میں تو تقسیم نکلی، بعض اللہ کو سجدہ کرتے ہیں اور اس کی تسبیح وتحمید کرتے ہیں اور بعض سجدہ نہیں کرتے، نہ تسبیح وتحمید کرتے ہیں، جنات کا بھی یہی حال ہے، ان میں بھی بعض اللہ کی تسبیح وتحمید اور سجدہ کرتے ہیں اور بعض نہیں کرتے، مگر ثقلین (جن وانس) کے علاوہ ہزاروں مخلوقات ہیں ان میں کوئی تقسیم نہیں، وہ تمام مخلوقات اللہ کی تسبیح وتحمید بھی کرتی ہیں اور اللہ کو سجدہ بھی کرتی ہیں۔

سجدہ اللہ کے ساتھ خاص ہے

سجدہ غایت درجہ کی عاجزی ہے اور وہ اللہ کے ساتھ خاص ہے، اللہ کے علاوہ کسی کو سجدہ کرنا جائز نہیں۔ نماز میں چار ارکان ہیں، پہلا رکن قیام ہے، یعنی اللہ کے حضور میں سیدھا کھڑا ہونا، یہ عبادت ہے مگر یہ بات اللہ کے ساتھ خاص نہیں، طالب علم استاذ کے سامنے باادب کھڑا ہو سکتا ہے، نوکر سیٹھ کے سامنے باادب کھڑا ہو سکتا ہے، حالانکہ قیام یعنی کھڑا ہونا نماز کا ایک رکن ہے، اور عبادت ہے مگر یہ عبادت اللہ کے ساتھ خاص نہیں، اسی طرح نماز کا

ایک رکن قعدہ ہے یعنی کسی کے سامنے باادب دوزانو بیٹھنا، یہ بھی عبادت ہے، مگر یہ بات بھی اللہ کے ساتھ خاص نہیں، طالب علم استاذ کے سامنے دوزانو باادب بیٹھ سکتا ہے۔

مگر نماز میں دو رکن ایسے ہیں جو اللہ کے ساتھ خاص ہیں، وہ رکوع اور سجدہ ہیں، رکوع میں جھکنا ہوتا ہے اور غیر اللہ کے سامنے جھکنا جائز نہیں، مگر رکوع پورا جھکنا نہیں، آدھا جھکنا ہے، اس لئے اس میں زیادہ سختی نہیں، بعض لوگ علماء سے مصافحہ کرتے ہوئے جھکتے ہیں ہم ان کو سمجھاتے ہیں کہ یہ ٹھیک نہیں، مصافحہ کرتے وقت سیدھا کھڑا رہنا چاہئے، جھکنا نہیں چاہئے، لیکن اگر کوئی جھک جائے تو شرک کا حکم نہیں لگائیں گے بلکہ اس کو سمجھائیں گے کہ مؤمن کا سر اللہ کے علاوہ کسی کے سامنے جھکنا نہیں چاہئے، مگر سجدہ غایت درجہ کی عاجزی ہے، اس لئے وہ اللہ کے ساتھ خاص ہے، اللہ کے علاوہ کسی کے لئے سجدہ کرنا جائز نہیں، اگر کوئی اللہ کے علاوہ کسی کو سجدہ کرے تو ہم اس کو شرک کہتے ہیں۔

مغل بادشاہوں کے دور میں بادشاہوں کو سجدے کئے جاتے تھے، آج بھی بہت سے جاہل مسلمان قبروں کو سجدہ کرتے ہیں۔ اگر اس نے عبادت کی نیت سے سجدہ کیا ہے تو وہ مشرک اور کافر ہو گیا، اور تعظیماً سجدہ کیا ہے تو اس کا یہ فعل اگرچہ شرکیہ ہے، گناہ عظیم ہے مگر اس کو مشرک و کافر نہیں کہیں گے۔

اور انسانوں کا اور دیگر مخلوقات کا سجدہ ایک نہیں، سب کے سجدے الگ الگ ہیں، خود انسانوں کے سجدے مختلف ہیں، تندرست آدمی کا سجدہ اور ہے اور بیمار کا سجدہ اور ہے، نمازی تندرست ہے تو اس کا سجدہ یہ ہے کہ جسم کا طرف اعلی یعنی سر کو طرف اسفل یعنی پیروں کے لیول پر لائے اور نمازی بیمار ہے اور اس طرح سجدہ نہیں کرسکتا تو سر سے اشارہ کرے یہی اس کا سجدہ ہے، اسی طرح ہر مخلوق کا سجدہ الگ ہے جو ان کے شایانِ شان ہے، مگر جس طرح ہم ان کی بولی نہ سمجھنے کی وجہ سے ان کی تسبیح و تحمید نہیں سمجھتے، اسی طرح ان کے سجدے بھی نہیں سمجھتے۔ مگر قرآن میں اللہ نے فرمایا ہے کہ تمام مخلوق اللہ کو سجدہ کرتی ہے، اور تسبیح و تحمید میں لگی ہوئی ہے، مخلوقات میں سے کوئی ایسا نہیں جو نورِ ہدایت سے محروم ہو، صرف مکلّف مخلوق کے بہت سے افراد نورِ ہدایت سے محروم ہیں۔

افادات

علم 'پڑھنے' سے آتا ہے 'پڑنے' سے نہیں آتا

برطانیہ میں طلبہ کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا:

طلبہ مدرسوں میں 'پڑھتے' کم ہیں، بس 'پڑتے' ہیں حالانکہ علم پڑھنے سے آتا ہے پڑنے سے نہیں آتا، زبردستی پڑھنے بٹھائیں تو پڑھ لیتے ہیں، مگر جب دل کا تقاضہ نہ ہو تو کہنے سے کیا فائدہ؟ حفظ کلاس میں جو بچے بیٹھتے ہیں وہ بھی اپنے شوق سے نہیں بیٹھتے، ان کو اگر چھٹی مل جائے تو فورا بھاگ کھڑے ہوں، وہ حفظ اس لئے کرتے ہیں کہ ان کے ماں باپ حفظ کرانا چاہتے ہیں، ان کو آخرت میں تاج پہننا ہے، وہ ان کو گھر میں ٹھہرنے نہیں دیتے، اور استاذ سختی کرتا ہے تو نوے فیصد بچے حفظ کر لیتے ہیں، سو بچوں میں سے نوے بچے حافظ ہو جاتے ہیں، پھر جب بچہ حافظ ہو گیا اور باپ مطمئن ہو گیا تو بچہ قرآن پڑھنا چھوڑ دیتا ہے صرف رمضانی حافظ ہو کر رہ جاتا ہے، کیونکہ اس نے اپنے شوق سے حفظ نہیں کیا، اور جو شخص اپنے شوق سے حفظ کرتا ہے وہ اس نعمت کی قدر کرتا ہے، ہمیشہ اس کا ورد رکھتا ہے۔

پھر ابا چاہتا ہے کہ بچہ مولوی بن جائے تاکہ اس کی عاقبت سنور جائے، اب بچہ مرتا کیا نہ کرتا مولوی کلاس میں بیٹھ جاتا ہے، اور جب تک سات آٹھ سال پورے نہ ہوں اور وہ مولوی کی سند لاکر ابا کو نہ دکھائے ابا گھر میں ٹھہرنے نہیں دے گا، اور اب چونکہ وہ سیانا ہو گیا ہے اس لئے استاذ سختی نہیں کر سکتا، اور اگر اتفاق سے ملک کا قانون بھی بچہ کی طرف داری میں ہو تو پھر استاذ آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکتا، اس لئے اب وہ مدرسہ میں پڑا رہتا ہے، مطالعہ کرے نہ کرے سبق میں آئے نہ آئے بیمار بن کر پڑ جائے، استاذ کچھ سختی نہیں کر سکتا۔

اور جو بچے اپنے لئے پڑھتے ہیں ان کی شان ہی نرالی ہوتی ہے، وہ جب وطن سے نکلتے ہیں تو پلٹ کر گھر کی طرف نہیں دیکھتے، اپنا مقصد پورا کر کے ہی گھر لوٹتے ہیں، اگر چہ دس

سال گذر جائیں، ماضی میں طلبہ کا یہی حال تھا، اور اب ہمارا طالب علم سال میں چار مرتبہ گھر جاتا ہے پس وہ ہمارے ابنائے قدیم کے درجہ کو کہاں پہنچ سکتا ہے؟

اساتذہ کی دریادلی

ایک سلسلۂ گفتگو میں فرمایا:

اب ہمارے اساتذہ بہت دریادل ہو گئے ہیں، طالب علم پرچے میں کچھ لکھے یا نہ لکھے پاس کر دیتے ہیں، اور طالب علم کو غلط فہمی کا شکار کر دیتے ہیں، اس کا ذہن یہ بن جاتا ہے کہ جب بغیر محنت کئے پاس نمبر آجاتے ہیں تو پڑھنے کی کیا ضرورت ہے؟ روٹی ملے یوں تو کھیتی کرے کیوں؟ اور مہتمم صاحب بھی اس کو اگلے درجہ میں بڑھا دیتے ہیں، اس طرح اس کا ستیاناس ہو جاتا ہے، جب ایک درجہ غلط ہو گیا تو تا ثریا می رود دیوار کج! آگے کے درجات میں اور کچا ہوتا چلا جائے گا اور آخر میں کسی کام کا نہیں رہے گا۔

دو لفظوں نے نقصان پہنچایا

مدرسہ سے نکلنے والوں کے لئے دو لفظ استعمال کئے جاتے ہیں ایک: فارغ ہو گیا! جب اس نے خود کو فارغ سمجھ لیا تو آگے پڑھنے کا جو دوسرا مرحلہ ہے وہ پیش آتا ہی نہیں وہ دوسرا مرحلہ شروع کرتا ہی نہیں۔

دوسرا لفظ: فاضل یعنی علامۃ الدہر، اب آگے کوئی کمال منتظر نہیں رہا، سب کچھ اسے آ گیا حالانکہ ابھی تو علم کی راہ میں قدم رکھا ہے۔ عرب ممالک کے لوگ یہ لفظ استعمال نہیں کرتے، ان کے یہاں فراغت اور فضیلت کا کوئی تصور نہیں، وہ لفظ خِرِّیج استعمال کرتے ہیں یعنی مدرسہ سے نکلا ہوا جس نے پڑھنے کا ایک مرحلہ پورا کر لیا اور دوسرے مرحلہ میں داخل ہو گیا، اگر ہمارا ابھی یہی تصور بن جائے کہ ابھی ہم نے کچھ حاصل نہیں کیا، ابھی ہمارے اندر علم حاصل کرنے کی صرف استعداد بنی ہے، علم تو آگے آئے گا تو اگلی منزل آسان ہو جائے، اب وہ علم مطالعہ کے ذریعہ علم حاصل کرے گا۔

تصورات اثر انداز ہوتے ہیں

تصورات اچھے ہوں یا برے اثر انداز ہوتے ہیں، ایک استاذ تھے، کبھی چھٹی نہیں کرتے تھے، ایک مرتبہ طلبہ نے پلان بنایا کہ آج استاذ کو بیمار کرنا ہے، چنانچہ ایک طالب علم ان کے پاس آیا، سلام ومصافحہ کر کے کہنے لگا: حضرت آج آپ بیمار معلوم ہوتے ہیں! انہوں نے کہا: نہیں! مجھے کچھ نہیں ہوا، تھوڑی دیر کے بعد دوسرا آیا، اس نے بھی یہی کہا، حضرت! آج آپ کافی گرم معلوم ہوتے ہیں، انہوں نے جواب دیا: کیا ایسا ہے؟ ذہن نے بات قبول کر لی، تھوڑی دیر کے بعد تیسرا آیا اور کہا: حضرت! آج آپ کے ہاتھ گرم معلوم ہوتے ہیں، کہنے لگے، مجھے بھی کچھ ایسا ہی محسوس ہوتا ہے، تھوڑی دیر کے بعد چوتھا آیا اور کہا: حضرت! آج آپ کے ہاتھ بہت گرم ہیں، کہنے لگے: ہاں بخار ہو گیا ہے! اس طرح دس طلبہ ملے اور استاذ کو بیمار کر دیا، ان کو واقعی بخار چڑھ گیا۔

غرض اچھے برے تصورات اثر انداز ہوتے ہیں اس لئے مدرسہ سے نکلنے والے طلبہ اگر تصور کریں کہ میری منزل ابھی دور ہے، مجھے کچھ نہیں آیا، مجھے ابھی مطالعہ سے بہت کچھ حاصل کرنا ہے تو وہ منزل کی طرف رواں دواں رہے گا اور ایک دن حقیقی معنی میں عالم بنے گا، ورنہ جو کچھ حاصل کیا ہے وہ بھی چند دن میں بھول جائے گا اور کورا ہو جائے گا۔

طلبہ کے پڑھنے میں تین چیزیں شامل ہیں

طالب علم اگر پڑھنا چاہے تو اس کیلئے تین چیزیں ضروری ہیں:

ایک: مطالعہ کر کے سبق میں جائے، مطالعہ کا مطلب یہ ہے کہ آگے کا سبق دیکھ کر جائے کم سے کم تین مرتبہ عبارت پڑھے، خواہ سمجھ میں آئے یا نہ آئے یہ کام ضرور کرے، پھر حاشیہ بھی پڑھے چاہے ایک حرف سمجھ میں نہ آئے، اس کا نام مطالعہ ہے۔

دوسری چیز: جب سبق میں بیٹھے تو ہر بات سمجھ کر چھوڑے، درس میں سمجھ میں آجائے تو ٹھیک ہے، ورنہ سبق کے بعد استاذ سے رجوع کرے، پھر بھی سمجھ میں نہ آئے تو کسی اور کی

طرف رجوع کرے ﴿فَوْقَ كُلِّ ذِىْ عِلْمٍ عَلِيْم﴾ سیر پر سوا سیر ہوتا ہے، بہر حال سبق سمجھ کر چھوڑے، بے سمجھے کبھی آگے نہ بڑھے۔

تیسری چیز: خواندہ یاد کرے، جو طالب علم خواندہ یاد نہیں کرتا وہ ہاتھوں میں سوراخ کرکے پانی پیتا ہے، جتنا بھی پانی ڈالا جائے گا سب نیچے چلا جائے گا، منہ تک نہیں پہنچے گا۔

آج کل طلبہ کا عجیب حال ہو گیا ہے، بعض تو درسگاہ میں بغیر کتاب کے آتے ہیں اور آکر بیٹھے رہتے ہیں سمجھ میں آئے نہ آئے کوئی فکر نہیں، اور جب تک امتحان سر پر نہیں آتا خواندہ یاد نہیں کرتے، اور امتحان کے وقت یاد کرنے کا کوئی خاص فائدہ نہیں، **إنما الأعمال بالنيات:** امتحان کے مقصد سے یاد کیا ہوا امتحان کے ساتھ چلا جاتا ہے، باقی رہنے والا علم وہی ہے جو علم کے مقصد سے حاصل کیا جائے، میری طالب علمی میں سال کے درمیان دو امتحان ہوتے تھے، سہ ماہی اور ششماہی، ہم امتحان کے بعد ایک ہفتہ کھیلتے تھے، آرام کرتے تھے، پھر سنجیدہ ہو جاتے تھے، سب کھیل بند کر دیتے تھے اور کتابوں کا تکرار شروع کر دیتے تھے، تکرار ہی سے کتاب یاد ہوتی ہے، اور اب جب تک امتحان سر پر سوار نہیں ہوتا طالب علم کتاب نہیں اٹھاتا۔

غرض: طالب علم کے پڑھنے میں مذکورہ تین چیزیں شامل ہیں اگر یہ تین چیزیں جمع ہوں تو وہ پڑھ رہا ہے ورنہ مدرسہ میں پڑا ہے۔

علماء کے پڑھنے میں تین چیزیں داخل ہیں

جو حضرات مدرسہ سے فارغ ہو چکے ہیں ان کو بھی آگے پڑھنا چاہئے، خواہ وہ کہیں پڑھاتے ہوں یا نہ پڑھاتے ہوں پڑھنا جاری رکھنا چاہئے، اور ان کے پڑھنے میں تین چیزیں شامل ہیں، اگر یہ تین چیزیں جمع ہیں تو پڑھنا ہے ورنہ وقت گذارنا ہے، جیسے لوگ بسوں میں، ٹرینوں میں، ہوائی جہازوں میں ناول لے کر بیٹھ جاتے ہیں، ان کو پڑھنے کے بعد کیا ملتا ہے؟ کچھ بھی نہیں! بس وقت کٹ جاتا ہے، یہ پڑھنا نہیں، وقت گذارنا ہے، پڑھنا اس وقت ہے جب تین چیزیں جمع ہوں، وہ تین چیزیں کیا ہیں؟

پہلی چیز: صرف کسی کتاب کے متعلقات نہ دیکھے، بلکہ کتاب جس فن کی ہے وہ پورا فن

دیکھے، بہت سی باتیں کتاب کی شروح میں نہیں ہوتیں، اس لئے شروح سے کتاب حل نہیں ہوتی، اگر ہر کتاب شروح سے حل ہو جاتی تو نئی شرحوں کی ضرورت کیا تھی۔

اور پورا فن دیکھنے کا طریقہ یہ ہے کہ مثال کے طور پر آپ قدوری میں باب خیار الشرط کا مطالعہ کر رہے ہیں، یہ باب نیچے بہشتی زیور تک اور اوپر شامی، درمختار اور بدائع تک دیکھ ڈالیں یہ پورا فن دیکھنے کا طریقہ ہے، یہ نہیں کہ ایک کتاب لے کر بیٹھ گئے اور آخر تک دیکھ ڈالی، پھر کوئی دوسری کتاب پکڑ لی، مدرس کے لئے یہ طریقہ ٹھیک نہیں، اور اگر مدرس متعدد فنون پڑھاتا ہے تو ان میں سے ایک کتاب فن پڑھنے کے لئے منتخب کرے، باقی کتابیں متعلقات دیکھ کر پڑھاتا رہے، پھر دو تین سال میں جب وہ یہ فن دیکھ چکے تو دوسرا فن شروع کرے، جیسے کافیہ پڑھا رہا ہے تو نحو کا مطالعہ شروع کرے، نیچے چھوٹی اردو کی کتابیں اور اوپر شرح جامی تک مطالعہ کرے، یہ پڑھنا ہے اور کتاب کے صرف متعلقات دیکھنا پڑھانا کے لئے ہے پڑھنا نہیں، اور پڑھانے سے علم نہیں آتا پڑھنے سے علم آتا ہے۔

دوسری چیز: فن کے مطالعہ کے دوران کاپی بنا لے یا کتاب میں زائد ورق رکھ لے اور جہاں قیمتی بات ملے اس کو کاپی میں نقل کر لے یا اس کا خلاصہ لکھ لے، اگر اس طرح تجمیع نہیں کرے گا تو اس کی مثال لنگور کی سی ہے جو مکئی کے کھیت میں گھسا، جب کوئی شاندار بھٹا نظر آیا تو اسے توڑ کر بغل میں دبایا اور آگے بڑھا، دوسرا نظر آیا تو اس کو بھی توڑا، تیسرا نظر آیا تو اس کو بھی توڑا، یونہی توڑتا اور بغل میں دباتا چلا گیا، جب کھیت سے باہر نکلا تو اس کے بغل میں ایک بھی بھٹا نہیں، اسی طرح فن کے مطالعہ کے دوران آدمی بہت سی قیمتی باتوں پر گذرتا ہے، پس اگر تجمیع نہیں کرے گا تو بھول جائے گا کہ فلاں بات کونسی کتاب میں کہاں پڑھی تھی؟ پلّے کچھ نہیں رہے گا، اور ہر سال پورا فن نہیں پڑھ سکتا، اس لئے اگر آپ نے قیمتی باتیں جمع کر رکھی ہیں تو اگلے سال جب آپ پڑھائیں گے تو وہ تمام باتیں کام آئیں گی، غرض اساتذہ کے پڑھنے میں دوسری چیز تجمیع ہے۔

تیسری چیز: استنتاج ہے، جو کچھ پڑھا ہے اس میں غور کرے اور نئے نتیجے نکالے اگر استنتاج نہیں ہوگا تو علم ترقی نہیں کرے گا، آج علوم وفنون جہاں تک پہنچے ہیں وہ استنتاج ہی

کا نتیجہ ہے، ہر زمانہ کے لوگوں نے پچھلوں کے لکھے ہوئے مضامین میں غور کیا اور نئی نئی باتیں نکالیں اور فنون کو آگے بڑھایا، اگر ہم بھی اپنے پڑھے ہوئے کو سوچیں اور غور وفکر کریں تو نئے نئے نکتے آج بھی نکلیں گے زمانہ بانجھ نہیں ہو گیا، غرض اساتذہ کے پڑھنے میں تیسری چیز استنتاج ہے۔

چار اکابر کی کتابیں پڑھنے سے غبی بھی ذہین ہو جاتا ہے

حضرت حکیم الاسلام مولانا محمد طیب صاحب قدس سرہ نے ایک بات بتائی تھی کہ حضرت شیخ الہند قدس سرہ نے فرمایا: امت میں چار آدمی ایسے گذرے ہیں کہ اگر آدمی ان کی کتابوں سے مزاولت رکھے تو چاہے کتنا بھی غبی ہو ذہین ہو جاتا ہے، وہ چار حضرات یہ ہیں: (۱) مشہور صوفی بزرگ امام اکبر علامہ ابن عربی رحمہ اللہ (۲) حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی رحمہ اللہ (۳) محدث دہلوی حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ (۴) اور حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمہ اللہ۔

عرب ممالک میں بہت کتابیں چھپتی ہیں مگر ابن عربی کی کوئی کتاب نہیں چھپتی، کیونکہ وہ ان کو کافر اور مشرک کہتے ہیں، آج سے پچاس سال پہلے ابن عربی کی کسی کتاب کا وجود نہیں تھا میں نے دار العلوم دیوبند کے کتب خانہ میں ان کی دو کتابوں کی زیارت کی تھی: فتوحات مکیہ اور فصوص الحکم، اور کوشش کی تھی کہ کچھ سمجھ میں آئے مگر کچھ سمجھ میں نہیں آیا، اگر ان کی کتابوں میں سے کوئی استاذ ہمیں تھوڑا سا پڑھا دیتا تو ہم اس کے سہارے آگے بڑھتے لیکن ان کی کوئی کتاب نہیں پڑھائی گئی، نتیجے میں ہمیں کچھ حاصل نہ ہوا۔

دوسرے حضرت مجدد الف ثانی ہیں طالب علمی کے زمانہ میں ان کی کوئی کتاب نہیں دیکھی تھی، چند چھوٹے چھوٹے رسالے ملتے تھے مگر ان کے مکتوبات دستیاب نہیں تھے، میں نے ان کی بھی کوئی کتاب نہیں پڑھی تھی، بعد میں جب مکتوبات ملے تو ان کا مطالعہ کیا۔

تیسرے حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمہ اللہ ہیں ان کی کتاب: الفوز الکبیر ہم پڑھتے تھے، ہمارے اساتذہ کی زبان پر بھی بکثرت شاہ صاحبؒ کا نام آتا تھا، حجۃ اللہ بھی

پڑھائی جاتی تھی اوران کی کئی کتابیں بازار میں مل جاتی تھیں۔

چوتھے حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمہ اللہ ہیں جو ہمارے قریب ترین استاذ ہیں، ان کی سبھی کتابیں بازار میں ملتی تھیں اور اردو میں تھیں، اس لئے میں نے ان دونوں کومطالعہ کے لئے خاص کرلیا، الفوزالکبیر پڑھی تو اتنا مزہ آیا کہ آپ اندازہ نہیں کرسکتے، اور جب حضرت حکیم الاسلامؒ سے حجۃ اللہ کے چند ابواب پڑھے تو اتنا مزہ آیا کہ میں نے طے کرلیا کہ شاہ صاحبؒ کو پڑھنا ہے، چنانچہ الفوزالکبیر پڑھی بھی اور پڑھائی بھی اور عربی میں شرح بھی لکھی، حجۃ اللہ کے بھی پیچھے لگا رہا، تیس سال تک میں نے حجۃ اللہ کا مطالعہ کیا، جب بھی ذرا فرصت ملتی کتاب کھول لیتا اور صفحے دو صفحے پڑھ لیتا، پڑھتے پڑھتے ایک وقت آیا کہ اللہ نے ساری کتاب حل کرادی، پھر میں نے اس کی شرح لکھی: رحمۃ اللہ الواسعہ، فالحمدللہ علی ذلک۔

علوم عالیہ چھ اور علوم آلیہ غیر متعین ہیں

علوم شرعیہ چھ ہیں (۱) قرآن (۲) حدیث (۳) فقہ (۴) پھر قرآن سمجھنے کے لئے اصول تفسیر، اصول تفسیر کے بغیر آپ قرآن نہیں سمجھ سکتے (۵) اور حدیث کو سمجھنے کے لئے اصول حدیث، اصول حدیث کی رعایت کے بغیر آپ احادیث سے استفادہ نہیں کرسکتے (۶) اور قرآن وحدیث سے فقہ کیسے نکالنا ہے اس کیلئے اصول فقہ ہے، یہ چھ علوم مدارس اسلامیہ کی غرض وغایت ہیں، انہی کے لئے مدارس قائم کئے گئے ہیں، یہی چھ علوم: علوم عالیہ ہیں، باقی علوم: علوم آلیہ ہیں، یعنی علوم حاصل کرنے کے ذرائع ہیں، جیسے صرف، نحو اور منطق علوم آلیہ ہیں اور سراجی کے لئے حساب جاننا ضروری ہے، پس حساب بھی علوم آلیہ میں آئے گا، پھر جب بچہ بڑا ہوگا تو ملک کے جس صوبہ میں رہتا ہے وہاں کی زبان جاننا ضروری ہے، اگر وہ انگریزی علاقہ میں رہتا ہے تو انگریزی ضروری ہے، ہندی کا علاقہ ہے تو ہندی، گجراتی کا علاقہ ہے تو گجراتی، کیونکہ علاقہ کی زبان نہیں جانے گا تو زندگی کیسے گزارے گا؟

اور آج دنیا اتنی چھوٹی ہوگئی ہے کہ ساری دنیا کے احوال آدمی کے سامنے آتے ہیں، اگر

طالب علم جغرافیہ نہیں جانتا تو بیچارہ دنیا سے ناواقف رہے گا، اس کی سمجھ میں نہیں آئے گا کہ فلاں شہر کہاں ہے؟ حالانکہ وہ اس کے ملک سے لگا ہوا ہے، پس جغرافیہ بھی علوم آلیہ میں آئیگا۔

تاریخ پڑھنا بھی ضروری ہے اس کے بغیر آدمی ترقی نہیں کر سکتا، الغرض علوم آلیہ کی فہرست متعین نہیں، زمانہ کے تقاضوں سے فہرست چھوٹی بڑی ہو سکتی ہے، پھر ہر آدمی کو اللہ نے ذہن الگ الگ دیا ہے، ایک درجہ پر سب کے اذہان نہیں ہوتے، ایک ذہین طالب علم کے لئے چار کتابیں کافی ہوتی ہیں، اور متوسط ذہن والے کو چھ کتابیں پڑھنی پڑتی ہیں، اور معمولی ذہن والے کو آٹھ کتابیں پڑھاتے ہیں تب جا کر وہ ذہین کی جگہ لیتا ہے، اس لئے علوم آلیہ کا نصاب متعین نہیں، اور اس کے پڑھنے کا وقت بھی ذہانت کے اعتبار سے کم وبیش ہوتا ہے۔

طلبہ کے پاس اپنی کتابیں ہونی چاہئیں

آج کل تعلیم میں جو کمزوری آئی ہے اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ طلبہ کے پاس اپنی کتاب نہیں ہوتی، آٹھ سال پڑھا مگر ایک بھی کتاب نہیں، ہمارے مدرسے طالب علم کے لئے ہر ضرورت مہیا کرتے ہیں، وظیفۂ پارچہ دیتے ہیں، وظیفۂ تیل دیتے ہیں، وظیفۂ پاپوش دیتے ہیں، مگر کتابیں نہیں دیتے، آج کونسا طالب علم ہے جو بغیر جوتے کے گھوم رہا ہے؟ کونسا طالب علم ہے جو ننگا گھوم رہا ہے؟ کونسا طالب علم ہے جو لالٹین میں تیل ڈال کر مطالعہ کرتا ہے؟ کوئی بھی نہیں! مگر اپنی کتاب کسی طالب علم کے پاس نہیں؟ میں نہیں کہتا کہ یہ وظیفے مت دو، ضرور دو !سب کچھ دو! مگر کتاب بھی تو دو! مالک بناؤ کتاب کا، البتہ شرط لگا سکتے ہو کہ طالب علم اتنے نمبر لائے گا تو یہ کتاب ملے گی، اس سے کم نمبر والے کو اپنی کتاب خود خریدنی ہوگی، اس سے ان کا حوصلہ بڑھے گا، لیکن بہت زیادہ نمبروں کی قید نہ لگائیں، مثلاً اوسط نمبر کی قید لگائیں تا کہ چند ہی طالب علم کتابوں سے محروم رہیں، باقی نمبروں کی شرط پوری کرلیں، مگر امتحان لینے والوں کو بھی پابند کرنا ہوگا کہ صحیح نمبر دیں اگر وہ دریادلی سے نمبر دیں گے تو شرط لگانا بیکار ہو جائے گا۔

الغرض مدارس کو دیگر وظائف کے ساتھ کتابیں بھی دینی چاہئیں، صرف پڑھنے کے لئے کتاب نہ دیں، مالک بنادیں، کیونکہ جب مدرسہ اس کو کتاب مستعار دے گا تو وہ اپنی

کتابیں خرید کر کیوں جمع کرے گا؟ کتابیں مستعار دینے کا نتیجہ یہ ہے کہ فضلاء میں کتابیں خریدنے کا شوق نہیں رہا، نہ رکھنے کا اور حفاظت کا سلیقہ ہے۔

کبھی الزامی جواب دینا مفید ہوتا ہے

ایک آدمی نے سوال کیا: دن کی نمازیں سری اور رات کی نمازیں جہری کیوں ہیں؟ میں نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت سنائی کہ طالب علموں نے حضرت ابو ہریرہؓ سے یہی بات پوچھی تھی، حضرت ابو ہریرہؓ نے جواب دیا: جو نمازیں حضور ﷺ نے ہمیں سرّی پڑھائی ہیں ہم بھی وہ نمازیں سری پڑھاتے ہیں، اور جو نمازیں جہری پڑھائی ہیں ہم بھی وہ نمازیں جہری پڑھاتے ہیں۔

یہ حدیث سنا کر میں نے سائل سے پوچھا: بتاؤ دو نمازیں سری اور تین نمازیں جہری کیوں ہیں؟ یہ بات حضرت ابو ہریرہؓ جانتے تھے یا نہیں؟ اگر نہیں جانتے تھے تو میرا علم حضرت ابو ہریرہؓ سے زیادہ نہیں، میں اس کو کہاں سے جانوں گا؟ اور اگر جانتے تھے تو کیوں نہیں بتایا؟ لامحالہ یہی کہنا ہوگا کہ طالب علموں کی علمی سطح اتنی بلند نہیں تھی کہ وہ اس سوال کا جواب سمجھ سکتے! پس کیا آپ حضرت ابو ہریرہؓ کے شاگردوں سے آگے ہیں؟ آپ کالج میں پڑھتے ہیں، علم دین برائے نام جانتے ہیں، اور وہ دین کے طالب علم تھے، حدیث کے طالب علم تھے، پس اگر میں سمجھاؤں تو کس طرح سمجھاؤں؟ اور آپ کیا سمجھیں گے؟ وہ خاموش ہوگیا، یہ بولتی بند کرنے کا طریقہ ہے، اور یہ طریقہ حضرت شیخ الہند قدس سرہ کا تھا، آپ پہلے الزامی جواب دیتے تھے اور بولتی بند کردیتے تھے۔ پھر تحقیقی جواب دیتے تھے، جب تک معترض کے دماغ کی کھڑکیاں بند نہ کردیں وہ جواب کی طرف متوجہ نہیں ہوتا، اس لئے پہلے الزامی جواب دے کر خاموش کردینا چاہئے، پھر صحیح بات بتاؤ تو وہ غور سے سنے گا اور سمجھے گا، ورنہ محنت رائگاں جائے گی۔

مدارس اسلامیہ کی برکت

انکلیشور (گجرات) کے ایک اجتماع میں فرمایا:

مدارس اسلامیہ کا وجود حفاظتِ دین کا بڑا ذریعہ ہے، یہ وہ اسلامی قلعے ہیں جو دین کی پناہ گاہ ہیں، جس جگہ مدارس اسلامیہ کا وجود نہیں وہاں جا کر دیکھیں اسلام کا کیا حال ہے، وہاں کی دینی حالت دیکھیں تو مدارس کی اہمیت کا بخوبی اندازہ ہوجائے گا۔ اسپین، تاشقند اور سمرقند (ازبکستان) کی حالت اسلام کی زبوں حالی کی منہ بولتی تصویر ہے، ہدایہ میں ایک جگہ ہے: إن أعلام الإسلام فيها ظاهرة: ازبکستان کے دیہاتوں میں بھی اسلام کے جھنڈے لہرا رہے ہیں، مگر اب وہاں کچھ نہیں، میں سمرقند تاشقند گیا ہوں، وہاں لوگ سلام کا جواب دینا بھی نہیں جانتے، مگر متحدہ ہندوستان (انڈیا، پاکستان اور بنگلہ دیش) کا نقشہ ان ممالک سے مختلف ہے۔ اور یہ برکت ہے مدارس اسلامیہ کی، جب اس ملک پر انگریزوں نے قبضہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے اہل اللہ کو الہام کیا کہ چندے کے مدارس قائم کئے جائیں، اب اس ملک میں اسلام کی حفاظت کی یہی صورت ہے، اس سے پہلے چندے کے مدارس کا کوئی تصور نہیں تھا، حکومت ادارے قائم کرتی تھی یا شخصی طور پر مدارس قائم ہوتے تھے، ایک ہی آدمی خرچہ چلاتا تھا، اب اللہ تعالیٰ نے قومی مدارس کا ذہن بنایا تو مدارسِ اسلامیہ کا فروغ ہونا شروع ہوگیا، اب مدارسِ اسلامیہ بڑھتے چلے جارہے ہیں۔ آپ کو آج جگہ جگہ مسجدیں آباد مل رہی ہیں، مسلمان دینی وضع قطع میں ہیں، بے شمار آپ کو علماء مل رہے ہیں، اسلام پر کوئی حملہ ہو مسلمان مدافعت کے لئے تیار ہیں، یہ نقشہ کیوں ہے؟ یہ مدارسِ اسلامیہ کی برکت ہے یہ دین اسلام کی حفاظت کے قلعے ہیں، لہٰذا آپ اس نعمت کو زیادہ سے زیادہ مضبوط کرنے اور زیادہ سے زیادہ فعال بنانے کی کوشش کریں، ان شاء اللہ ہمارے لئے مفید ہوگا اور اگر یہ مدرسے خدانخواستہ نہ رہے تو پھر صورت حال وہی ہوگی جو دنیا میں ہوچکی ہے۔

نصاب طلبہ کے قابو میں نہیں آتا

واقعہ یہ ہے کہ مدارسِ عربیہ کا نصاب پوری طرح بچوں کے قابو میں نہیں آتا، اور اسی مسئلہ کو لے کر آج کا اجتماع منعقد کیا گیا ہے، خطبہ استقبالیہ میں اس کا تذکرہ ہے کہ آج طلبہ کی استعدادیں نہیں بن رہیں: اس کی وجہ کیا ہے؟ جاننا چاہئے کہ استعداد عربی پنجم تک بنتی ہے، پھر بوئے ہوئے درخت کا پھل کھانا ہے، استعداد بن گئی تو آگے طالب علم دیوار میں

سے علم نکال لے گا، کمزور استاذ سے بھی پڑھ کر کتاب سمجھ لے گا، اور اگر اس درجہ تک استعداد نہیں بنی تو آگے جھینکنا ہے، ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ بھی بخاری شریف پڑھا کر اس کو عالم نہیں بنا سکتے، بس وہ فارغ ہو کر رہ جائے گا کسی کام کا نہیں بنے گا، چنانچہ مسلسل آوازیں اٹھتی ہیں کہ طلبہ کو کسی کام کا بناؤ! مدارس کا نصاب بدلو، کچھ دنیا کی ضرورتیں نصاب میں شامل کرو، تا کہ طلبہ کسی کام کے بنیں!

مگر یہ مسئلہ کا حل نہیں، مجھے حضرت الاستاذ علامہ محمد ابراہیم صاحب بلیاوی قدس سرہ (سابق صدر المدرسین دار العلوم دیوبند) کی بات یاد آئی، جب بھی نصاب میں تبدیلی کی بات آتی تو آپ فرماتے:

"مولوی صاحب! تعلیم کی خوبی تین باتوں کی مرہونِ منت ہے: ایک: استاذ کی مہارتِ فن، دوسری: طالب علم کی محنت، تیسری: نصاب کی عمدگی۔ اب صورتِ حال یہ ہے کہ اساتذہ سے کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا، وہ سر پھوڑ دیں گے، اور طلبہ سے بھی کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا، وہ بھڑوں کا چھتہ ہیں، اب رہ گیا بے زبان نصاب، کان پکڑ کر کبھی اِدھر کر دیا کبھی اُدھر، مگر مسئلہ حل نہیں ہوتا"

یعنی نصاب تیسرے درجہ کی چیز ہے، پہلی چیز: اساتذہ کی مہارتِ فن ہے، پہلے اساتذہ ماہر فن ہوتے تھے تو طلبہ جید الاستعداد نکلتے تھے، اب اساتذہ ہی ناقص ہیں، خاص طور پر ابتدائی درجات کے اساتذہ جو استعداد سازی کا مرحلہ ہے، وہ ابھی فارغ ہوئے ہیں، خود ان کے قابو میں فن نہیں، وہ طلبہ کو صاحب فن کس طرح بنا دیں گے، وہ ابتدائی کتابیں پڑھاتے ہیں اور پڑھا کر بھول جاتے ہیں، خود ان کو کتاب یاد نہیں ہوتی، وہ فن کے مسائل کا اجراء کیسے کرائیں گے؟

اور طلبہ کی اکثریت پڑھنے نہیں آتی، ماں باپ کے نیک جذبات سے مولوی بننے آتی ہے، اور مدرسہ میں پڑی رہتی ہے، پھر پڑھے بغیر اور کتاب یاد کئے بغیر استعداد کیسے بنے گی۔

اور عربی پنجم تک کا نصاب اتنا سمیٹ دیا گیا ہے اور مضامین کی اتنی بھرمار ہوگئی ہے کہ طالب علم یاد کرنا چاہے تو بھی یاد نہیں کر سکتا۔

پس مسئلہ کا حل یہ ہے کہ ابتدائی نصاب بڑھایا جائے، پانچ سال کے چھ سال کئے جائیں، ابتدائی اساتذہ تجربہ کار ہوں، فن ان کے قابو میں ہو، اور طلباء کو بھی لایعنی مشاغل سے ہٹا کر پڑھنے میں لگایا جائے، ابتدائی درجات کا امتحان ہر ماہ لیا جائے اور اس پر ترغیب وترہیب کے نتائج مرتب ہوں تو کچھ امید باندھی جاسکتی ہے کہ پختہ استعداد والے طلبہ تیار ہوں۔

اور ہاں ایک بات یاد آئی: تعلیم میں تدریج ضروری ہے، نیچے کے درجے سے اوپر کے درجے میں حقیقی معنی میں 'کامیاب' چڑھے گا تبھی آگے کامیاب ہوگا، اور اگر بے استعداد ایک درجہ آگے بڑھ گیا تو ساری تعلیمی زندگی برباد ہوگئی، اب اگلے درجے میں نہ کچھ سمجھے گا، نہ اس کی محنت کا کچھ حاصل نکلے گا۔

مثلاً: اردو کی پختہ استعداد کے بغیر بچے کو فارسی میں لے لینا، یا فارسی کی ضروری استعداد کے بغیر عربی میں لے لینا، بچے کی زندگی کو تباہ کرنا ہے۔ خاص طور پر ان صوبوں کے بچے جن کی مادری زبان اردو نہیں، ان کو اردو خوب پڑھانی ضروری ہے، زبان رواں ہوجائے، بچہ بات سمجھ سکے اور سمجھا سکے اور اس کی املاء درست ہوجائے تبھی اس کو فارسی میں لیا جائے، اور اہل لسان کے بچے فارسی کم پڑھیں تو چلے گا، مگر غیر اہل لسان بچے اگر فارسی اچھی طرح نہیں پڑھیں گے تو وہ کبھی اردو میں کامیاب نہیں ہوسکتے، کیونکہ اردو میں لغات وتراکیب فارسی مستعمل ہیں، پس اہل لسان بچہ تو اپنی فطرت سے اردو سمجھ لے گا، مگر گجرات، مہاراشٹر، بنگال، آسام، تمل ناڈو اور کیرالہ کا بچہ فارسی پڑھے بغیر کبھی بھی اردو پر قادر نہیں ہوسکتا۔

اسی طرح عربی اول جب تک بچے کے قابو میں نہ آجائے عربی دوم میں نہ لیا جائے، درجہ بدرجہ استعداد بنتی جائے گی اور بڑھتا جائے گا تو بچہ کامیاب ہوگا۔

خلاصہ یہ ہے کہ اردو، فارسی اور عربی اول تا پنجم کی تعلیم میں سنجیدگی ہو، ہزل کی صورت نہ ہو، تبھی کسی مثبت نتیجہ کی امید کی جاسکتی ہے۔

نصاب میں تبدیلی کہاں کی جاسکتی ہے؟

مدارسِ عربیہ کا نصاب دو حصوں میں منقسم ہے: عالیہ اور آلیہ، یعنی مقصود بالذات اور مقصود

تک پہنچنے کا ذریعہ۔ صرف ونحو، انشاء، عربی زبان، منطق وغیرہ علوم آلیہ ہیں، اور قرآن (تفسیر) حدیث، فقہ، اصولِ تفسیر، اصولِ حدیث اور اصولِ فقہ عالیہ اور مقصود بالذات ہیں، علوم آلیہ پر مشتمل نصاب ہر وقت بدلا جاسکتا ہے، حسن سے احسن کی طرف بڑھا جاسکتا ہے، البتہ اس کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ جو کتابیں استعداد بنانے والی ہیں ان کو القط نہ کردیا جائے، جیسے منطق کے بارے میں اب عام تصور یہ ہے کہ یہ غیر ضروری فن ہے، حالانکہ یہ فن تشحیذِ اذہان کے لئے ہے، اس سے ذہن تیز ہوتا ہے، چھری میں دھار نہ ہو تو خربوزہ کیسے کٹے گا؟ اگر آپ کو منطق پسند نہیں تو اس کا متبادل تجویز کرو، جو ذہن میں جلا پیدا کرے، ذہن کی بالیدگی کے بغیر علوم عالیہ کو بخوبی نہیں سمجھا سکتا۔

اور علوم عالیہ میں کوئی تبدیلی نہیں کی جاسکتی، ہدایہ کا کیا بدل ہے؟ مختصر المعانی کا کیا بدل ہے؟ جلالین کا اور کتب حدیث کا کیا بدل ہے؟ البتہ یہ ضروری ہے کہ طالب علم کی استعداد ایسی بن جائے کہ وہ یہ کتابیں سمجھ سکے، اگر استعداد کچی رہے گی تو علوم عالیہ کی یہ کتابیں پڑھانا بے فائدہ ہوگا۔

علم کلام اور اسلامی مسائل

ابھی صدر استقبالیہ نے اپنے خطبہ میں کہا کہ شرح عقائد عذاب قبر سے پڑھانی چاہئے، کیونکہ اس سے پہلے جو مضامین ہیں وہ طلبہ کے قابو میں نہیں آتے، وہ بہت دقیق مضامین ہیں، ذات وصفات کی بحثیں طلبہ نہیں سمجھ سکتے۔

میرے بھائیو! عذاب قبر پر تو علم کلام ختم ہوجاتا ہے، اس کے بعد 'اسلامی مسائل' شروع ہوتے ہیں، اور وہ بدلتے رہتے ہیں ان کو پڑھانا علم کلام پڑھانا نہیں۔ اور شرح عقائد علم کلام میں ہے، پس اگر سابقہ ابحاث چھوڑ دیں گے تو آپ نے علم کلام نہیں پڑھایا، اور شرح عقائد کو نصاب میں رکھنے کا مقصد فوت کردیا۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ علم کلام ذات وصفات کے مسائل کا نام ہے، اب عربوں نے نام بدل دیا ہے، وہ علم کلام کو علم التوحید والصفات کہتے ہیں، اور ابتک اس کو علم الکلام اس

لئے کہتے تھے کہ معتزلہ نے سب سے پہلے اللہ کی صفت کلام کی بحث چھیڑی تھی، وہ کہتے تھے کہ قرآن مخلوق (حادث) ہے یعنی یہ اللہ کی صفت نہیں ہے، امام اہل السنہ احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے ان کا رد کیا کہ قرآن اللہ کا کلام ہے اور غیر مخلوق (قدیم) ہے، اللہ کی صفت حادث نہیں ہوسکتی، یہ بحث اتنی طویل ہوئی کہ پورے فن کا نام ہی علم الکلام پڑ گیا۔

بہر حال ذات وصفات کے مسائل کا نام علم العقائد ہے، اور ان کا بیان شرح عقائد میں عذابِ قبر پر پورا ہوجاتا ہے، پھر اسلامی مسائل کا بیان شروع ہوتا ہے۔ علم کلام میں مقصدی حیثیت سے صرف کائنات کے مبدا و معاد سے بحث کی جاتی ہے، اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات اور معاد کے مسائل ہی زیر بحث آتے ہیں، مثلاً: خدا تعالیٰ کا اثبات، مسئلہ توحید، صفاتِ خداوندی کا بیان، صفاتِ سلبیہ کا تذکرہ، صفات نہ عینِ ذات ہیں نہ غیرِ ذات، صفتِ کلام کی بحث اور ضمناً قرآن کے کلام الٰہی ہونے کا تذکرہ، رویت باری تعالیٰ کا مسئلہ، خلق افعال عباد کا تذکرہ، اور معاد کے سلسلہ میں برزخ کے احوال، جنت ودوزخ، حشر ونشر، جزاء وسزا کا بیان اور علاماتِ قیامت کا ذکر، بس یہی علم کلام کے مسائل ہیں۔

پھر اسلامی مسائل کا تذکرہ شروع ہوتا ہے۔ اسلامی مسائل: وہ ہیں کہ مختلف الخیال اور مختلف المذاہب لوگوں کی باہمی گفتگو میں مذہب کی ضرورت، اس کی حقانیت اور ترجیح کے سلسلہ میں جو تاریخی، اخلاقی، تمدنی اور علمی مسائل زیر بحث آتے ہیں ان کے متعلق اسلام نے جو تعلیمات پیش کی ہیں ان کو زیر بحث لایا جائے تاکہ طلباء بابصیرت ہوں اور علمی گفتگو میں دوسروں کو متاثر کرسکیں، عذابِ قبر سے یہی اسلامی مسائل شروع ہوتے ہیں۔ اس کی تفصیل میرے ایک مقالہ میں ہے، جس کا عنوان ہے: ''فکرِ اسلامی کی تشکیل جدید'' اور یہ مقالہ میری کتاب: ''اسلام تغیر پذیر دنیا میں'' میں شائع ہوا ہے۔

بہر حال شرح عقائد کا جو مشکل حصہ ہے وہی مقصود ہے، مگر وہ پختہ استعداد بنائے بغیر طلبہ کے قابو میں نہیں آسکتا، اور استعداد سازی کا عمل عربی پنجم تک ہوتا ہے، اس کے بعد تو بوئے ہوئے کا پھل کھانا ہے، اربابِ فکر اور مدارس کے ذمہ داران یہاں جمع ہیں ان کی توجہ اس طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں کہ کمی جہاں آئی ہے اس کو دور کرنے کی کوشش کریں، ورنہ

یہ اجتماع بے فائدہ رہے گا۔

تکمیل کے درجات سے نقصان کی تلافی نہیں ہوسکتی

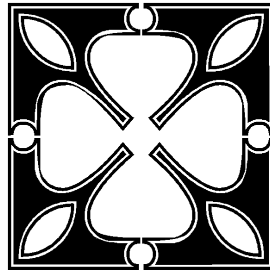
ملت کے اکابر مدارس میں جو کمی آئی ہے اس کا علاج یہ سوچتے ہیں کہ دورہ کے بعد تکمیل کے چند درجات کھول دیئے جائیں تا کہ استعداد کے نقصان کی تلافی ہوجائے۔ تکمیل فقہ، دارالافتاء، تکمیل ادب، تکمیل تفسیر، تکمیل علوم، تخصص فی الحدیث اور تخصص فی الادب کے درجات شروع کئے جائیں تو درس نظامی کی تعلیم میں جو کمی آئی ہے اس کی تلافی ہوسکتی ہے، اور تکمیلات کا یہ عمل جامعات میں شروع بھی ہوگیا ہے۔ مگر تجربہ سے یہ بات ثابت ہوئی ہے کہ اس سے نقصان کی کوئی تلافی نہیں ہوتی، اس کی مثال یہ ہے کہ ایک آٹھ منزلہ عمارت ہے جو بوسیدہ ہوگئی ہے، اس کو مضبوط کرنے کی یہ صورت نہیں ہے کہ اس پر تین چار منزلیں اور چڑھادی جائیں، اس سے تو عمارت اور کمزور ہوجائے گی، اس کا علاج تو بس یہی ہے کہ عمارت ازسرنو مضبوط بنائی جائے یا اس کی مرمت کر کے کسی قابل بنائی جائے، جب تک استعدادسازی کے مرحلہ کی طرف توجہ نہیں دے جائے گی، مسئلہ حل ہونے والا نہیں۔

دارالافتاؤں کی باڑ

آج کل ہمارے ملک میں اور پڑوس کے دونوں ملکوں میں دارالافتاؤں کی باڑ آئی ہوئی ہے، بلکہ اب نئے مدارس دارالافتاء سے شروع ہوتے ہیں اور داخلہ کے لئے کوئی استعداد ضروری نہیں، ہر فارغ داخلہ لے سکتا ہے اور چند ماہ میں مفتی بن جائے گا، اور خوش فہمی میں مبتلا ہوجائے گا کہ اسے سب کچھ آ گیا۔ اور لوگ بھی اس سے مسائل پوچھنے لگیں گے اور وہ ضَلّ وَأَضَلَّ کا مصداق بن جائے گا، مگر مدارس میں استعدادسازی پر محنت کرنے والا کوئی نہیں، اس مدرسہ کو چھوٹا مدرسہ سمجھا جاتا ہے، چندہ بھی اس کو کم ملتا ہے، اس لئے ہر شخص دورہ یا دارالافتاء کھول کر بیٹھ جاتا ہے، یہ جو طریقہ تیزی سے چل پڑا ہے: یہ بھی تباہی کا پیش خیمہ نظر آتا ہے۔

عصری درسگاہوں اور مدارس کے علوم میں فرق

عصری درسگاہوں (یونیورسٹیوں) میں محسوسات کا علم پڑھایا جاتا ہے اور وہ محدود ہے، طالب علم پڑھ کر نکلتا ہے اور کام شروع کر دیتا ہے، پھر تجربات سے اس کے علم میں اضافہ ہوتا ہے، اسے آگے کچھ نہیں پڑھنا، اور مدارس میں معنویات کا علم پڑھایا جاتا ہے اور وہ غیر محدود ہے، پس سارا علم مدارس میں نہیں پڑھایا جاسکتا، بلکہ علم حاصل کرنے کی استعداد بنائی جاتی ہے، جس سے زندگی بھر کام لینا ہے اور آگے پڑھنا ہے، اور ایک لمبے عرصے کے بعد مسائل کا ادراک ہوتا ہے، مگر اب تو لوگ فارغ اور فاضل ہو جاتے ہیں، آگے پڑھنا چھوڑ دیتے ہیں اور ان کا حال اس نادان بچے کا ہو کر رہ جاتا ہے جس نے بچا ہوا تیل کٹورے کے پینڈے میں ڈلوایا تھا جس سے اصل کٹورے کا تیل بھی گر گیا تھا، کچھ ہی دنوں میں مدرسہ سے جو متاع لے کر آئے تھے وہ بھی بھول گئے، اور کٹورہ خالی رہ گیا۔



تحفۃ القاری شرح صحیح البخاری

یہ شرح حضرت اقدس مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری مدظلہ شیخ الحدیث وصدر المدرسین دارالعلوم دیوبند کے دروسِ بخاری کا مجموعہ ہے جس کی پہلی جلد طبع ہو چکی ہے جو کتاب الوضوء کے ختم تک ہے، یہ شرح اپنی ظاہری ومعنوی خوبیوں کی وجہ سے بے نظیر وبے بہا ہے اور حضرت والا کی للٰہیت، عشق نبوی اور زندگی بھر کی علمی وعملی کاوشوں اور وسیع تر مطالعہ کا ثمرہ ہے، اس میں مشکل مباحث کو سہل انداز میں پیش کیا گیا ہے جو حضرت والا کا خاص امتیاز ہے، بخاری شریف کی عبارت صحیح اعراب کے ساتھ دی گئی ہے، عبارت جدا جدا کی گئی ہے، ہر حدیث کی شرح کی گئی ہے، کتاب کا ہر ہر لفظ حل کیا گیا ہے اور ہر ترجمہ کا مقصد، امام بخاریؒ کا مسلک، اور ابواب واحادیث کا باہمی ربط خاص طور پر واضح کیا ہے اور اس پر محققانہ کلام ہے، کتاب کے شروع میں ایک طویل مقدمہ ہے جو بڑی قیمتی اور نایاب معلومات وتحقیقات پر مشتمل ہے۔ حضرت مدظلہ نے حدیث کی حیثیت وحجیت، تدوین وترتیب کے تاریخی مراحل، حجازی اور عراقی مکاتبِ فکر کی تاریخ، جمع قرآن وجمع حدیث کی تاریخ بڑے اچھے انداز میں بیان فرمائی ہے، اور دیگر بہت سے اہم، معرکۃ الآراء، پیچیدہ اور مختلف فیہ مسائل پر نہایت محققانہ کلام فرمایا ہے۔ غرض یہ شرح ہر مدرس کی ضرورت اور حدیث کے ہر طالب کی حاجت ہے۔ اور ظاہری طور پر بھی کتاب میں تمام محاسن موجود ہیں، کتابت روشن اور واضح ہے، کمپیوٹر کتابت ہے مگر جلی خط ہونے کی وجہ سے ضعیف نگاہ والے بھی بآسانی مطالعہ کر سکتے ہیں، کاغذ اعلیٰ اور قیمتی ہے، طباعت بھی بہت عمدہ ہے، جلد مضبوط دلکش اور خوبصورت ہے، زبان آسان اور سلیس ہے، ہر قاری بے تکلف اس کا مطالعہ کر سکتا ہے، اور عام پڑھے لکھے حضرات بھی اس شرح سے خاطر خواہ فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔